KitaabPoint.blogspot.com

KitaabPoint.blogspot.com

آگ گھروں تک آ پہنچی ہے

افغانستان اور عراق پر قبضہ کرنے کے بعد امریکہ اور اس کے حواری اپنے ایک خواب کی تکمیل کے لئے منصوبہ بندیوں میں لگ گئے۔ امت مسلمہ کو ایک بار پھر کسی اور بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔ ایک ایسی تقسیم اور تفریق کہ جس آگ کے شعلے صدیوں نہ بجھائے جا سکیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد جہاں دنیا بھر میں قومی ریاستوں کا فیشن عام کیا گیا تو مفتوحہ مسلم علاقوں میں پہلے اپنے منظور نظر افراد کو مسلم اجتماعیت کی علامت خلافت عثمانیہ کے خلاف ابھارا اور پھر زمین پر نسل اور زبان کی بنیاد پر لکیریں کھینچ کر پچاس کے قریب قومی ریاستیں وجود میں لائی گئیں۔ اقوام متحدہ میں ان سرحدوں کو مقدس اور محترم بنانے کی قسمیں کھائی گئیں۔ افغانستان اور عراق پر حملوں اور قبضے کے بعد جب یہ سرحدیں پامال ہوئیں تو جہاں ان عالمی طاقتوں کو یہ احساس ہوا کہ ان دونوں ملکوں میں ان کے خلاف لڑنے والے لوہے کے چنے ہیں تو ایک خوف یہ بھی سوار ہوا کہ ان کے مقابل جان دینے کے لئے اور ان سے لڑنے والے تو ہر مسلمان ملک سے جوق در جوق ان دونوں ملکوں میں اکٹھے ہو رہے ہیں' تو کہیں یہ سرحدیں بے معنی ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ خود ہی ایک نیا نقشہ ترتیب دے دو' سو سال پرانی سرحدوں کو توڑ کر نئی سرحدیں تخلیق کر دو۔ 2006ء اس سلسلے کا بہت اہم سال تھا جب اس منصوبہ بندی پر کام مکمل ہوا مشہور زمانہ رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ "BuildingModrateMuslimNetwork" (ماڈریٹ مسلمانوں کے نیٹ ورک کی تشکیل) سامنے آئی۔ دو سو صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں پوری ملت اسلامیہ میں موجود گروہی تقسیم کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور دوست دشمن کی پہچان واضح کی گئی۔ اس کے بعد ان تمام حلقوں میں یہ بات زیر بحث آنے لگی کہ امت مسلمہ کو نئے سرے سے کیسے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کونسی ایسی نفرتیں ہیں جنہیں ابھارا جا سکتا ہے۔ جون 2006ء میں ان نفرتوں اور اختلافات کی بنیاد پر امریکہ کی افواج کے رسالے ForcesJournal USArmed میں امریکی فوج کے کرنل رالف پیٹرز کا مضمون BloodBorders چھپا جس میں اس نے مشرق وسطیٰ کا نیا نقشہ مرتب کیا۔ یہ نقشہ ملت اسلامیہ کو نسلی اور مسلکی اختلاف کی بنیاد پر تقسیم کر کے بنایا گیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ توسیع ایران کو دی گئی جو کابل کے دروازہ تک اور عراق میں بغداد شہر تک پہنچ گیا۔ عربی بولنے والے شیعوں کی علیحدہ سلطنت' مکہ اور مدینہ کی مقدس ریاست، چھوٹا سا سنی عراق' آزاد بلوچستان اور آزاد کردستان۔ افغانستان اور پاکستان کے پشتونوں کا علیحدہ ملک اور پاکستان صرف پنجاب اور سندھ پر مشتمل۔ اس نقشے کو ہر کسی نے دیوانے کا خواب قرار دیا۔ لیکن گزشتہ چھ سالوں میں صرف اسی نقشے کو ذہن میں رکھ کر پورے علاقے میں نفرت کے سیلاب کو عام کرنے کے لئے کام کیا گیا۔ اس کے لئے کوئی زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی۔ لوگوں میں اختلافات موجود ہوتے ہیں صرف ایک گروہ کو زبردستی اقتدار پر قابض کر کے دوسرے گروہ پر ظلم اور زیادتی کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ پھر اسی ظلم و زیادتی سے وہ خانہ جنگی جنم لیتی ہے کہ سالوں اس آگ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

عراق وہ سرزمین ہے جہاں سے مسلمانوں میں مسلکی اختلاف کا آغاز ہوا۔ اسلام سے پہلے بھی یہ علاقہ عرب اور عجم کے جھگڑوں کا مرکز رہا ہے۔ اختلاف کی چنگاریاں موجود تھیں بس ذرا ہوا دینے کی ضرورت تھی' مسلکی آگ بھی اور نسلی منافرت بھی۔ ابھی تو چنگاریاں سرد بھی نہیں ہوئی تھیں۔ امریکی پشت پناہی سے صدام حسین کا ظالمانہ دور جس میں کردوں اور شیعوں پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا۔ ایران کے ساتھ آٹھ سالہ طویل جنگ' پورا عراق خوف و دہشت کے سائے میں تھا۔ صدام کا تختہ الٹا تو پہلے براہ راست امریکیوں نے پورے عراق میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور پھر صدام کی سنی حکومت کے مقابلے میں ایک ایسی حکومت قائم کی جو تمام گروہوں کی نمائندہ نہ تھی۔ ان کی علامتی موجودگی نے عراقی شیعوں کو مرکزی کردار مہیا کر دیا۔ ابھی صدام حسین دور کے مظالم کی یاد تازہ تھی۔ اب نوری المالکی کی حکومت کے ہاتھ میں ایک ہتھیار آ گیا تھا' جس شہر پر حملہ کرنا ہے' وہاں کی سنی اقلیت کے خلاف ایکشن کرنا ہے' بس القاعدہ کا نام لو اور ٹوٹ پڑو۔ پانچ سال یہ سب القاعدہ کے نام پر ہوتا رہا اور دنیا بھر کا میڈیا اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ قرار دیتا رہا لیکن جب اس کے نتیجے میں دولت اسلامیہ عراق و شام (داعش) نے جنم لیا تو ساری دنیا کا وہی میڈیا اب یہ تجزیہ نگاری کر رہا ہے کہ نوری المالکی کی حکومت نے فلاں فلاں ظلم کیے' ایسی زیادتیاں کیں جس کے نتیجے میں سنی علاقوں میں ستائے ہوئے لوگ داعش کے ساتھی بن گئے اور اسے کامیابیاں ملتی چلی گئیں لیکن داعش سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی جو اس ساری پلاننگ کے برعکس تھی۔ عالمی طاقتیں نقشہ اپنا مرتب کرنا چاہتی تھیں' لیکن انہوں نے سرحدیں خود متعین کرنا شروع کر دیں۔ اب اس لڑائی کی آگ کو تیز کرنا مقصود تھا۔ دنیا بھر کا میڈیا داعش کے حملوں کے دوران ہونے والی بربریت اور ظلم کی داستانوں سے بھر گیا۔ انتقام کی آگ میں سلگتے ہوئے داعش کے لوگوں نے سنی علاقوں میں موجود شیعہ اور یزدی اقلیتوں کو قتل کیا' گھر سے بے گھر کیا' ان کے سر قلم کیے۔ اس خون خرابے میں سب سے بدترین روپ اس عراقی فوج کا سامنے آیا جسے اربوں ڈالر لگا کر امریکہ نے منظم کیا تھا۔ صرف چند گھنٹوں میں اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنا جدید ترین اسلحہ بھی داعش کے ہاتھ جانے دیا۔

فوج ناکام ہوئی تو پوری مغربی دنیا اور اس کے حواریوں پر یہ خوف سوار ہوا کہ کہیں اس خانہ جنگی کے نتیجے میں کوئی ایسا گروہ برآمد نہ ہو جائے جو اتحاد پر اکٹھا کر لے۔ یہ اتحاد کتنا آسان تھا کہ ایسی تمام حکومتیں اور طاقتیں جو امریکی اور مغربی پشت پناہی سے مسلمانوں کو تقسیم کر کے حکومت کر رہی ہیں ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ایسے میں امریکہ' سعودی عرب' خلیجی ریاستیں اور ایران متحد ہو گئے۔ زمینی فوج بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹھکانوں پر فضائی حملوں کے ساتھ ساتھ داعش کے مقابلے میں حکومتی سرپرستی میں شیعہ ملیشیا منظم کرائے گئے تاکہ شیعہ سنی لڑائی کو تیز کیا جائے۔ اس وقت عراق میں چار شیعہ ملیشیا داعش سے لڑ رہے ہیں' آسیاب اہل حق' بدر بریگیڈ' مہدی آرمی اور کتیب حزب اللہ۔ اس ساری لڑائی میں وہ ایلیٹ آرمی خاموش تماشائی ہے۔ ادھر داعش کے ہاتھ میں آنے والے تیل کے کنوؤں کی روزانہ آمدنی تیس لاکھ ڈالر ہے۔ یہ تیل ویسے ہی غیر قانونی طور پر فروخت ہوتا ہے جیسے ایران گزشتہ تیس سالوں میں پابندیوں کے باوجود تیل فروخت کر رہا ہے۔ داعش سنی عقیدے کا استعمال کر رہی ہے اور یہ چاروں شیعہ نظریات پر منظم ہیں۔ 29 جون 2014ء کو قائم ہونے والی دولت اسلامیہ کے مظالم اور دہشت گزشتہ تین مہینوں سے پریس کی زینت ہیں لیکن چند دن پہلے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے شیعہ ملیشیاؤں کی رپورٹ بھی شائع کی ہے۔ یہ رپورٹ بھی اتنی ہی خوفناک ہے۔ بغداد سمارا اور کرکوک کے علاقے میں سنی اقلیت ویسے ہی گھر چھوڑ کر بھاگ رہی ہے جیسے داعش کے علاقوں سے شیعہ اقلیت۔ اس رپورٹ کا نام AbsoluteImpunity,MilitiaRuleinIraq ہے۔ اس میں قتل' گھر کو جلانا' لوگوں کو بے گھر کرنا اور اغوا برائے تاوان کے قصے درج ہیں۔ جس نے دونوں جانب کے مظالم کی تفصیلات درج نہیں کیں کہ اس سے اختلاف کو ہوا ملتی ہے اور آگ مزید بھڑک سکتی ہے۔ دونوں جانب صرف قتل و غارت ہے' خونریزی ہے اور بدترین تشدد میں آگ اور خون کا کھیل ہے لیکن اس خوف سے یہ سب لکھ رہا ہوں کہ یہ آگ صرف عراق تک محدود نہیں رہنے والی۔ یہ آگ پوری امت کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ کوئی گلی اور محلّہ اس سے محفوظ نہیں رہے گا۔ یہ آگ امریکی غلامی میں لڑی جانے والی دہشت گردی کی جنگ سے زیادہ خوفناک ہو گی۔ نہ حکومتوں کو اس کا ہوش ہے اور نہ علمائے امت کو۔ حکومتیں امریکی غلامی میں ڈوبی ہیں اور علماء اپنے عماموں کے پیچ سنبھالے ہوئے ہیں۔ انہیں اندازہ تک نہیں کہ آگ ان کے دروازوں کے باہر آ پہنچی ہے جس میں سب جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ خاک و خون میں لتھڑے عمامے اور جلے ہوئے گھر۔

KitaabPoint.blogspot.com

عالمی جنگ یا معرکۂ حق و باطل

چاروں جانب ایک افراتفری ہے، حالات میں ایک تیزی ہے، ایسے لگتا ہے دنیا پر حکمران طاقتیں جلدازجلد بہت سے کام کرنا چاہ رہی ہیں۔ اتنے محاذ تو پہلے کبھی نہ کھولے گئے تھے۔ دنیا میں دو عالمی جنگیں ہوئیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ملک اس میں شامل ہوتے گئے اور جنگ کے شعلے پھیلتے گئے۔ لیکن اس وقت تو ایسے لگتا ہے جیسے ہندوؤں کے دیوتا ہنومان کی طرح جس نے اپنی دم میں آگ باندھی تھی اور دم کو گھما کر راون کی ساری سلطنت لنکا کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ ایسے حکمران کئی ہنومان ہیں جو اپنی دموں میں آگ باندھ کر انہیں لہرائے جا رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ سال سے اس دنیا کو آگ اور خون میں نہلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ 2008 میں جب سودی معیشت کا بلبلہ پھٹا تو عالمی سطح پر ایک ایسا بحران آیا کہ بڑی بڑی معیشتیں اور عالمی طاقتیں چیخ اٹھیں۔ وہ وال سٹریٹ جو کبھی حکومتوں کو خریدا کرتی تھی، اس نے امریکی حکومت سے اپنی زندگی کی بھیگ مانگ لی۔ فرمائش کی گئی کہ لوگوں کے پیسوں سے سات سو ارب ڈالر اسے دے دیئے جائیں تو وہ سنبھل سکتی ہے۔ بینکوں کی سود کمانے کی خواہش دم توڑ گئیں اور شرح سود صفر تک جا پہنچی۔ ایسے میں زوال کھاتی معیشت اور افغانستان و عراق میں شکست کھاتی فوجی قوت نے Rand کارپوریشن کو ایک ذمہ داری سونپی۔ اسے صرف ایک سوال دیا گیا کہ اس بحران سے کیسے نکلا جائے۔ تجویز بھی صرف ایک ہی دی گئی، اور وہ یہ کہ ایک بہت بڑی عالمی جنگ ہی امریکی معیشت کو چار چاند لگا سکتی ہے۔ میدانِ جنگ پہلے سے گرم ہے، بس ذرا اس کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ افغانستان اور عراق کے ساتھ جنگ کو دو ملکوں کے ساتھ جنگ بنا کر نہیں پیش کیا گیا تھا بلکہ دہشت گردی کے خلاف ایک عالمی جنگ کہا گیا تھا۔ اگرچہ جنگ کرنے والوں نے دہشت گردی اور شدت پسندی کے ساتھ کبھی اسلام کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن اس جنگ میں قتل صرف اور صرف لاکھوں مسلمان ہی کیئے گئے۔ رینڈ کارپوریشن نے یہ مشورہ دیا کہ اس جنگ کو پھیلا دو۔ تین ملک ایسے ہیں جن کی معیشت مضبوط ہے، جنگوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ بھارت، چین اور روس۔ تینوں ممالک میں کروڑوں کے حساب سے مسلمان بستے ہیں۔ لیکن ان ملکوں کے ساتھ اس جنگ کو لڑے گا کون؟۔ تجویز دی گئی کہ دو ملک ایسے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا افغانستان۔ ایک ملک میں عسکری اور انتظامی صلاحیت ہے اور دوسرے میں دیوانوں، فرزانوں اور جہادیوں کی کمی نہیں۔ 2010 کے آغاز میں اس تجویز کو سرکاری پالیسی کا حصہ بنایا گیا اور پھر دو اعلان سامنے آئے، ایک یہ کہ امریکی اور اتحادی افغانستان سے چلے جائیں گے اور دوسرا یہ کہ اگلے دس سال امریکہ اپنا سرمایہ اور وقت بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے ممالک میں صرف کرے گا جو فلپائن سے لے کر برما تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سے پاکستان اب عالمی سفارت خانوں میں انڈو پاک ریجن کے طور پر نہیں جانا جاتا بلکہ افغان پاک ریجن ہو چکا ہے۔ اس ریجن یا علاقے میں ایسی حکومتوں کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے جو خطے کے تینوں ممالک میں پھیلے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکیں اور ایک نہ ختم ہونے والے جنگ شروع کریں جس سے روس، چین اور بھارت متاثر ہوں اور وہ اسلحہ اور دیگر سہولیات کیلئے سات سمندر پار امریکہ کے محتاج ہو جائیں۔ ان ممالک میں لڑنے والے مسلمانوں کو بھی اسلحہ فراہم کرنے والے امریکی اسلحہ ساز فیکٹریوں سے اسلحہ خریدیں اور یوں امریکہ کا ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس رات دن ترقی کرنے لگے۔ جس سال یہ رپورٹ منظرِ عام پر آئی، دو ملکوں نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا۔ ایک چین اور دوسرا فرانس لیکن میڈیا پر مخصوص قبضے کی وجہ سے یہ دونوں احتجاج دب کر رہ گئے۔

چند سال پہلے یہ رپورٹ فقط ایک تجویز نظر آتی تھی جس کے کچھ حصے منظرِ عام پر آئے تھے، لیکن آج یوں لگتا ہے اس پر مکمل عمل درآمد ہونے والا ہے اور ایک بہت بڑے سٹیج کے لیے تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں۔ ایک بہت بڑی عالمی جنگ کا سٹیج۔ عرب دنیا میں گذشتہ چند سالوں سے جو عرب بہار کے نام تحریکیں برپا ہوئیں اور پھر ان کے انجام نے جس افراتفری نے جنم لیا اس نے پورے خطے میں اسلحے کی دوڑ کو تیز کر دیا۔ شام، عراق، لیبیا، سودی عرب، یمن، بحرین، نائجیریا، صومالیہ، ہر طرف بندوقیں تنی ہوئیں ہیں، اور ان ملکوں میں سے کوئی بھی اسلحہ نہیں بناتا، سب امریکہ اور حواریوں سے خریدتے ہیں۔ روس کے ساتھ مغرب کے تعلقات بہتر تھے اور مغربی طاقتیں بھی اس کی بہت عرصہ ناز برداری کرتی رہیں۔ لیکن اب یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ آج سے صرف چند سال پہلے اگر کسی کو یہ بتایا جاتا کہ امریکہ کے علاقے ٹیکساس اور اوکلوہاما میں موجود تیل کے ذخائر کو مارکیٹ میں لے آیا جائے گا جنہیں Shale آئل کہتے ہیں، تو کوئی یقین تک نہ کرتا۔ کیونکہ اس تیل کو زمین سے نکالنے میں اسقدر لاگت آتی ہے کہ اگر تیل ستر ڈالر فی بیرل نہ بکے تو نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ جنگ میں مخالفین کو مالی طور پر کمزور کرنے اور اتحادیوں کے سرمائے میں اضافے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے امریکہ اب تیل پیدا کرنے والا سب بڑا ملک بن چکا ہے۔ تیل کی قیمتیں گرنے سے جو کچھ ہوا، اس سے آئندہ کے منظر نامے کا پتہ چلتا ہے۔ بھارت ہر سال تیل پر دس ارب ڈالر کی سبسڈی دیتا ہے اب یہ اس کی بچت ہے۔ چین کا معاملہ یہ ہے کہ اگر تیل کی قیمتوں میں ایک ڈالر کی کمی ہوتی ہے تو اس کی بچت میں 2 ارب ڈالر کا اضافہ ہوگا۔ امریکہ میں ہر شہری کی بچت دوگنی ہو جائے گی۔ لیکن روس، ایران، وینزویلا اور سعودی عرب کی معیشتیں خطرات کا شکار ہوں گی۔ ان میں سعودی عرب خطرے سے سنبھل سکتی ہے لیکن روس کا روبل تو بری طرح اپنی قیمت کھو چکا ہے۔ ایران کو اپنی معیشت بچانے کیلئے امریکہ اور مغربی طاقتوں سے اتحاد کرنا پڑ رہا ہے تاکہ پابندیاں ختم ہوں اور وینزویلا تو شاید دیوالیہ ہو جائے۔ تیل سے پیدا ہونے والے اس بحران میں جنگوں کی آگ بھی سلگنے لگی ہے۔ چین اور بھارت دو حکومتیں سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ہنومان اپنی دم میں آگ باندھ کر بھارت پہنچ گیا ہے۔ ساری بچت اسلحے کی خریداری پر خرچ ہو گی۔ دوسری جانب پاکستان کا خوف اسے چین لے گیا ہے اور چین کا خوف اسے یاد دلا رہا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی تو اس کے خلاف پانچ سال سے چل رہی ہے۔ لیکن چین کی تاریخ تو تجارت سے بھری پڑی ہے، لڑائی سے اسکا دور کا واسطہ نہیں، بس دیوار چین بناؤ اور خود کو محفوظ کر لو۔ امریکہ کے ساحلوں سے لے کر ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور دیگر ممالک میں چند فیصد چینی بستے ہیں جو نوے فیصد سے زیادہ کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ فرانس نے ذرا سا اس جنگ سے باہر ہونے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے ہی تھے کہ کارٹونوں کے واقعہ کے بعد پورے یورپ کو وہاں اکٹھا کر دیا گیا۔ یورپ کیوں نہ اکٹھا ہوتا، جس دولتِ اسلامیہ سے جنگ کا میدان سجایا جا رہا ہے۔ اس میں یورپ کے ممالک کے مسلمان لڑنے جا رہے ہیں اور تشویش کا عالم یہ ہے کہ وہاں پر بسنے والے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی شدت پسند اور دہشت گرد کہا جا رہا ہے۔ جرمنی کی چانسلر نے جب یہ کہا کہ اسلام کا تعلق جرمنی سے بھی ہے تو DEGIDA تحریک پچیس ہزار افراد کو سڑکوں پر لے آئی اور نعرہ یہ تھا کہ یورپ اور اسلام دو مختلف نام ہیں۔ تمام سٹیج سج چکا ہے اور اب لبنان کے قریب اسرائیل کے سپاہیوں پر میزائل سے حملہ ایک بار پھر حزب اللہ اسرائیل جنگ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ دبئی میں سرمایہ کاری شروع ہوئی تو سب نے مل کر سوچا کہ کونسا شہر ایسا ہے جو دبئی کی اس سرمایہ کاری کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ بیروت ہے۔ عربوں کی عیاشی کا سب سامان بھی موجود ہے اور زبان کا مسئلہ بھی نہیں۔ پھر کیا تھا دو سرائیلی سپاہی حزب اللہ کے قبضے میں آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ حزب اللہ کے سب ٹھکانے تو محفوظ رہے جو اسرائیل کی سرحد پر واقع تھے، حسن نصراللہ بھی ہزاروں لوگوں کی ریلیاں بھی کرتا رہا، کوئی القاعدہ یا طالبان ہوتا تو ڈرون سے اڑا دیا جاتا، لیکن بیروت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ حالانکہ بیروت شہر میں تو عام شہری رہتے تھے۔ اسرائیل کو ایک بار پھر اس جنگ میں براہِ راست دھکیلنے کا مقصد شام اور عراق میں جنگ کے شعلوں کو بھڑکانا ہے۔ بشارالاسد پر حملہ ہو یا دولتِ اسلامیہ پر دونوں صورت اسرائیل کی خوشی۔ کیا یہ صرف ایک عالمی جنگ کا آغاز ہو گا یا آخری معرکۂ حق و باطل۔ ہر کسی کا ایمان اسے روشنی دکھا سکتا ہے۔

نوٹ: ایک ڈرائیور کے دو بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے پرائیوٹ کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ اسے فیس کا مسئلہ ہے کوئی صاحب براہ راست فیس جمع کروا سکتے ہوں تو اس نمبر پر اس سے رابطہ کر لیں۔ 03004613521 فیس براہ راست ادارے میں جمع کروائیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

آتش فشاں کا دھواں

ایسی ہی ایک پارلیمنٹ کا اجلاس 5 مئی 1789ء کو فرانس کے شہر، پیرس میں منعقد ہوا تھا۔ یہ پارلیمنٹ عوام کے غیظ و غضب اور غصے کے بعد وجود میں آئی تھی۔ وہ بھوکے ننگے عوام جو صدیوں سے غربت وافلاس کا شکار تھے اور گزشتہ کئی سالوں سے عوام کی حکمرانی کے لیے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ انہیں تسلی دینے کے لیے عوام کی حکمرانی کا ایک ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ پارلیمنٹ میں تین مختلف جماعتیں سامنے آئی تھیں۔ ایک جماعت طبقہ امراء کی نمائندگی کرتی تھی جس میں لافی طی، لالی، چارلس اور توزی نمایاں تھے۔ مذہبی رہنماؤں اور پادریوں کے نمائندے علیحدہ جماعت کے طور پر وہاں موجود تھے۔ عام آدمیوں کی نمائندگی کرنے والوں میں میرا بیو، راپیئٹر، گیولی ٹن، سائیس اور بیلی شامل تھے جو بہت سخت رویہ رکھے ہوئے تھے۔ عام لوگوں کی نمائندگی اس پارلیمنٹ میں بہت کم تھی اور وہ بھی امراء اور پادریوں کے سامنے دبے دبے رہتے تھے۔ لیکن 5 مئی کے دن یہ نمائندے تلخ لہجے میں بولنے لگے۔ انہوں نے برطانیہ کے دارالعوام اور امریکہ کی کانگریس کی مثالیں پیش کیں اور کہا کہ آئندہ ٹیکسوں کا نفاذ ان سے پوچھے بغیر نہ کیا جائے۔ پارلیمنٹ میں مراعات یافتہ طبقہ ایسی تقریریں سننے کا عادی نہ تھا۔ بادشاہ لوئی کا غصہ عروج پہ تھا۔ اس نے ان گستاخ اراکین کو اجلاس سے باہر نکال دیا۔ یہ سب پارلیمنٹ کے باہر ایک ٹینس کورٹ میں جمع ہو گئے اور انہوں نے وہاں ایک حلف اٹھایا کہ جب تک وہ عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق آئین مرتب نہیں کروالیتے، یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اس واقعہ کو تاریخ میں ''اوتھ آف دی ٹینس کورٹ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ طاقت کے استعمال کا وقت آیا تو بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان باغی ارکان کو طاقت کے ذریعے پارلیمنٹ کے سامنے سے منتشر کر دیا جائے۔ لیکن سپاہیوں نے طاقت کے استعمال سے انکار کر دیا۔ یہ انقلاب کا وہ اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے، جب حکومت کے زیرِ انتظام پولیس اور فوج عوام کی امنگوں اور خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اپنے ہم وطن بھائیوں پر حملہ آور ہونے سے انکار کر دیتی ہے۔ پارلیمنٹ کے ارکان بحثیں کر رہے تھے اور باہر بپھرا ہوا ہجوم ایک نئی تاریخ رقم کرنے کو تھا۔ پارلیمنٹ کے ارکان نے ایک متفقہ قرارداد منظور کی کہ ان باغیوں کو کچل دو۔ یہ چند ہزار لوگ ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔ نہ فوج نے ساتھ دیا اور نہ پولیس نے، اب کیا کریں۔ بادشاہ نے غیر ملکی فوجی بلائے 13 جولائی کے دن اس ہجوم کو طاقت کے ذریعے منتشر کر دیا گیا جو پارلیمنٹ کو گھیرے ہوئے تھا۔ 13 جولائی کی شام ورسائی کے محل میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ رقص و موسیقی اور ناؤ نوش میں ڈوبے بادشاہ کے قریبی ساتھی اور اراکین پارلیمنٹ اس بات پر مسکرا رہے تھے کہ ہم نے ان مٹھی بھر شر پسندوں پر فتح حاصل کر لی ہے۔ سب کو پکڑ کے بیسٹائل کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ یہ لوگ پارلیمنٹ کے باہر چھ ہفتوں سے مقیم تھے۔ کس قدر پرامن طریقے سے بیٹھے تھے۔ بس انہوں نے نیکر اور ڈیوک اور آورلین زکے مجسمے اٹھا رکھے تھے۔ سپاہیوں نے پہلے مجسمہ اٹھانے والوں پر گولیاں برسائیں تاکہ مجسمے گر جائیں۔ لوگ ان گولیوں کا جواب پتھروں اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں سے دیتے رہے۔ یہ تو بھوکے ننگے لوگ تھے جو گھنٹوں قطار میں کھڑے ہو کر روٹی خریدتے تھے، انہوں نے ان چھ ہفتوں میں کسی عمارت کو نقصان نہیں پہنچایا، کسی دکان کو نہ لوٹا، کسی عورت کی عصمت دری نہ کی۔ لیکن 13 جولائی، ان نہتے لوگوں پر ریاستی طاقت کی فتح کا دن تھا۔ مٹھی بھر لوگ پارلیمنٹ کے سامنے سے منتشر ہو گئے۔ ارکان پارلیمنٹ جشن منانے لگے۔ انہیں اندازہ تک نہ تھا کہ یہ مٹھی بھر لوگ ان کروڑوں لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے جو صدیوں سے غربت وافلاس اور جبر واستبداد کی چکی میں پستے چلے آ رہے ہیں۔

اگلے دن 14 جولائی کی صبح طلوع ہوئی تو یہ پورے فرانس کے لیے حیران کن تھی۔ وہ ارکان پارلیمنٹ جو یہ سمجھتے تھے کہ ہم عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو اصلاحات کے نام پر گیارہ جون کو ایک آئین مرتب کر چکے تھے۔ جو عوام کو مراعات کے نام پر لالی پاپ دے کر اپنا اور بادشاہ کا اقتدار قائم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن صبح پیرس کی ہر گلی سے ہجوم صرف ایک سمت رواں تھا۔ اور وہ تھا بیسٹائل کا قید خانہ۔ وہ قید خانہ جو فرانس کے تاج و تخت اور اشرافیہ کی نمائندہ پارلیمنٹ کے مظالم کی تصویر تھا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ وہاں ان کے اپنے بھائی بند قید ہیں اور جہاں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں کل گرفتار کیا گیا۔ لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ اس قید خانے میں تیس ہزار بندوقوں کی صورت میں اسلحہ بھی موجود ہے۔ 13 جولائی کے ظلم پر احتجاج پر مائل پیرس کا ہر شہری اس قید خانے کے گرد جمع ہو گیا۔ پانچ گھنٹے محافظوں اور شہریوں میں جنگ جاری رہی اور بالآخر بیسٹائل فتح ہو گیا۔ ہجوم نے قیدیوں کی زنجیریں کاٹ ڈالیں، تالے توڑ دیئے۔ سالوں اندھیری کوٹھریوں میں رہنے والے باہر نکلے تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ تیس ہزار بندوقیں اب پیرس کے عوام کے ہاتھ میں تھیں۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ورسائی کے محل میں جام و سبو کی محفل برپا تھی۔ بادشاہ کے وفاداروں نے اسے اس سب سے بے خبر رکھا۔ وہ مزے سے سونے جا رہا تھا تو ایک درباری نے جا کر اسے خبر دی کہ یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس نے کہا یہ سب فساد ہے۔ درباری نے کہا نہیں یہ انقلاب ہے۔ اگلے دن اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا۔ کرائے کے غیر ملکی فوجیوں کو واپس کر دیا گیا۔ پارلیمنٹ میں عوام کے ترجمان نیکر کو وزارت دینے کا اعلان کیا گیا۔ بادشاہ پیرس پہنچا تو اس کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ لاکھ فوج مقرر تھی۔ سات شہزادے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس کے بعد کی تاریخ بہت طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ لوگوں نے پارلیمنٹ کو مسترد کر دیا اور پیرس کی میونسپل کمیٹی کو اپنا مرکز بنایا اور اسے عوام کی نمائندہ پارلیمنٹ کا درجہ دے دیا۔ ادھر پارلیمنٹ نے بہت سی انقلابی اصلاحات کیں، لیکن اب لوگوں کا غم و غصہ کم ہونے کو ہی نہیں آتا تھا۔ 21 جون 1791ء کو بادشاہ اور ملکہ بھیس بدل کر فرار ہونے لگے تو لوگوں نے انہیں پکڑ کر واپس محل پہنچا دیا۔ لوگ اب ان سب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے جنہوں نے صدیوں انہیں محکوم بنا کر رکھا تھا۔ پیرس اب عام آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ عوام کی عدالتیں لگنے لگیں اور ہر اس شخص کا سر قلم کر دیتیں، جس کا ہاتھ نرم یا کالر صاف ہوتا۔ آخری عدالت 16 جنوری 1793ء کو لگی جس نے بادشاہ کی گردن زدنی کا حکم دیا۔ تیز دھار چھرے نے گردن تن سے جدا کر دی۔ ایک شخص نے بادشاہ کے خون میں انگلی ڈبو کر ہونٹوں کو لگائی اور پکارا اوہ! بادشاہ کا خون بھی نمکین ہوتا ہے۔ نہ کسی آنکھ میں آنسو آیا اور نہ کسی گھر میں ماتم۔

ہر وہ معاشرہ جہاں ناانصافی، بھوک، افلاس اور غربت نے ڈیرے جما رکھے ہوں۔ جہاں لوگوں کی قسمت سے کھیلنے والے چند سو گھرانے اپنے آپ کو قوم کا نمائندہ تصور کرتے ہوں، وہاں احتجاج اور غصہ آتش فشاں کے لاوے کی طرح اندر ہی اندر کھول رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں برسرِ اقتدار لوگوں کو یہ چند ہزار احتجاج کرنے والے لوگ ایک مختصر سا گروہ نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، انہیں کچل دیا گیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہ ہجوم تو آتش فشاں سے خارج ہونے والا دھواں ہوتا ہے، اس کے پیچھے کھولتا، ابلتا لاوا چلا آ رہا ہوتا ہے جو سب کچھ خس و خاشاک میں تبدیل کر دیتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اوریا مقبول جان
theharferaz@yahoo.com

ابھی تو پردہ سرکا ہے

بغداد کی مسجد میں اپنے وقت کا صاحب نظر اور مقرب بارگاہِ الٰہی علم کے موتی بکھیر رہا تھا کہ ایک سوال کرنے والے نے پوچھا۔ کیسے پتہ چلے کہ ہم پر ٹوٹنے والی مصیبت، بلا یا آفت، اللہ کی طرف سے آزمائش ہے یا عذاب۔ فرمایا: جو مصیبت، بلا یا آفت تمہیں اللہ کی طرف رجوع کروادے وہ آزمائش ہے اور تم اس میں کامیاب۔ لیکن جو مصیبت یا آفت تمہیں اللہ سے دور کردے' وہ عذاب ہے اور جب تک اللہ سے دور رہو گے' اس سے کبھی نکل نہیں سکو گے۔ یوں تو بنی اسرائیل پر فرعون مظالم ڈھاتا تھا۔ ظاہری اور دنیاوی اعتبار سے تمام بلاؤں، مصیبتوں اور ظلم و بربریت کا منبع وہی تھا۔ کوئی تجزیہ نگار ہوتا، دانشور یا مورخ ہوتا تو یہی کہتا کہ فرعون بنی اسرائیل پر بہت ظلم ڈھاتا ہے۔ لیکن اللہ قرآن پاک میں تجزیہ نگاری کی اس منطق کو مسترد کرتا ہے۔ فرمایا ''وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کردیتے اور بیٹیوں کو زندہ رکھتے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے آزمائش تھی'' (البقرہ۔ ۴۹)۔ فرعون کے دور میں اگر ایسے ہی پچاس کے قریب ٹی وی چینل ٹاک شو نشر کر رہے ہوتے، سو سے زیادہ کالم نگار تجزیے تحریر کر رہے ہوتے اور ان کے درمیان ایک شخص اللہ کی بتائی ہوئی اس منطق کو پیش کرتا تو وہ سب اسے پاگل قرار دیتے۔ اگر پاگل نہ بھی کہتے تو ایک بات پر سب متفق ہو جاتے کہ یہ فرعون کے مظالم کی پس پردہ حمایت کر رہا ہے۔ ہم اس کے سامنے حقائق پیش کر رہے ہیں کہ دیکھو فرعون کے سپاہی آتے ہیں اور جو بھی مرد بچہ ہمارے ہاں ہوتا ہے اسے قتل کر دیتے ہیں اور ہماری عورتوں کو اپنی عیاشی کے لیے زندہ رکھتے ہیں۔ مارنے والے بھی نظر آ رہے ہیں مرنے والے بھی دکھائی دیتے ہیں اور اس پاگل کو دیکھو اسے اللہ کی طرف سے عذاب، بلا یا آزمائش کہہ رہا ہے۔ منطق اور دلیل صرف بے بسی کے سامنے شکست تسلیم کیا کرتی ہے۔ قومیں جنہیں منطق و دلیل پہ بہت ناز ہوتا ہے جو قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے تکبر کے ایک ایسے مقام پر جا پہنچتی ہیں' جہاں انہیں خود سے بلند کوئی ہستی نظر نہیں آتی تو پھر ایسے میں اللہ ان کے تمام ساز و سامان اور منطق و دلیل کو شکست دیتا ہے۔ سمندر کی موجوں میں غرق ہوتے فرعون کا آخری فقرہ یہی تھا'' میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آیا''۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک بستی کی تقدیر بدلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ مسلسل مصیبتوں، بلاؤں اور آفتوں میں گھری رہتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کی منطق تو یہ ہوگی کہ اُس کے معاشی حالات خراب ہیں، خانہ جنگی ہے۔ مذہبی منافرت ہے۔ نسلی فسادات ہیں، عالمی اور علاقائی طاقتیں اس کے حالات خراب کرتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک کامل ایمان کا حامل شخص تجزیوں کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھتا بلکہ ان خرابیوں کی جانب غور کرنے لگتا ہے جو بستیوں میں عام ہو جائیں تو وہاں عذاب کی بشارتیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کا ایک اور بات پر بھی محکم ایمان ہوتا ہے کہ'' کوئی مصیبت آ ہی نہیں سکتی اگر اللہ کی طرف سے اذن نہ ہو جائے'' (التغابن: 11) وہ اس بات پر بھی شک نہیں کرتا کہ'' اللہ ہی ہے جو بھوک میں کھانا اور خوف میں امن دیتا ہے (القریش)'' اس محکم ایمان کے بعد جب وہ بستی کی حالت کی طرف لوٹتا ہے تو اسے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے لوگ قرآن پاک کی دی گئی واضح عذاب کی علامت نظر آتے ہیں۔ '' کہہ دو کہ وہ قادر ہے کہ تم پر عذاب نازل کرے تمہارے سروں پر، یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، یا پھر تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کی گردنیں کٹوا کر عذاب کا مزا چکھا دے''۔ (الانعام ۶۵) یہ آیت میں نے بار بار اپنے کالموں میں درج کی ہے، ہر دفعہ جب پوری قوم کسی ایک ایسے واقعہ پر بلِ کر رہ جاتی ہے جو انہیں بہت انہونا سا لگتا ہے تو مجھے یہ آیت یاد آ جاتی ہے۔ میں خوف میں ڈوب جاتا ہوں۔

کیا اب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم حالت عذاب میں نہیں کہ جس بستی میں اُس رسول رحمت ﷺ کے ماننے والے ایک معصوم بچی کی جان کے درپے ہو جائیں، جو فرماتے ہیں کہ'' اولاد میں سے بہترین بٹیاں ہوتی ہیں'' جن کی احادیث کے مجموعے جو ہماری درس گاہوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ان درسگاہوں میں بہت سے حفاظ حدیث بھی ہوں گے۔ ان ساری احادیث میں کوئی ایک حدیث بیٹے کو پالنے پر اجر سے متعلق نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے ایک بھی بیٹی کو پالا، تربیت کی، وہ قیامت کے دن میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے شہادت کی انگلی اور ساتھ والی انگلی۔ آپ نے دونوں انگلیاں ایک ساتھ کھڑا کر کے بتائیں۔ ایک دفعہ ایک اونٹ والا ایک ایسے اونٹ کو بھگائے لے جا رہا تھا' جس میں بچیاں سوار تھیں۔ آپ ﷺ نے اسے کہا آہستہ چلو، آبگینے ہیں، آبگینے۔ ایسے رسول ﷺ کی امت میں یہ کیسے ہو گیا۔ لیکن پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو خوف سے کانپ اٹھتا ہوں کہ ایسا تو یہاں روز ہو رہا ہے۔ ملالہ یوسف زئی کوئی پہلی بچی ہے جو اس سفاکی کا نشانہ بنی؟ غیرت و حمیت کے نام پر، قبائلی و خاندانی جاہ و جلال کے لیے، انتقام کی آگ بجھانے کی خاطر، یہاں تک کہ اپنی لسانی، قومی اور فرقہ وارانہ عصبیت کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے روز کسی نہ کسی ملالہ یوسف زئی کا خون ہوتا ہے۔ ہم اس پر نادم اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ یہ وہ حالتِ عذاب ہے' جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس واقعہ کے بعد جس خوف نے مجھے آن گھیرا ہے وہ بہت خوفناک ہے۔ ملالہ یوسف زئی پر اس پوری قوم کی آنکھوں کو اشکبار تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ یہ اُس پر بیتنے والی قیامت کا ایک ایسا دکھ ہے جس سے نکلنے کا اسے راستہ نہیں مل رہا۔ میں اس وقت کانپ اٹھا جب قتل و غارت اور دہشت و بربریت میں خون آلود ہاتھوں والے بھی اس معصوم بچی کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے۔ کیا غم اور دکھ ہو سکتا ہے باراک اوبامہ کو اس بچی کا، کون سا ایسا تعلق تھا ہلیری کلنٹن کا ملالہ کے ساتھ؟ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو دنیا بھر میں یہ اکلوتی مظلوم کیسے نظر آ گئی۔ یہ سب وہ ہیں جن کے حکم سے روزانہ ایسی کئی ملالے موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ صرف میرے ملک میں نہیں، پوری دنیا میں ان بچیوں کی تصویریں جمع کرنے لگوں تو ڈھیر لگ جائے جو صرف باراک اوباما کے حکم اور ہلیری کلنٹن کی سفارتی چھتری میں قتل ہوئیں۔ ہم کس قدر ظالم ہیں' ایک معصوم کردار تخلیق کرتے ہیں' اسے شہرت دیتے ہیں اور پھر اس کی موت سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ وہ قوم جسے ابھی کچھ اندازہ نہیں کہ یہ سب کیسے ہو گیا، لیکن چند دن بعد اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے والی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔ لیکن دعائیں کیوں قبول نہیں ہو رہیں۔ کیا ناراضگی کا عالم اس قدر شدید ہو چکا ہے۔ ہاں شاید ایسا ہی ہے اس لیے کہ جب میرے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے اور موم بتیاں جلانے، مذمتی قرارداد پاس کرنے، احتجاجی ریلی نکالنے میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ جب دعا ایک تقریب (Event) بن جائے تو دل خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس بستی کے لوگوں کو حالتِ عذاب میں بھی اللہ کی طرف لوٹنا نہیں آیا۔ لیکن دعا جسے اللہ عبادت کا مغز کہتا ہے، جو ندامت کے آنسوؤں اور توبہ کی شرمندگی کے ساتھ ہونی چاہیے تھی۔ کیمروں کی چکا چوند میں ہوگی تو پھر مقبول عوام تو شاید ہو جائے، مقبول بارگاہِ الٰہی نہیں۔ اللہ کی طرف لوٹ جانے کے آداب ہوتے ہیں۔ پہلا قرینہ یہ ہے' تسلیم کر لیا جائے کہ ہم بے بس ہیں، مجبور ہیں، کم مایہ ہیں، تیرے غضب سے ڈرتے ہیں، صرف تیری رحمت سے امید رکھتے ہیں، اور اس بات پر کامل ایمان رکھتے ہیں کہ تو ہی ہمارے حالات بدل سکتا ہے۔ چیختے چنگھاڑتے بیانات اور مضطرب عوام کے درمیان مجھے کچھ ایسے چہرے بھی دکھائی دے رہے ہیں' جو آنے والوں دنوں کے خوف سے کانپ رہے ہیں۔ جنہیں معلوم ہے کہ ابھی سٹیج سے پردہ سرکایا گیا ہے، موت کا کھیل تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔

نوٹ: گزشتہ کالم میں قرآن پاک کی آیت کا ترجمہ غلط چھپ گیا تھا۔ جس کے لیے اپنے اللہ سے معافی کا طلب گار ہوں اور پڑھنے والوں سے معذرت کرتا ہوں۔ اصل ترجمہ ہے۔'' اے محمد ﷺ تیرا مذاق اڑانے والوں کے لیے ہم کافی ہیں''۔

KitaabPoint.blogspot.com

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

پرچم اتار دیا گیا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد فاتح اقوام کے سب سے بڑے اتحاد اور دنیا کی طاقتور ترین فوجی قوتوں کا پرچم۔وہ قوتیں جو آج سے تیرہ سال قبل دھاڑتی، چنگھاڑتی ہوئی اس کمزور،وسائل اور ٹیکنالوجی سے محروم ملک، افغانستان میں داخل ہوئی تھیں۔دنیا بھر کے لیے ایک لکیر کھینچ دی گئی تھی کہ اگر تم ہمارے ساتھ اس کمزور ملک سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر ہمارے دشمن ہو۔2001ء کی سردیاں اس ملک کیلئے عذاب کی صورت بنادی گئیں۔دنیا بھر میں سے تین ملک ایسے تھے جو اس ملک پر برسراقتدار طالبان کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ جن میں سے ایک پڑوسی پاکستان بھی تھا۔باقی پڑوسی ایران اور تاجکستان تو ویسے ہی ان کے خلاف شمالی اتحاد کو ہر طرح کی مدد دیتے ہوئے جنگ میں شریک تھے۔لیکن جس پڑوسی نے انہیں ایک قانونی حکومت تسلیم کیا تھا، اسی پڑوسی کی سرزمین ان پر حملے کے لیے استعمال ہوئی۔دنیا نے اس ملک کو دہشت گردی کا منبع قرار دیا اور پھر دو سو کے قریب ممالک میں سے اڑتالیس ممالک نے اپنی فوجیں وہاں اتار دیں۔دشمن پڑوسیوں میں گھرا ہوا یہ ملک، ایک جانب پاکستان جہاں سے 57 ہزار دفعہ امریکی جہاز اڑے اور انہوں نے اس سرزمین پر بم برسائے، دوسری جانب تاجکستان جس نے قلاب والا زمینی راستہ دیا تاکہ نیٹو افواج شمالی اتحاد کے جلو میں اندر داخل ہو سکیں اور تیسری جانب ایران جس کے پاسداران شمالی اتحاد اور حزب وحدت کے ساتھ اس ملک پر چڑھ دوڑے۔ تیرہ سال قبل اس دنیا میں ٹیکنالوجی کے بت کی پرستش کرنے والے کیسی کیسی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ پہلے چند ماہ تو ایسے تھے کہ ہر کوئی بلند آواز میں پکار رہا تھا، دیکھو ٹیکنالوجی نے آج اُس قوم کو شکست دے دی ہے جس سے کوئی نہ جیت سکا۔کوئی ان کے بھاگنے کے قصے سناتا اور کوئی کہتا کہ یہ تو چند ہزار لوگ تھے جنہیں کچھ طاقتوں نے اکٹھا کیا تھا، وہ پیچھے ہٹ گئیں تو دیکھو کیسے بھگوڑے ہو گئے ہیں یہ سب کے سب۔اب افغانستان میں ایسے لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ یہ اب دوبارہ واپس نہیں آسکتے۔اس کے بعد کے تیرہ سال آگ اور خون کے ساتھ کھیلتے ہوئے سال ہیں۔ایک لاکھ چالیس ہزار فوجی جو دنیا کی بہترین ٹیکنالوجی سے لیس ہتھیاروں کے ساتھ یہاں خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ایسے ٹینک جو اپنے اندر سے ایک ایسے مقناطیسی ردِّعمل کا دائرہ بنا سکتے تھے جن سے میزائل بھی واپس لوٹ جاتا تھا۔ آسمانوں سے پہرہ دیتے جہاز۔ فضا کی بلندیوں پر موجود ایک ایک لمحے کو ریکارڈ کرتے اور معلومات فراہم کرتے سٹلائٹ۔ان سب کے باوجود کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ جب نیٹو افواج یا ان کی بنائی ہوئی افغان فوج نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ ہمارا پورے افغانستان پر کنٹرول ہو گیا ہے۔بلکہ حقیقت یہ تھی کہ سوائے چند شہروں کے چند میل علاقوں کے پورے افغانستان میں امریکی یا نیٹو افواج کو کسی قسم کی کوئی دسترس تک حاصل نہ تھی۔ آخری سال تو شکست کے بدترین سالوں میں سے ایک تھا۔یکم جنوری 2014ء سے 31 دسمبر تک 9167 افراد اس جنگ کا شکار ہوئے۔ جن میں 3,188 ایسے تھے جو اس بری طرح زخمی ہوئے کہ ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ بوکھلاہٹ میں الزامات حقانی نیٹ ورک پر لگائے گئے جس کے خلاف اس دوران شمالی وزیرستان میں آپریشن جاری تھا۔کون ٹیکنالوجی کی شکست مانتا ہے اور وہ بھی نہتے افغانوں کے ہاتھوں جن کا سارا تکیہ ہی تائید الٰہی پر تھا۔کیا کبھی امریکہ اور نیٹو کے اتحادیوں نے سوچا بھی ہو گا کہ اسقدر عظیم فوجی قوت کے باوجود ان کے تین ہزار چار سو اٹھاسی 3488 سپاہی مارے جائیں گے۔ یہ وہ گنتی ہے جو وہ خود مانتے ہیں۔جب سے سی آئی اے بنی ہے اس کے نوے کے قریب اہم ایجنٹ مختلف ممالک میں مارے گئے ہیں، جن میں سے گیارہ اس افغان جنگ میں قتل ہوئے۔افغانستان ایک ایسا ڈراونا خواب تھا جس کے اختتام کی تقریب 28 دسمبر کو منعقد ہوئی ۔ نیٹو افواج کے کمانڈر جنرل جان ایف کیمپبل (JohF.Campbell) نے کہا ”ہم اپنا طالبان کے خلاف جنگ کا ایجنڈا ادھورا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن ہم بھاگ نہیں رہے“۔ کیا خوبصورت فقرہ ہے ("away Wearenotwalking") یہ تسلی افغان قوم کو نہیں بلکہ اس افغان حکومت کو دی جا رہی جسے امریکیوں نے خود وہاں پر مسلط کیا ہے۔ جمہوری حکومت اور جمہوریت کے قیام کا کیا خوب تصور ہے کہ ایک ملک پر حملہ کرو، وہاں افواج اتارو، لوگوں کو قتل کرو، خود ایک آئین تحریر کرو، اپنی نگرانی میں الیکشن کراؤ اور بولو کہ ایسے زندگی گزارتے ہو تو ٹھیک ورنہ تمہیں دہشت گرد کہہ کر مار دیں گے۔اسی لیئے اس ”ٹوڈی“ حکومت کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ہم بھاگ نہیں رہے۔ لیکن اس اتوار کو امریکی صدر اوبامہ نے اپنے تحریری بیان میں کہا ہے کہ ”ہم نے ایک محتاط طریقے سے اس جنگ کا خاتمہ کیا ہے جبکہ افغانستان آج بھی ایک خطرناک علاقہ ہے“۔اس ملک میں تین لاکھ پچاس ہزار افغان فوجیوں کو بھرتی کیا گیا ہے جن کی ٹریننگ کے لیے 12 ہزار نیٹو کے فوجی یہاں پر موجود رہیں گے۔اس تقریب میں افغانستان کے نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر محمد حنیف اعتماد نے کہا کہ آپ ہمیں ایسے وقت میں چھوڑ کر جا رہے ہیں جس وقت ہم انتہائی مشکلات میں ہیں۔ ہمیں کبھی بھی نیٹو افواج کی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی آج ہے۔ جس وقت یہ تقریب ٹیلی ویژن پر نشر ہو رہی تھی تو اس دوران افغان افواج کے افسران کے انٹرویو بھی نشر کیے جا رہے تھے۔ یہ افسران کہتے تھے کہ تیرہ سالوں سے ہم ایک ایسی جنگ کے عادی ہو چکے ہیں جو نیٹو کی تکنیکی اور فوجی مدد کے بغیر لڑی ہی نہیں جا سکتی۔ ہمیں ہوائی جہازوں کی بمباری اور ٹینکوں کی یلغار میں آگے بڑھنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ہم ان کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل پاتے جبکہ ہمارے دشمن طالبان اس تمام تر ٹیکنالوجی سے بے نیاز جس طرف سے چاہیں ہم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔اب جبکہ یہ سپورٹ (مدد) ختم ہو رہی ہے، ہم بہت مشکل میں ہوں گے۔

جھنڈا اتار دیا گیا۔وہ فتح کرنے آئے تھے اور اپنے زخم چاٹتے رخصت ہوئے۔ یہ تیسری دفعہ ہو رہا ہے کہ عالمی طاقتوں کا غرور خاک میں مل رہا ہے۔یکم جنوری 1842ء برطانوی افواج، وہ برطانیہ جس کی علمداری میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اس پر کابل میں حملہ ہوا۔ تقریباً سترہ ہزار فوجی تھے جن میں اکثر انڈین اور ایک رجمنٹ ”44th“ برطانوی سپاہیوں پر مشتمل تھی ان سب کو غلزئی قبائل نے قتل کر دیا تھا اور ایک ڈاکٹر ولیم برائڈن کو زندہ چھوڑا تاکہ وہ جا کر اس عالمی طاقت کے کارپردازوں کو بتائے کہ افغان قوم کیا ہے اور آئندہ کابل کی طرف رخ مت کرنا۔ یہ ڈاکٹر گھوڑے پر سوار ہو کر 13 جنوری کو جلال آباد پہنچا اور برطانیہ کے چہرے پر عبرت کا نشان تحریر ہو گیا۔دوسری دفعہ یہ پرچم عظیم کمیونسٹ ریاست سوویت یونین کا تھا جو 1988ء میں ایسے اترا کہ خود اپنی ریاست تک متحد نہ رکھ سکا۔ ٹیکنالوجی کے بت ٹوٹتے ہیں لیکن ان کی پوجا کرنے والے نئے بت تراش لیتے ہیں لیکن وہ جنہیں صرف اللہ کی نصرت اور تائید پر بھروسہ ہوتا ہے وہ بار بار ثابت کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اصل طاقت کا سرچشمہ تو صرف اللہ کی ذات ہے اقبال نے کہا تھا۔

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

KitaabPoint.blogspot.com

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

ایک مجاہدہ کی موت

کس قدر خوش نصیب ہوتی ہے وہ بیوی جس کے دنیا سے گزر جانے پر اُس کے خاوند کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جو عورت عبادات پر کاربند رہی، کبائر سے بچتی رہی اور مرتے وقت اُس کا خاوند اُس سے خوش تھا تو میں اُسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ مرد بڑے کٹھور قسم کے ہوتے ہیں اور پھر یوسف خان جیسا وجیہہ اور کڑیل شخص کہ جس کے چہرے پر میں نے ہمیشہ پٹھانوں والی ایک سختی اور مجسم غصہ دیکھا تھا وہ اس عظیم خاتون کی موت پر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ نیویارک کے ایک سیکولر یہودی گھرانے میں پیدا ہونے والی یہ خاتون یوسف خان کی دوسری بیوی تھی۔ وہ کون سا ایسا جذبہ تھا، کس دین کی تعلیمات کا اثر تھا کہ نیویارک کی پرآسائش زندگی چھوڑ کر یہ خاتون دو مرلہ کے مکان میں اپنے خاوند کی دوسری بیوی کے ہمراہ ایسے رہی کہ پورے گھر کو نہ حقوق نسواں کے نعرے بلند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی دونوں بیویوں کی اولادوں کو اجنبیت اور محبت میں کمی کا شکوہ۔ بچے پہلی والی بیوی کو امی اور اس خاتون کو آپا کہتے۔ بچے امی کی نگہداشت میں ہوتے اور یہ خاتون مغرب کے دلکش چہرے میں چھپی اخلاقی غلاظتیں اور سیکولر نظامِ زندگی کے کریہہ نتائج سے پوری دنیا کو آگاہ کرنے کے لیے تصنیف و تالیف کا کام کرتی رہی۔ مریم جمیلہ' جس کا نام والدین نے مارگریٹ مارکیس رکھا تھا۔ 23 مئی 1934ء کو نیویارک کے ایک ایسے یہودی گھرانے میں پیدا ہوئی، جو مذہب سے بیگانہ اور سیکولر طرز زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی والدہ کے مطابق وہ ایک بہت ہی حساس اور مضطرب بچی تھی جو ہر وقت مختلف تہذیبوں کے بارے میں سوال کرتی اور اپنے مطالعے کو وسیع کرتی۔ اُس نے یہودیت، عیسائیت اور دیگر مذاہب کا مطالعہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی کر لیا تھا۔ جب 1953ء میں اُس نے روچسٹر یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو یہودی مذہب کے مطالعے کے دوران وہ صیہونی مظالم کی ناقد بنتی گئی۔ اسی دوران اُس نے یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے ایک کورس ''یہودیت کے اسلام پر اثرات'' میں داخلہ لیا جسے مشہور یہودی عالم' ابراہم کاٹش پڑھاتا تھا۔ حیرت ہے کہ یہی کورس مارگریٹ کو اسلام کے قریب لے آیا اور پھر اس نے مختلف اسلامی تنظیموں اور مراکز میں جانا شروع کیا، یہیں نو مسلم علامہ اسد کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' اس کے ہاتھ آئی۔ علامہ اسد آسٹریا کے معروف یہودی سکالر تھے۔ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد عرب دنیا میں آباد ہو گئے' لیکن علامہ اقبال کے کہنے پر ہندوستان آئے۔ قائداعظمؒ نے انہیں اگست 1947ء میں آئین اور قانون کی تدوین کے لئے قائم ہونے والے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ ''روڈ ٹو مکہ'' نے مارگریٹ کی دنیا ہی بدل دی۔ اُس نے دنیا بھر میں مسلمان عالموں سے خط و کتابت شروع کی۔ اسلام کے بارے میں تشنہ سوالوں کا جواب اُسے پاکستان کے عظیم سکالر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ملا۔ یہ خط و کتابت اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد شائع کی اور پھر مولانا مودودیؒ کے تعارف میں ایک کتاب (Who is Maudoodi) بھی لکھی۔ خط و کتابت کے بعد وہ اپنا گھر، والدین اور مغربی تہذیب کا دل نیویارک چھوڑ کر لاہور آ گئی جہاں مولانا مودودیؒ کے سامنے اسلام قبول کیا۔ جنہوں نے اس کا نام مریم جمیلہ رکھا۔ وہ کچھ عرصہ ان کے گھر پر ہی رہی۔ پھر انہوں نے ایک انتہائی وجیہہ، دراز قد اور نورِ ایمانی سے مزین چہرے والے جالندھر کے مہاجر پٹھان یوسف خان سے اس کی شادی کر دی۔ یوسف خان سے شادی کے وقت ان کی پہلی بیوی شفیقہ موجود تھیں۔ 31 اکتوبر کو ان کے جنازے پر جب میں اُس دو مرلے کے گھر میں یوسف خان صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا تو روتے ہوئے اس غمزدہ پٹھان نے کہا کہ اس نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی کہ مجھے شفیقہ کے ساتھ دفن کرنا۔ محبتوں کا الاؤ، رشتوں کا یہ احترام اور اللہ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کا یہ عالم صرف اسی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جس نے سیکولر ازم کی مکروہ شکل کو دیکھ اور پرکھ کر اسلام کی حقانیت کو قبول کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ 24 مئی 1961ء کے دن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ مکمل پردے میں رہیں، ایسا پردہ جس میں آنکھیں بھی نظر نہیں آتیں۔

میرے اوپر اس عظیم عورت کا بہت بڑا احسان ہے۔ اُس کی کتاب (Western civilization condemed by itself) مجھے 1972ء میں ملی۔ میری عمر پندرہ سال ہو گی اور میں کارل مارکس، والٹیئر اور فرائڈ وغیرہ کو پڑھ کر دہریت کی طرف مائل تھا۔ مغرب کی چکا چوند ویسے ہی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ لیکن اس کتاب کے دونوں حصوں میں مریم جمیلہ نے یونان کے افلاطون، روم کی اخلاق باختہ تہذیب، میکیاولی کا اصولوں سے ماورا سیاسی نظریہ، والٹیئر کی سیکولرازم، فرائڈ کی جنسی نفسیات، سیمن ڈی بوار کی حقوق نسواں کی تحریک، مالتھس کی برتھ کنٹرول، مارکس کی اشتراکیت، جیسے موضوعات پر اس قدر علم و عرفان سے تنقید کی ہے کہ آنکھیں حیران اور ذہن روشن ہونے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان نظریات کے مقابلے میں اسلام کے اصولوں کی حقانیت کو دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ اس کتاب کے دونوں حصوں میں مغرب کے خاندانی نظام، جنسی بے راہ روی، عورت کو زینتِ بازار بنانا اور کاروبار سمجھنا، نسلی بنیاد پر تشدد اور قتل و غارت، جمہوریت کے نام پر کارپوریٹ اور سرمایہ دار کی آمریت، کمیونزم کے پردے میں مکروہ ظلم اور انسانی حقوق کے قتل جیسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا۔ اس کتاب میں کوئی ایسا صفحہ نہیں ہے' جسے میں نے بار بار نہ پڑھا ہو اور جس کے علمی ذخیرے سے مجھے ہر دفعہ نئے موتی میسر نہ ہوئے ہوں۔ اگر میں اپنی زندگی میں چند کتابوں کا ذکر کروں جنہوں نے مجھے سیدھا راستہ دکھانے میں مدد کی اور میری دنیا بدلی تو یہ کتاب ان میں سے ایک ہے۔ مریم جمیلہ نے اپنی زندگی میں تیس کتابیں تحریر کیں جن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کا سحر آپ کو اپنی گرفت میں نہ لے لے (Islam versus the west)، (Islam and modem man) اور (Islam and westem society) یہ تین کتابیں تو ایسی ہیں کہ آج کے نوجوان کے ذہن میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب لئے ہوئے ہے۔

ہم کس قدر بدنصیب لوگ ہیں کہ مریم جمیلہ کی یہ تمام تصانیف نیویارک کی پبلک لائبریری میں موجود ہیں' بلکہ اس لائبریری نے مریم جمیلہ کے وہ تمام خطوط بھی محفوظ کر رکھے ہیں جو اُس نے 27 سال کی عمر سے جب اُس نے اسلام قبول کیا، اپنے والدین کے انتقال تک لکھے۔ اس میں سب سے خوبصورت وہ ہے جو اُس اپنے والدین کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے لکھا جسے وہ (Open Letter) کہتی ہے۔ مریم جمیلہ کی سوانح عمری لکھنے والی ڈیبرا ایکر لکھتی ہے کہ وہ ایک دن نیویارک کی لائبریری کے مخطوطات کی لسٹ دیکھ رہی تھی، تو عیسائی اور یہودی ناموں کے درمیان ایک مسلمان نام دیکھ کر حیران رہ گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک مسلمان عورت کے خطوط نیویارک میں کیا کر رہے ہیں اور پھر ان خطوط نے مجھے اس خاتون کے سحر میں گرفتار کر لیا۔ مریم جمیلہ کے خطوط نے ڈیبرا کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ 2007ء میں لاہور کے سنت نگر کے دو مرلے کے گھر میں جا پہنچی اور پھر ساڑھے تین سال کی محنت سے مریم جمیلہ کے خطوط اور اُس کے علمی کام پر ایک کتاب (The convent: A fable of Islam and America) لے کر سامنے آئی۔ آج ہمارے کالجوں یونیورسٹیوں، سکولوں اور دیگر اداروں کی لائبریریاں مغرب میں لکھی ہر اسلام دشمن کتاب سے بھری پڑی ہیں۔ ہر فیشن زدہ کتابوں کی دکان پر یہ کتابیں میسر ہیں۔ لیکن اسلام کی اس مجاہدہ اور سیکولرازم، جمہوریت اور مغرب کے کریہہ چہرے سے نقاب اتارنے والی مریم جمیلہ کی کتابوں سے ان کا دامن خالی ہے۔

نوٹ: العلم ٹرسٹ ایک ہفتے تک مریم جمیلہ کی کتاب (Western Civilization Condemned by itself) کے دونوں حصے PDF فارمیٹ میں اپنی ویب سائٹ (alilmtrust.com.pk) پر رکھ دے گا (انشاءاللہ) ہمیں اس کتاب کا ترجمہ بھی کروا کر چھاپنا ہے۔ جو احباب ترجمہ کرنا چاہتے ہیں اور اس میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ (contact@alilmtrust.com.pk) پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

ایک سوال

علم سیاسیات ایک ایسا علم ہے جو موجودہ قومی ریاستوں کے تصور کے بعد سے ایک اہم مضمون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگری یافتہ تعلیم کی دنیا میں اسے ایک سائنس کی حیثیت حاصل ہے، اسی لیے اسے پولٹیکل سائنس کہا جاتا ہے۔ فن حکمرانی اور رموز سیاست پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن ان موضوعات کا زیادہ تر تعلق تاریخ اور فلسفہ کی کتب سے تھا۔ لیکن قومی ریاست چونکہ موجودہ جدید مغربی تہذیب کی ایک ایسی تخلیق تھی جس کو قائم رکھنے، اس کی سرحدوں کو تقدس دینے اور اس کے خدوخال کو واضح کر کے اسے سائنسی طور پر انسانوں پر مسلط کرنا ضروری تھا، اس لیے اس کے لیے ایک "سائنس" تخلیق کی گئی۔ جسے پولٹیکل سائنس کہتے ہیں۔ اس علم میں ریاست، حکومت، طرزِ حکمرانی اور دیگر معاملات پر بحث کی جاتی ہے۔ اسی علم کے زیرِ اثر دیگر علوم کی بھی درجہ بندی کی گئی ہے، مثلاً سیاسی معاشیات، سیاسی اخلاقیات اور سیاسی فلسفہ و نفسیات وغیرہ۔ یہ تمام موضوعات بھی اب علیحدہ علیحدہ مضمون بن چکے ہیں اور ان پر یونیورسٹیاں ڈگری عطا کرتی ہیں۔ ریاستی قوانین بھی علم سیاسیات کا اہم ترین موضوع ہے، اسی طرح بین الاقوامی تعلقات بھی علم سیاسیات کی ایک شاخ تھی جو اب یونیورسٹیوں کا ایک جاندار اور پھلتا پھولتا علمی میدان ہے۔

علم سیاسیات کا بنیادی موضوع ریاست ہے اور اسی کے اردگرد یہ سارا علم یا ساری سائنس گھومتی ہے۔ دنیا میں علم سیاسیات کی کوئی بھی کتاب نکال کر اس میں ریاست کی تعریف ڈھونڈ لیں، یہ آپ کو ایک ہی ملے گی۔ علم سیاسیات یا پولٹیکل سائنس ریاست کو چار اجزائے ترکیبی کا مجموعہ بتاتا ہے۔ جہاں اور جب یہ چاروں اجزاء جمع ہو جائیں ریاست خود بخود وجود میں آ جاتی ہے۔ نمبر 1 علاقہ: یعنی اس کرہ ارض پر ریاست کے پاس چھوٹے سے چھوٹا علاقہ ضرور ہونا چاہیے، ورنہ یہ ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ نمبر 2 عوام: وہ علاقہ جس پر یہ ریاست قائم ہو خواہ وہ ایک بے آب و گیاہ میدان، یا لق و دق صحرا ہی کیوں نہ ہو، اس میں چند انسان ضرور آباد ہونے چاہئیں۔ سمندر دنیا کے رقبہ کا تین چوتھائی ہیں، وہاں آبی حیات بھی موجود ہے لیکن ریاست کا درجہ حاصل نہیں کر پاتے البتہ ان کے درمیان تھوڑی سی خشکی پر انسان بسنے لگیں تو مناکو جیسی سلطنت وجود میں آ جاتی ہے۔ نمبر 3 اقتدارِ اعلیٰ: یہ ایسا تصور ہے جسے پولٹیکل سائنس میں قومی ریاستوں کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ڈالا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست خود مختار ہے، اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے، اور اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں۔ اسی اقتدارِ اعلیٰ کے احترام اور اس کے تحفظ کی جنگ تو آج دنیا میں ہر جگہ نظر آتی ہے اور نمبر 4 ہے حکومت: یعنی ریاست کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ایک حکومت ہونی چاہیے۔ حکومت کو ریاست کا نمائندہ ادارہ کہا گیا ہے یعنی (Organofstate)۔ یہ چاروں اجزائے ترکیبی جب بھی اور جہاں بھی وجود میں آ جائیں تو ریاست وجود میں آ جاتی ہے۔ اسے اقوام متحدہ اپنی ممبر شپ دے یا نہ دے، اسے دنیا کے بڑے بڑے ممالک، حتیٰ کہ اسے اس کے پڑوسی بھی تسلیم کریں یا نہ کریں، پھر بھی ریاست اپنا وجود رکھتی ہے اور سیاسیات کے کسی بھی تصور کے تحت اس کے ریاست ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قومی ریاستوں کے تصور اور موجودہ علم سیاسیات کے رنگ میں رنگے ہوئے اسلامی مذہبی مفکرین نے بھی اسلام کے تمام قوانین اور مسلمانوں کی تمام اجتماعی ذمہ داریوں کو ریاست کے قیام کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کام اگر بزورِ قوت کرنا مقصود ہے تو ریاست کا حکم نامہ یا دخل ضروری ہے۔ مسلمانوں پر جہاد فرض ہے، لیکن کوئی گروہ خود جہاد کا اعلان نہیں کر سکتا، بلکہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہاد کا اعلان کرے، لوگوں کو جہاد کے لیے بلائے اور انہیں مختلف محاذوں پر بھیجے۔ یہی منطق القاعدہ اور طالبان کے خلاف استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی ریاست کے ایک محلے، گاؤں یا علاقے میں تمام لوگ مل کر اگر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم اپنے درمیان ہونے والے تمام جھگڑوں کا فیصلہ اسلامی قوانین کے مطابق کریں گے تو پھر بھی یہ تمام اسلامی مفکرین کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا کرنا فتنہ پیدا کرنا ہے اور چونکہ ریاست کی صورت میں ایک نظم اجتماعی قائم ہو چکا ہے اس لیے ملک میں دو قوانین نہیں ہو سکتے۔ سوات کے صوفی محمد کے خلاف یہی دلیل دی جاتی ہے۔ رویت ہلال یعنی عید کے چاند میں بھی امت کے درمیان اختلاف بنیادی طور پر اسی قومی ریاست کو اسلام کے تصورِ امت کے ساتھ گڈمڈ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ علماء و فقہا کہتے ہیں کہ ہر ریاستی سرحد میں مسلمانوں کا ایک نظم اجتماعی قائم ہے۔ اس لیے سرحد کے اس طرف پاکستان میں عید ہو گی اور ایک قدم اٹھا کر دوسری طرف ایران یا افغانستان میں داخل ہو جاؤ تو وہاں روزہ ہو گا۔ پوری دنیا میں بسنے والے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو ایک امت، ایک قوم یا ایک ملت نہیں مانا جاتا۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو امریکہ کے شہر ہوائی یا آسٹریلیا کے سڈنی میں بھی اگر چاند نظر آ جائے تو پوری امت عید ایک ساتھ کر سکتی ہے۔ یہ امت آسکر کی تقریب، مائیکل جیکسن کی تدفین اور گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے گرنے کے مناظر تو ایک ساتھ دیکھ سکتی ہے لیکن چاند ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتی، کیونکہ قومی ریاستوں میں مسلمانوں کا نظم اجتماعی وجود میں آ چکا ہے اور ہر ملک کا علیحدہ علیحدہ مفتی چاند دیکھنے پر مامور ہے۔ اس امت میں آج کے دور کا بڑا اختلاف نہ فقہ پر ہے اور نہ اجتہاد کی بنیادوں پر بلکہ اس امت میں موجودہ دور کا اختلاف قومی ریاستوں کی تخلیق پر ہے۔ چودہ سو سال اس امت پر نظم اجتماعی ایک اسلامی خلافت کے طور پر قائم رہا۔ کوئی تاریخ اٹھا کر بتا سکتا ہے کہ صرف عراق اور ایران کی جنگ میں جتنے لوگ قتل ہوئے ہیں کیا مسلمانوں کی چودہ سو سال کی اجتماعی تاریخ میں مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں میں اتنے قتل ہوئے ہوں گے۔ ہرگز نہیں، مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد جس بے دردی سے بہایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ تاریخ میں کبھی بھی امت میں شرعی قوانین کے نفاذ یا اسلامی معیشت کے اصولوں پر ایک لمحہ کے لیے بھی اختلاف نہیں رہا۔ ہاں ان قوانین کی تصحیح اور نوک پلک سنوارنے کی تحریکیں ضرور چلتی رہیں۔

جو لوگ مسلمانوں کو ایک چاند دیکھنے پر متفق ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے وہ کیسے چاہیں گے کہ اس امت میں کوئی ایسی آواز اٹھے جو ان قومی ریاستوں کی سرحدوں سے بالاتر ہو۔ ایسا کوئی نہیں ہونے دے گا۔ جو سرحدیں مغرب نے کھینچیں ہیں ان کے اندر چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح پڑے رہیں، یہ عراق ہے، یہ شام، یہ سعودی عرب، یہ مصر اور یہ ایران۔ خبردار ان سرحدوں کو چھیڑنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بہت مقدس ہیں۔ جنوبی افریقہ کو پچاس سال تک اقوامِ متحدہ نے قبول نہیں کیا تھا، تو کیا وہ ریاست کے درجے سے خارج ہو گئی۔ سیاسیات کے علم کے تمام اصولوں کے مطابق دولتِ اسلامیہ ایک ریاست ہے اور مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے دعویداروں کے مطابق بھی ریاست کا درجہ حاصل کر چکی۔ لیکن نہ اقوام متحدہ اسے کبھی مانے گی اور نہ ہی آج کے قومی ریاستوں کے مسلمان حکمران۔ ایران میں 38 سال قبل اسلامی انقلاب آیا تھا اور آج تک قائم ہے۔ سیاسیات کے اصولوں کے مطابق قائم ایرانی ریاست اور اسلام کے نظم اجتماعی کے عین مصداق 1988ء میں ایک حکم نامہ جاری کیا گیا کہ ایران کی جیلوں میں قید مجاہدین خلق کے جتنے بھی لوگ ہیں وہ ملحد اور منافق اور واجب القتل ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ وہ اپنے خیالات سے توبہ کرتے ہیں تو ٹھیک ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد جنہوں نے توبہ نہیں کی تھی ان قیدیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ ان میں عورتیں اور نوجوان لڑکے بھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ کلمہ گو مسلمان تھے لیکن اسلام کے نظم اجتماعی کے تصور اور موجود سیاسیات میں ریاست کے تصور نے انقلابیوں کو ایسا کرنے کا جائز اختیار دے دیا تھا کہ انہیں ریاست کا باغی قرار دے کر پھانسی پر چڑھا دے۔ کیا اس امت کے مفتیانِ کرام، ماڈرن مسلم فلاسفر اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ سیاسیات کے اصولوں کے مطابق قائم ریاست اور اسلام کے نظم اجتماعی کے اصولوں پر موجود حکومت کہیں اور کسی جگہ اور کسی بھی فقہ کے تحت اگر قائم ہو جائے تو کیا اسے وہ تمام اختیار حاصل نہیں ہو جاتے، جو ایرانی انقلابیوں کو حاصل تھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

......ایک غدار رنجیت سنگھ

مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی تو ہندوستان پر مکمل قبضے کے خواب نے تمام ہندو راجوں کو متحد کیا اور ان کا اقتدار پورے ہندوستان پر اس حد تک قائم ہو گیا کہ مغل بادشاہ شاہ عالم کے بارے میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی، "شاہ عالم۔ از دلی تا پالم" ، پالم وہ جگہ ہے جہاں آجکل دلی ائرپورٹ ہے۔ ایسے میں شاہ ولی اللہ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی افغانستان کی سرزمین سے جانبازوں کے ہمراہ حملہ آور ہوا اور مرہٹوں کی شکل میں تمام ہندوؤں کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ہندوستان کو "ہندو توا" بنانے کا خواب چکنا چور کرنے کے بعد واپس افغانستان چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پورے برصغیر میں مرکزیت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے علاقے کا بالادست حکمران بنتا چلا گیا۔ جس خطے میں سب سے زیادہ افراتفری تھی وہ پنجاب تھا۔ سکھ اکبر کے زمانے سے جتھوں کی صورت مسلح جدوجہد کر رہے تھے اور بہت حد تک گوریلا جنگ میں منظم ہو چکے تھے۔ ان کے ہاں ہر علاقے، خاندان یا برادری کے حساب سے گروہ ترتیب پا چکے تھے جنہیں "مسل" کہا جاتا تھا۔ پورے پنجاب میں سکھوں کی بارہ مسلیں تھیں اور سب کی سب خود مختار بلکہ ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں۔ ان بارہ مسلوں میں سے ایک مسل گوجرانوالہ کے قریب آباد تھی جس کے سربراہ کے گھر 1780ء میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ سترہ سال کا ہوا تو باپ نے اسے دوسری مسلوں کے ساتھ جنگوں پر روانہ کرنا شروع کر دیا۔ صرف تین سال کے بعد یعنی بیس سال کی عمر میں وہ مسل کا سربراہ بن گیا۔ خوش قسمت اور ذہین شخص رنجیت سنگھ سربراہ بنتے ہی ایک بہت بڑی سلطنت کا خواب دیکھنے لگا۔ اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے اس نے پیش قدمی شروع کر دی اور پھر وہ ہریانہ سے ملتان، پشاور اور کشمیر تک کے علاقے کا طاقتور ترین حکمران بن گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ برصغیر کی تاریخ میں سکھوں کا وہ سردار جس نے ان کی سلطنت کی بنیاد رکھی جو پچاس سال تک قائم رہی۔

سکھوں کے اس عظیم حکمران کی ساری تربیت جنگ وجدل اور مار دھاڑ میں ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ہمراہ ایک برطانوی منظم فوج بھی لے کر آئی تھی۔ برطانیہ کی اس منظم فوج سے پہلے برصغیر میں مختلف لوگوں کو پانچ ہزاری یا دس ہزاری منصب دیئے جاتے تھے، جو جنگ کے وقت اپنے منصب کے مطابق افراد فراہم کرتے تھے۔ باقاعدہ منظم فوج کا کوئی رواج نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کو بہت شوق تھا کہ اس کی بھی ایک ایسی ہی ماڈرن اور منظم فوج ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے فرانس اور اٹلی سے فوجی نظم وضبط کے ماہر چار جرنیل (1) ونچورا (Vanchoora)، (2) الارڈ (Allard)، (3) ایوی ٹیبل (Avitabile) اور (4) آگسٹ کورٹ (August Court) بلوائے۔ انہوں نے سکھوں کی ایک فوج منظم کی جسے خالصہ فوج کہا جاتا تھا اور اس کا ہیڈ کوارٹر لاہور سے چند کلومیٹر دور شالامار باغ کے قریب اس جگہ تھا جسے "بدھو کا آوا" کہتے تھے۔ فوج کو منظم کرنے اور اسی پر اپنی حکمرانی کی مکمل بنیاد رکھتے ہوئے وہ یہ بھول گیا کہ رعایا کے چلانے کے لیے ایک اچھی انتظامیہ اور عدلیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک مملکت میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کا حل فوج کا استعمال کر کے نکالا جا سکتا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے انتظامی امور کے لیے بھی فوج کو بھیجتا۔ مالیہ وصول کرنا ہو، کہیں ڈکیتی ہو جائے۔ قبائلی تصادم ہو، ہر جگہ فوجی افسران جاتے اور معاملات سنبھالتے۔ انصاف کے لیے کوئی منظم نظام نہیں تھا بلکہ جگہ جگہ فوجی عدالتیں لگتیں اور فوری طور پر انصاف فراہم کر دیا جاتا۔ 1811ء میں جب یہ فوج ترتیب دی گئی تو اس کی تعداد صرف چار ہزار تھی جبکہ 1839ء تک یہ چالیس ہزار ہو گئی، جس کے ساتھ ایک لاکھ گھڑسوار دستے اور توپ خانہ بھی شامل تھا۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے فوجی عدالتیں اکثر لوگوں کو بھاری جرمانے کرتیں۔ چھوٹے سے چھوٹے جرم پر بھی جائیداد قرق کرنے کا حکم دے دیا جاتا۔ برصغیر کی تاریخ میں سب سے زیادہ مالیہ اسی دور میں وصول کیا گیا۔ یہ پیداوار کا چالیس فیصد تک تھا۔ ان یورپی جرنیلوں نے کٹر سکھ حکمران کو سیکولر حکومتی چہرہ بنانے کا درس دیا۔ اسی لیے 1831ء میں جب اس نے برطانوی گورنر جنرل لارڈ ولیم ب ینٹنگ سے ملنے کیلئے اپنا وفد بھیجا تو اس میں ہری سنگھ نلوا (سکھ) فقیر عزیز الدین (مسلمان) اور دیوان موتی رام (ہندو) شامل تھے۔ لیکن خالصہ فوج کے اکثر سپاہی چونکہ سکھ تھے اس لیے ان کے انتظامی معاملات اور عدالتی فیصلے مسلمانوں کے خلاف بلکہ بعض دفعہ ان کے لیے ہتک آمیز ہوتے۔ فوج کو اپنے اس کردار نے یہ احساس دلا دیا کہ اصل میں وہی حکمران ہیں اور انہوں نے ملکی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ پر چونکہ اتفاق رائے تھا، اس لیے اس کے زمانے میں دخل اندازی زیادہ نہ ہو سکی۔

لیکن جب اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت پر بیٹھا تو سکھ دو بڑے سیاسی گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ڈوگرے اور سندھنانوالے، سدھنانوالہ گروپ کا سردار دھیان سنگھ فوج کے ہیڈ کوارٹر "بدھو کے آوے" میں گیا اور ان کو خفیہ اطلاع دی کہ کھڑک سنگھ پنجاب کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ پورے پنجاب میں ایک پراپیگنڈا مہم شروع کر دی گئی اور صرف تین ماہ بعد فوج نے کھڑک سنگھ کو غدار قرار دے کر تخت سے اتار دیا اور اس کے بیٹے نونہال سنگھ کو جو لڑکپن میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور فوج اُسے اپنا نمائندہ سمجھتی تھی، اُسے تخت پر بٹھا دیا۔ یوں سکھ فوج نے دو اختیار اپنے قبضے میں لے لیے۔ ایک مہاراجہ اور وزیر کی تقرری اور دوسرا یہ فیصلہ کرنا کہ غدار کون ہے اور محبّ وطن کون۔ لیکن ایک سال بعد ہی نونہال سنگھ ایک حادثے میں مارا گیا تو سندھنانوالوں نے کھڑک سنگھ کی بیوہ چاند کور تخت پر بٹھا دیا۔

دھیان سنگھ کہاں چین سے بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کو ساتھ ملایا اور فوج کے ہیڈ کوارٹر "بدھو کے آوے" پہنچ گیا اور جرنیلوں نے شیر سنگھ کی حمایت کر دی۔ چاند کور کو اقتدار پر صرف دو ماہ ہوئے تھے کہ ستر ہزار فوج لاہور کے شہریوں پر ٹوٹ پڑی۔ کشت وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ آخر شہریوں کی جانیں بچانے کے لیے چاند کور کو شیر سنگھ کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ شیر سنگھ نے تین سال حکومت کی، لیکن چونکہ اسے اقتدار فوج نے دلوایا تھا اس لیے اس کے سارے فیصلے فوج کے ہیڈ کوارٹر یعنی "بدھو کے آوے" میں ہونے لگے۔ جس کو قتل کرنا ہوتا اُسے انگریز کا ایجنٹ یا غدار کا لقب دینا کافی تھا۔ ڈوگرا گروپ فوج کی آشیرباد سے حکمران تھا اور سندھنانوالے معتوب۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کو قتل کیا اور بدلے میں ہیرا سنگھ نے سندھنانوالوں کے کئی افراد کو قتل کر دیا اور سیدھا فوج کے ہیڈ کوارٹر بدھو کے آوے پہنچ گیا اور عرض کی سندھنانوالے غدار ہیں اور اگر اسے اقتدار دے دیا جاوے تو وہ سپاہی کی تنخواہ نو روپے سے بڑھا کر بارہ روپے اور گھڑسوار کی تیس روپے ماہوار کر دے گا۔ ایک بار پھر فوج لاہور پر حملہ آور ہو گئی۔ پوری رات توپ خانے سے گولہ باری کے بعد جب فوج صبح شہر میں داخل ہوئی تو لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور ہیرا سنگھ کو وزیر۔ ہیرا سنگھ نے فوج کی مراعات میں اضافہ کیا۔ ڈھائی روپے تنخواہ اور بڑھا دی، لیکن ایک دن جرنیل اس کے ایک مشیر سے ناراض ہو گئے اور اسے اقتدار سے علیحدہ کر کے گرفتار کرنا چاہا، مگر وہ بھاگ نکلا اور فوج نے اس کا تعاقب کر کے مار دیا اور اس کے ماموں جواہر سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا۔

اب بدھو کے آوے والوں کے مطالبات بہت بڑھ گئے۔ جواہر سنگھ نے سارا خزانہ بلکہ محل کے سونے کے برتن تک ڈھلوا کر کنٹھے بنوائے اور سکھ فوج میں تقسیم کر دیئے، جو ٹیکس اکٹھا ہوتا خرچ کر دیا جاتا مگر مطالبات بڑھتے گئے آخر ایک دن جواہر سنگھ کو ہیڈ کوارٹر یعنی بدھو کے آوے میں طلب کیا گیا۔ اس کی بہن رانی جنداں اپنے بیٹے دلیپ سنگھ کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے آئی، مگر سکھ جرنیلوں نے بہن کے سامنے بھائی کو قتل کر دیا۔

اب نو سالہ دلیپ سنگھ حکمران تھا اور رانی جنداں سرپرست، لیکن کوئی بھی فوج کے ڈر سے وزیر نہیں بننا چاہتا تھا، جس کو کہا جاتا وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ جاتا۔ گلاب سنگھ اور تیج سنگھ جیسے "بدھو کے آوے" والوں کے وفادار بھی انجام سے ڈر کر بھاگ گئے۔ کمسن دلیپ سنگھ کو کچھ ناموں کی پرچیاں دی گئیں اور قرعہ نکال کر زبردستی لال سنگھ کو وزیر بنایا گیا۔

خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ توشہ خانہ کے برتن بھی بیچے جا چکے تھے، لیکن بدھو کے آوے میں بیٹھی خالصہ فوج کے مطالبات بڑھتے جا رہے تھے۔ رانی جنداں کے پاس بلیک میلنگ سے نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ خالصہ فوج کو انگریز کی فوج کے ساتھ لڑا دیا جائے۔ پراپیگنڈے کا وہ طریقہ جو خالصہ فوج استعمال کرتی تھی، اس نے بھی شروع کیا اور سرگوشیوں کو مہم چلائی کہ انگریز پنجاب پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ عام سپاہی کو انگریز کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لیے وہ مرنے مارنے پر تیار تھا، لیکن جرنیلوں کو اندازہ تھا اور وہ لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مخالفت کی، رانی جنداں نے پراپیگنڈا عام فوجیوں تک پھیلا دیا۔ اب بدھو کے آوے میں بیٹھے جرنیلوں کے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ "طاقتور" خالصہ فوج جب لڑنے نکلی تو عوام نے، جس کا انہوں نے پہلے ہی بھرکس نکال دیا تھا، ان کا ساتھ نہ دیا۔ شکست فاش ان کا مقدر بنی۔ سکھ حکمرانی کا دور تمام ہوا، اور ان کے پاس ماضی کو یاد کرنے کے لیے بس ایک نعرہ باقی رہ گیا "راج کرے گا خالصہ"۔۔۔

نوٹ: فیس بک پر میرا پیج www.facebook.com/oryamj۔ اس کے علاوہ میرا کسی بھی پیج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اکثریت کی آمریت

انسان کو رنگ، نسل، زبان اور علاقے میں تقسیم کر کے قومی ریاستوں کے قیام کے ساتھ ساتھ جس تصور نے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کی وہ جمہوریت یا عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آنے والی حکومت کا دلآویز نقشہ تھا۔ لوگوں کو ایک ایسا شاندار اور خوش کن قسم کا نعرہ دیا گیا جس نے انہیں یقین دلا دیا کہ ان کے ووٹ سے جو لوگ برسرِ اقتدار آتے ہیں وہ انہی کے نمائندے ہوتے ہیں اور انہی کے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ سب بیسویں صدی کے آغاز کی باتیں ہیں۔ وہی آغاز جس کی پہلی دہائی ایک عالمی جنگ عظیم میں صرف ہوئی اور کروڑوں لوگوں کی جان لے گئی۔ لیکن اس پہلی جنگ عظیم میں وہ عالمی طاقتوں جنہوں نے پوری دنیا کو اپنی کالونی بنا رکھا تھا، انہوں نے باقی ماندہ دنیا کو بھی فتح کر لیا اور پھر اسے اپنی بادشاہت میں شامل نہ کیا، بلکہ اس کے حصے بخرے کر دیئے۔ یہ حصے بخرے انہوں نے رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر کیے۔ یہ باقی ماندہ دنیا کون سی تھی؟ یہ باقی ماندہ دنیا مسلمانوں کی حکومتِ عثمانیہ، افریقہ کا براعظم، جنوبی امریکہ اور مشرقِ بعید تھا۔ جو عالمی طاقتیں اس وقت بامِ عروج پر تھیں، ان میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سپین، ہالینڈ اور پرتگال شامل تھے۔ امریکہ عالمی طاقت تھا مگر دور دراز بھی تھا اور اس جنگ سے نسبتاً الگ بھی۔ اس جنگ کے بعد دنیا کا بیشتر حصہ قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ایک عالمی تنظیم بنائی گئی جس کا نام تھا "لیگ آف نیشنز" یعنی "جمعیت اقوام"۔ دنیا کو قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے بنی نوع انسان کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنانے کا تصور چونکہ اسلام کی بنیادی روح کے منافی تھا اسی لیے اس تصور کے خلاف جو طاقتور ترین آواز بلند ہوئی وہ علامہ اقبال کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا پیغام انسانوں کی وحدت اور یگانگت ہے، اقوام کی جمعیت کا نہیں۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ مِلل، حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا، خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

انسانوں کو رنگ، نسل، زبان اور علاقے میں تقسیم کر کے ان کو آپس میں لڑانے کا یہ قومی ریاستوں کا کھیل صرف تیس سال بعد ہی دنیا کو ایک اور خونی عالمگیر جنگ کا تحفہ دے گیا۔ یہ جنگ تو خوفناک بھی تھی اور تباہ کن بھی۔ وہ جنگ جس میں پہلی دفعہ دو شہروں پر ایٹم بم برسائے گئے۔ دنیا کا کون سا خطہ تھا جو اس کی لپیٹ میں نہ آیا ہو۔ لیکن 1915 سے 1945 ان تیس سالوں میں ان قومی ریاستوں کو خونخوار بنانے اور اپنی اپنی سرحدوں میں خونی پنجوں کو تیز کرنے میں جس تصور نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ جمہوریت تھی۔ لوگوں کے اندر چھپی عصبیت اس جمہوری نظام میں کھل کر سامنے آ گئی۔ جرمنی کی جنگ عظیم اول کی شکست نے ہٹلر کے جذبہ انتقام کو عوام میں بے حد مقبول کیا اور وہ اپنی قوم کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ الیکشنوں میں وہ عوام کی واضح اکثریت سے جیتا اور اس نے جمہوریت کی روح یعنی "اکثریت کی آمریت" کا کریہہ چہرہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہودی اقلیت پر جس وقت پوری جرمن قوم اپنے جمہوری قائد ہٹلر کی سربراہی میں بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھی تو اس وقت ہٹلر کے اس ظلم کا دفاع کرنے والی ایک واضح اکثریت اس قوم میں موجود تھی جو چیخ چیخ کر کہتی تھی اس یہودی اقلیت کو نیست و نابود کر دو۔ اکثریت کی آمریت کا یہ روپ دنیا کی ہر جمہوریت میں نظر آتا ہے۔ امریکہ میں پولیس کے ہاتھوں سیاہ فام افراد کی ہلاکت اور اس پر سیاسی قیادتوں اور میڈیا کی المناک خاموشی کیا اکیسویں صدی کا تازہ ترین المیہ نہیں ہے کہ دو سو کے قریب سیاہ فام امریکی اسی اکثریت کی آمریت میں پولیس کے تشدد کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور وہاں اس بات کا رونا بھی سیاہ فاموں کو خود ہی رونا پڑ رہا ہے۔ برطانیہ کی برٹش نیشنل پارٹی کے ہاتھوں اقلیتوں پر تشدد ہو یا بھارت کی بی جے پی کے ہاتھوں پورے ملک کے مسلمان اور عیسائی خوفزدہ ہوں، یہ سب اس جمہوری نظام کے تحائف ہیں جو دنیا کو مل رہے ہیں۔ پورے کا پورا نظام صرف ایک فقرے پر قائم ہے۔ "Majorityisauthority" یعنی "اکثریت ہی حق ہے"۔ اقلیت میں جو بھی چیخے، چلائے، شور مچائے اسے کہا جائے کہ جاؤ اپنی اکثریت ثابت کرو اور پھر جو چاہے کر لینا۔ ابھی تو ہم اکثریت میں ہیں اور ہماری ہی بات چلے گی۔ اس جمہوری تصورِ حکومت ہی کے خلاف سب سے توانا آواز علامہ اقبال کی تھی۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اس پورے نظام کی خرابی یہ ہے کہ اس میں جمہوری طور پر اکثریت سے جیتنے والے رہنما کا دفاع کرنے والے دیوانے اور فرزانے اس کے ہر ظلم کا دفاع دیدہ دلیری سے کرتے ہیں اور اس کی ہر زیادتی کے حق میں دلیلیں لے کر آتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جب بلوچستان میں اپنی ذاتی انا کی تسکین کے لیے عطاءاللہ مینگل کی مخالف حکومت ختم کر کے آرمی آپریشن شروع کرواتے ہیں، ہزاروں بلوچوں کا قتل عام کرتے ہیں، تو اس کا دفاع کرنے والے 1973 سے لے کر آج تک اسی جوش اور جذبے کے ساتھ ان کے ہر عمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے دور میں تیس کے قریب سیاسی رہنماؤں کا قتل ہو یا پاکستان میں پہلی دفعہ لاپتہ افراد کی رسم کا آغاز دلائی کیمپ کے ذریعے کیا جائے، پیپلز پارٹی کے جیالوں کے لیے یہ سب سراہنے کی باتیں ہیں۔ کسی بھی آمر یا ڈکٹیٹر کے ظلم کو صرف چند ہی دفاع کرنے والے میسر آتے ہیں اور وہ بھی اس کی زندگی تک یا اقتدار تک اس کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن جمہوری ڈکٹیٹروں یا "اکثریت کی آمریت" کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے والے رہنماؤں کا دفاع کرنے والے تو ہر دور میں میسر آتے ہیں اور وہ مسلسل اس طرح اس کا دفاع کرتے رہتے ہیں کہ انصاف کے تمام معیارات زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جو بھی فوجی آمر آیا اس نے اپنی ایک سیاسی جماعت بنائی تا کہ اس کا جمہوری طور پر دفاع کرنے والے بھی موجود رہیں۔ ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ بنائی، جس کا جنرل سیکرٹری ذوالفقار علی بھٹو تھا، ضیاالحق کی مسلم لیگ کو نواز شریف، اور جونیجو میسر آئے اور پرویز مشرف کی مسلم لیگ کو چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی۔ لیکن فوجی آمر اور سیاسی رہنماؤں کا یہ تعلق اقتدار کی چوکھٹ تک رہتا ہے جیسے ہی آمر گیا یہ اس کا نام تک نہیں لیتے۔ مگر جمہوری سیاسی نظام میں سیاسی پارٹیاں اپنے لیڈروں کی مدح سرائی میں اپنے رہنماؤں کے ظلم اور بربریت کی مسلسل اور مستقل وکالت کرتی رہتی ہیں یہاں تک کہ اس کی موت کے بعد بھی۔

یہ ہے وہ تمام پس منظر جس میں ماڈل ٹاؤن میں مرنے والے افراد ہوں یا فیصل آباد میں سنسناتی گولیوں کا نشانہ بننے والا حق نواز۔ آج اس ان مظالم کی دلیل دینے والے بھی موجود ہیں اور اپنے رہنماؤں کو پاک صاف اور معصوم ثابت کرنے والے بھی۔ یہ صرف اسی جمہوری نظام کا ہی خاصہ ہے کہ تعصبات کو اس سطح پر لے جایا جاتا ہے کہ کراچی میں سیاست دانوں کے مداحین کو بخوبی علم ہوتا ہے کہ ہمارے لیڈروں کے اشارے پر افراد قتل کرتے ہیں، تشدد کرتے ہیں، اغوا برائے تاوان میں شریک ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ انہی کا دفاع کرتے ہیں، انہی سے محبت کرتے ہیں، انہی پر جان نچھاور کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ یہی حال باقی تمام ملک اور صوبوں کا بھی ہے۔ کوئی سیاسی پارٹی کا کارکن کبھی بھی اپنے لیڈر کو اس لیے چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہوا کہ اس کے لیڈر نے اپنے مخالفین کو قتل کروایا تھا۔ ان پر مقدمے بنائے اور ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ کارکن سب جانتا ہوتا ہے لیکن اسے محلے، گلی، شہر، اخبار یا ٹیلی ویژن پروگرام میں جہاں کہیں بھی موقع مل جائے اپنے لیڈر کا دفاع کرتا ہے، اس کی کرپشن، بددیانتی، مخالفین پر ظلم و تشدد سب کے باوجود بس یہی کہتا ہے میری جان بھی اپنے لیڈر پر نثار ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اللہ کی ناراضی

پچاس دن کے محاصرے کے بعد دس فروری 1258ء کو ہلاکو بغداد میں داخل ہوا۔ دارالخلافہ گروہوں میں اس قدر تقسیم ہو گیا تھا کہ کسی ایک نکتے پر بھی لوگوں کا اتفاق ناممکن تھا۔ شیعہ اور سنی دو گروہ تو ایسے تھے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے قتل و غارت کی ہر حد گزر چکے تھے۔ اعتزال کے بانی واصل بن عطا نے دین کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی جو روایت ڈالی تھی' وہ معتزلہ کی صورت میں قد آور درخت بن چکی تھی۔ دوسری جانب خارجی تھے جنہوں نے گناہ کبیرہ تو بڑی بات' معمولی گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی جان و مال کو مباح' ان کے اموال کو مالِ غنیمت اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں قرار دے رکھا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے' جو اس دورِ پُرفتن میں ایمان کی حفاظت کے لئے ترکِ دنیا کر چکے تھے۔ مسلمان ہلاکو سے پہلے' چنگیز خان کی جارحیت بھی دیکھ چکے تھے۔ لیکن تاتاریوں کا عذاب ان کی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہا۔ تاہم کچھ ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ انہوں نے اپنی خرابیوں اور فرقہ بندیوں کا علاج ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ امام غزالیؒ اور مولانا رومؒ اسی دور کی پیداوار تھے۔ لیکن زوال پوری رفتار سے جاری رہا۔ نہ فرقہ بندی میں کمی ہوئی نہ گروہ بندی رکی۔ قوموں کی تقسیم جب اس سطح پر پہنچ جائے تو پھر کوئی بھی بیرونی خطرہ یا جارحیت انہیں متحد نہیں کر سکتا۔ یہی حال بغداد کا تھا۔ ہلاکو نے دسمبر کے مہینے میں محاصرہ شروع کیا تو چند ہی دنوں بعد شہر کے اکثر لوگ اُس کی طاقت اور قوت سے خوفزدہ ہو کر ساز باز کرنے لگے۔ عباسی خلیفہ کا وزیر ابن علقمی ہلاکو کی فتح کے بعد علوی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے خلیفہ کے دل میں ہلاکو کی طاقت کا خوف اسی طرح بٹھایا' جیسے آج کے دور میں امریکہ کی قوت کا خوف دلا کر غیرت و حمیت کا گلا گھونٹنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ خلیفہ صلح کے لیے تحفے تحائف لے کر ہلاکو کے پاس پہنچا۔ ہلاکو نے اس کے خاندان کے افراد کو قتل کرا دیا۔ خلیفہ کا خون مقدس جانتے ہوئے اُسے قالین میں لپیٹ کر روندا گیا تاکہ اُس کا خون زمین پر نہ گرے۔ اس کے بعد کے دن' بغداد پر قیامت کے دن تھے۔ تہذیب و ثقافت اور علم و عرفان کا مرکز قتل و غارت کا میدان بن گیا۔ تمام وزراء قتل کر دیئے گئے لیکن ابن علقمی کو چھوڑ دیا گیا۔ بغداد کے شہریوں کا قتل عام شروع ہوا۔ اپنے زمانے کی سب سے بڑی لائبریری کو آگ لگا دی گئی۔ بغداد کو خون میں نہلانے کے بعد اُس نے فاتحین کے اسی قاعدے پر عمل کیا کہ جو افراد اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ کر فاتح کے گُن گانے لگیں' انہیں بدترین انجام سے دوچار کر دو۔ اُس نے بغداد کا حاکم ابنِ عمران کو مقرر کیا۔ ابن علقمی کو جس نے ہلاکو کی مدد کی تھی، اُس کا چپراسی مقرر کر دیا۔ عروس البلاد کی حسرتناک تباہی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن تاریخ نے ہلاکو کے ایک فقرے کو ابدی سچ کی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ ہلاکو جب بغداد میں قتل و غارت کرتے بازار سے گزر رہا تھا تو ایک عورت نے اُس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا ''میں بددعا دیتی ہوں کہ اللہ تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔'' ہلاکو مسکرایا اور بولا ''اللہ کا عذاب تو میں خود ہوں جو تم لوگوں پر نازل ہوا ہے۔'' بظاہر یہ الفاظ ہلاکو کی زبان سے نکلتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا تاریخی سچ ہیں۔ جب قومیں' گروہوں میں ایسے بٹ جائیں کہ ایک گروہ کو اپنے ظالم' ظالم محسوس نہ ہوں اور دوسرے گروہ کے مظلوم' مظلوم نہ لگیں، انصاف اور حق گروہ بندی کی آگ میں جلنے لگے، قومیں باہم یوں تقسیم ہوں کہ سچ اور جھوٹ کی تمیز ختم ہو جائے'' تو تاریخ شاہد ہے کہ پھر اللہ ان پر ''ہلاکو'' ہی مسلط کرتا ہے۔ روم سے لے کر فارس اور چین سے فرانس تک ہر قوم کے زوال کی کہانی اٹھا کر دیکھ لیں۔ حقیقت مختلف نہیں' روم جیسی عظیم سلطنت کو تو افریقہ کے بربروں نے روند ڈالا تھا۔

ہمارا آج کا حال بغداد سے مختلف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بھی گروہوں میں بٹے لوگ نسل، رنگ، زبان اور فرقے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قتل کو جائز سمجھنے لگے ہیں۔ آپس کی بحث کا یہ عالم ہے کہ سچ کو ڈھونڈنا ناممکن سی بات نظر آتی ہے۔ بغداد میں تو ایک ابن علقمی تھا۔ اس ملک میں ہر شہر اور قصبے میں ابنِ علقمیوں کی بھرمار ہے، جو اس خواہش پر زندہ ہیں کہ کوئی بڑی طاقت انہیں اقتدار پر قائم رکھے یا پھر انہیں اقتدار میں لے آئے۔ لیکن ہمارا حال بغداد سے زیادہ ابتر ہے۔ اس لیے کہ ہم زوال کے اس عالم میں ہیں جہاں بستیوں کی بستیاں اللہ کے غضب کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ ہم اُس دورِ فتن کی علامتوں کے عین مصداق ہیں جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لوگوں پر بہت سے سال ایسے آئیں گے جن میں دھوکا ہی دھوکا ہوگا۔ اُس وقت جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔ بددیانت کو امانت دار اور امانت دار کو بددیانت۔ رویبضہ قوم کی جانب سے نمائندگی کریں گے۔ سوال کیا گیا۔ رویبضہ سے کیا مراد ہے۔ فرمایا' وہ نااہل اور بے قیمت لوگ جو عوام کے اہم معاملات میں رائے زنی کریں'' (ابن ماجہ) ایک اور جگہ فرمایا۔ قیامت تب ہوگی۔ جب امانت اٹھ جائے گی۔ اعرابی نے سوال کیا، امانت اٹھ جانے کی صورت کیا ہوگی۔ فرمایا جب اختیارات نااہلوں کے سپرد ہو جائیں تو قیامت کا انتظار کرو (بخاری) کیا ہماری یہ حالت نہیں ہے۔ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ہم اُس دورِ فتن میں داخل نہیں ہو چکے' جب اس دنیا میں حق و باطل کا آخری معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ جس کے بارے میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی فتح کی پیشین گوئی کی ہے۔ لیکن کیا حق کی فتح اُس قوم کے ہاتھوں سے ہوگی جو بغداد کے اُس دور کی طرح آپس میں بٹی ہوئی ہوگی جب ہلاکو آیا تھا۔ ہم اس قدر تقسیم ہیں کہ حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا نکتہ تھا جس پر چودہ سو سال سے امت کا ہر گروہ متفق تھا۔ اسے اپنی آخرت کے لیے نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ سب کو اپنی پہچان بھول جایا کرتی تھی۔ لیکن ہمیں تو اس پر احتجاج کرتے ہوئے بھی اپنے اپنے جھنڈے لہرانے یاد تھے۔ اپنے اپنے مسلک کی ریلیاں' علیحدہ علیحدہ دنوں میں نکالنا یاد تھیں۔ اس کے گروہوں کو اپنی اپنی تعداد اور اپنے اپنے جلوسوں کی کثرت کا احساس ہوتا رہا۔ یہ وہ حیران کن قوم ہے جس کا ہر ایسا شخص جس کے اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوتے ہیں' دوسروں کو ظالم اور گردن زدنی قرار دیتا ہے۔ بغداد میں تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرتے مہینوں گزار دیتے تھے۔ مناظرہ بازی میں تقسیم تھے۔ لیکن یہاں تو بحث نام کی چڑیا کا کوئی تصور تک موجود نہیں۔ دشمن کی زبان فوراً بند کرانے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ یہاں مذہب، زبان، نسل اور علاقے کی بنیاد پر سینکڑوں لوگوں کا خون سڑکوں کو رنگین کر چکا ہے۔ کہنے کو یہ انتظامی مسئلہ ہے' لیکن دین کی تاریخ اس کی یکسر مختلف توجیہہ پیش کرتی ہے۔ مدینہ کے لوگ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں لینے کے لیے آئے تو انہوں نے ایک ہی وجہ بتائی کہ ہمارے درمیان قتل و خون ریزی بہت بڑھ چکی ہے۔ آپ ہمارے درمیان تشریف لے آئیں تاکہ اللہ ہمیں امن عطا کر دے۔ اور اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ ہم نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ طالبان سے لے کر ملالہ یوسف زئی تک کراچی سے لے کر بلوچستان تک سب جگہ تدبیروں کی باتیں ہوتی ہیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ ہم قابو پا لیں گے، ہم کچل دیں گے، ہم امن قائم کر لیں گے۔ بستیوں پر عذاب کی علامت یہ ہوتی ہے کہ کوئی اُس قادرِ مطلق سے رجوع نہیں کرتا جو دلوں کو جوڑتا ہے، جو خوف میں امن دیتا ہے۔ جب بستیوں کی بستیاں اپنے زورِ بازو پر اعتبار کرنے لگ جائیں اور اللہ سے مدد کی طالب نہ ہوں تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت حالت یہ ہوگی کہ مومن اپنے بھائیوں کے لیے دعا کرے گا اور قبول نہیں کی جائے گی۔ اللہ فرمائیں گے' تو اپنے لیے دعا کر میں قبول کر لوں گا۔ لیکن عام لوگوں کے حق میں دعا نہ کر، کہ انہوں نے مجھے ناراض کر لیا ہے (کتاب الرقائق) کیا اس مملکتِ خداداد میں ہمارے نیک لوگوں کی دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ وہ تو اللہ سے امن و عافیت کی بھیگ مانگتے تھک چکے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم غضب الٰہی سے بچ جائیں۔ ہماری دعائیں قبول ہونے لگیں' تو پھر ہمیں اُس طرح بننا پڑے گا کہ جس طرح وہ لوگ تھے' جن کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں بار پاتی تھیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

آل پاکستان نفاذِ اردو کانفرنس

مسلمانوں کے برصغیر میں آنے سے قبل پورا خطہ صدیوں سے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا جس پر مختلف راجے حکومت کیا کرتے تھے۔ پٹنہ کے قریب پاٹلی پتر میں موریہ خاندان کی حکومت کی مختصر تاریخ ہے جس میں اردگرد کی ریاستوں کو فتح کر کے ایک مرکزیت قائم کرنے کا پتہ ملتا ہے۔ پورے جزیرہ نماء ہند پر اسی موریہ خاندان کے اشوک نے کسی حد تک ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ یہ مرکزیت بھی کل نگہ کی جنگ کے بعد وجود میں آئی جس میں اس نے دس لاکھ لوگوں کو قتل کیا اور تخت پر قابض ہونے کے لیے اپنے نوے کے قریب بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس تمام ظلم کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا، مہینوں چین سے نہ سویا، ہندو مت ترک کیا، بدھ ہو گیا اور مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مبنی ایک منصف معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اپنی تمام افواج کو ختم کر دیا۔ شہروں میں مہامیر مقرر کئے، جو انسان ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ساتھ زیادتی پر بھی سزائیں دیتے۔ دیکھتے دیکھتے پورا ہندوستان بغیر کسی جنگ لڑے اس کا مطیع ہو گیا۔ لیکن وہ کئی لاکھ فوجی جنہیں اس نے بے روزگار کر دیا تھا، ایک دن اس کی قائم کردہ موریہ سلطنت کے خاتمے کا باعث بن گئے۔ اس کے بعد ہندوستان پھر ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد متھرا میں گپتا خاندان کی شمالی ہندوستان میں تھوڑی سی مرکزیت نظر آتی ہے۔ پورا ہندوستان نہ اپنی زبان کی وجہ سے ایک تھا اور نہ ہی رسم و رواج کے ناتے۔ البتہ ایک چیز تھی، ہندومت جس نے ان تمام ریاستوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھا۔ امرناتھ یاترا کشمیر میں ہے تو گنگا کا مقدس مقام بنارس میں۔ شیو کے آنسو کٹاس اور پوشکر میں گرتے ہیں تو مہاشیوراتری انہی جگہوں پر منائی جاتی ہے۔ اجنتا اور ایلورا کے غار جنوب میں ہیں تو برہما کا سب سے بڑا مندر سومنات کے نزدیک ہے۔ غرض ہندومت کی عبادت گاہوں اور مقدس مقامات کا ایک جال پورے ہندوستان میں بچھا ہوا ہے، جس کی وجہ سے صدیوں ہندوستان ایک اکائی رہا۔ سنسکرت مقدس مذہبی زبان تھی اور اس میں علم کا ایک خزانہ بھی موجود تھا۔ مسلمانوں نے جب دنیا بھر کے علوم کے تراجم شروع کئے تو سب سے پہلے ہند سے کتابیں لا کر ترجمہ کی گئیں۔ لیکن بنگال، دکن، بہار، اڑیسہ، پنجاب، کشمیر اور دیگر علاقوں کے لوگ جب آپس میں ملتے، خواہ وہ تجارت کی غرض سے یا پھر ہردوار اور کنبھ کے مقدس میلوں پر تو آہستہ آہستہ ان کے درمیان ایک زبان نے جنم لینا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے پنڈتوں اور علم کی دنیا پر قابض برہمنوں نے اسے سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کہنا شروع کیا۔ لیکن عام آدمی کیا کرتا۔ اس نے تو تجارت کرنا تھی، میل ملاپ رکھنا تھا۔ اس نے شاستر تھوڑا پڑھنے تھے کہ خالص تحسین سنسکرت جانتا۔ اس نے خود ہی ایک زبان ایجاد کر لی جو شروع شروع میں پراکرت کہلاتی رہی۔ مسلمان فاتح آئے تو برصغیر کے ایک وسیع حصے میں مرکزیت آ گئی۔ دہلی سلطنت کا صدر مقام بن گیا اور بادشاہوں کی وجہ سے فارسی دفتر اور عدالت کی زبان ہو گئی۔ التمش نے جب آج سے آٹھ سو سال قبل قاضی عدالتیں قائم کیں تو قوانین کی عربی کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ غوری، خلجی، لودھی خاندانوں سے شیر شاہ سوری اور پھر مغلیہ خاندان کے چکا چوند کر دینے والے دورِ حکومت تک دفاتر اور عدالتوں کی زبان فارسی رہی، یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پچاس سالہ دور میں بھی دفتری اور عدالتی زبان فارسی ہی رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان حکمرانوں نے برصغیر کے ہر گاؤں میں اتالیق مقرر کر رکھے تھے، جو ہر بچے کو فارسی اور حساب پڑھاتے اور مسلمان کو قرآن اور ہندو کو وید کی تعلیم دیتے۔ یوں برصغیر میں انگریز کی آمد تک شرحِ خواندگی نوے فیصد تک تھا۔ مگر اس فارسی کے پہلو بہ پہلو وہ زبان جو کئی سو سال پہلے پراکرتوں کی صورت میں رابطہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی پوری قوت سے پروان چڑھتی گئی۔ مسلمانوں کی حکومت کی وجہ سے اس زبان میں عربی، فارسی اور ترکی کے بیش بہا الفاظ شامل ہو گئے۔ وہ تمام اصناف جو ہندوستان کے لیے اجنبی تھیں، یہاں لکھی جانے لگیں، جیسے غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ، داستان، ناول اور افسانہ۔ غرض ایک ہزار سال پہلے امیر خسرو نے جس زبان میں گیت لکھے تھے اس لئے کہ وہی دراصل اس پورے خطے میں بولی اور سمجھی جاتی، یہ اُردو اب ایک ایسی زبان بن کر ابھر چکی تھی جس کا دامن میر تقی میر سے لے کر غالب تک جیسے شعراء، میر امن اور رجب علی بیگ سرور جیسے نثر نگار، انیس، دبیر جیسے مرثیہ نویس اور دیگر اصناف میں لکھنے والوں سے مالا مال تھا۔ فارسی دفتری زبان تھی۔ لیکن محبت کرنے، گیت گانے اور کہانی سنانے کی زبان اُردو ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انگریز برصغیر پر حکمران ہوا تو اس نے دفتری زبان تو انگریزی کر دی لیکن ہر دفتر میں ورنیکلر کے نام پر ایک شعبہ کھولا جس میں اُردو میں دفتری کام کیا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کہ جنہوں نے توبۃ النصوح، مراۃ العروس اور بنات النعش جیسے ناول تحریر کئے تھے، انہیں بلایا گیا اور ان سے تمام انگریزی قوانین کا ترجمہ کروایا گیا۔ یوں ضابطہ فوجداری، ضابطہ دیوانی اور تعزیرات ہند عام آدمی کی سہولت کے لیے وجود میں آ گئے۔ عرضی نویسوں، وثیقہ نویسوں اور اہلمدوں کی ایک کھیپ تھی جو اُردو میں عدالتی کام سرانجام دیتی تاکہ لوگوں کو انصاف فراہم کرنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن سرکاری ملازمتیں انگریزی بولنے والوں تک محدود کر دی گئیں۔ انگریز نے مسلمانوں کا اتالیق کا سسٹم ختم کر دیا۔ چند سرکاری سکول کھولے گئے۔ یوں برصغیر میں شرحِ خواندگی نوے فیصد سے گر کر پندرہ فیصد تک آ گئی۔ تعلیم کے اس دوغلے نظام نے ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو انگریزی میں تعلیم یافتہ تھا۔ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا تھا اور وہی اسی کی تہذیبی اساس تھی۔ سول سروس، فوجی اور نواب، خان وڈیرے جنہیں انگریز اپنی سرپرستی میں قائم کالجوں میں تعلیم دلواتا، اس طبقے میں شامل تھے۔ یہ مٹھی بھر لوگ اس برصغیر کی تقدیر کے مالک بن بیٹھے اور انہوں نے یہ تصور مضبوط کر دیا کہ ترقی صرف اور صرف انگریزی زبان میں علم حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ یہ انسانی تاریخ کے پانچ ہزار سالہ تجربے کے برعکس تصور تھا۔ انسان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کر کے ترقی کی ہو۔ انگریزی دونوں ملکوں کے آزاد ہونے کے بعد بھی دفتری اور قانونی زبان کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم بھی بنا دی گئی۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے اقتدار پر وہ لوگ قابض ہو گئے تھے جنہیں انگریز اقتدار اور انگریز تہذیب کی لوریاں دے کر پالا گیا تھا۔ دونوں ملکوں میں انگریزی کو تہذیب و ترقی کی علامت بتایا گیا اور اُردو سرکاری اور نجی سرپرستی، دونوں سے محروم ہو گئی۔ لیکن اس زبان نے جو لوگوں کے درمیان واحد رابطے اور تعلق کا ذریعہ تھا وہ کمال دکھایا کہ دونوں کا تمام میڈیا اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گیا۔ پاکستان میں تو دو انگریزی چینل چلے لیکن بری طرح ناکام ہو گئے۔ فلم، ریڈیو، اخبار سب جگہ جہاں گفتگو ذریعہ اظہار تھی اُردو پروان چڑھتی رہی۔ چاہے امیتابھ بچن اس میں لاکھ سنسکرت کے الفاظ ڈال کر ہندی بنائے کوئی دوسرا ایسی ہندی بولنے کو تیار نہیں ہوتا۔

لیکن اقتدار پر قابض انگریز صفت مرعوب کالوں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے دونوں ملکوں کو جہالت کے اندھیروں میں غرق کر دیا۔ بھارت میں ہر سال 22 کروڑ بچے پاٹھ شالا یعنی سکولوں میں داخل ہوتے ہیں اور صرف چالیس لاکھ گریجویٹ بنتے ہیں۔ آج ساٹھ سال بعد بھارت کے تعلیمی نظام کے سربراہ سوچ رہے ہیں، کہ اگر انگریزی ان پر تھوپی نہ جاتی تو پورا بھارت خواندہ ہوتا۔ عدالتی نظام میں انگریزی کی وجہ سے ایک کروڑ مقدمات زیرِ التوا ہیں اس لئے کہ عام آدمی وکیل کے بغیر عدالت تک رسائی ہی نہیں رکھ پاتا ہمارا حال بھارت سے بھی بدتر ہے۔ دنیا میں پاکستان کے علاوہ تین اور ملک ایسے ہیں جو انگریزی کے جال میں پھنسے اور آج پچھتاتے ہوئے واپس قومی زبانوں کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ان کی پوری قوم بحیثیت مجموعی تخلیقی صلاحیت سے محروم ہو کر نقالچی بن گئی ہے۔ ایک سنگاپور، دوسرا بھارت اور تیسرا سری لنکا۔ ہم وہ چوتھا ملک ہیں جو اس جہالت کے راستے پر رواں دواں ہے۔ ہم وہ بدنصیب ہیں جن کا آئین ہمیں قومی زبان میں تعلیم دینے کا پابند کرتا ہے، لیکن ہم پر مسلط سول سروس اور اشرافیہ کا انگریزی دان طبقہ یہ ہونے نہیں دیتا۔ اس سلسلے میں 28 مارچ صبح دس بجے آرٹس کونسل راولپنڈی میں آل پاکستان نفاذ اُردو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اللہ ہمیں جہالت کے اندھیروں سے نکلنے اور اس قوم کو بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

KitaabPoint.blogspot.com

عصرِ رواں کے ابوجہل

ذرائع ابلاغ جھوٹ کو اپنا شعار بنالیں اور قومیں ان پر یقین کرنے لگیں تو پھر ان کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ میرے ملک کے چند ذرائع ابلاغ پر کچھ ایسے لوگوں کا غلبہ ہے جو اس بات کو سچ ثابت کرنے میں دلی خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤاجداد جاہل، ناخواندہ، بدتہذیب، ظالم اور گنوار تھے۔ یوں تو اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی اکثریت چند نسل پہلے ہندو، سکھ، بدھ یا جین مذہب سے تعلق رکھتی تھی لیکن ان دانشوروں کا غصہ صرف اور صرف مسلمان اور خصوصاً مسلمان حکمرانوں پر نکلتا ہے۔ اس غصے کا بدترین نشانہ اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ وہ تمام مغل بادشاہوں میں پرہیزگار، متقی اور منصف مزاج تھا۔ ان ''اعلیٰ ظرف'' دانشوروں کی حالت' اس امیر بیٹے جیسی ہے جو شہر میں آکر آباد ہو جائے۔ اگر اُس کا باپ دیہاتی لباس' میلی سی پگڑی اور بوسیدہ جوتی پہنے اُس کے گھر آجائے تو اُسے کہیں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو اعلان کر دیتا ہے کہ یہ ہمارے گاؤں سے کوئی ملازم ہے۔ چند دن کے لیے یہاں آیا ہے۔

چند ہفتوں سے اس ملک کے ایک بڑے ٹیلی ویژن چینل پر تعلیم کے نام پر تاریخی جھوٹ پر مبنی ایک اشتہار چلایا جا رہا ہے۔ اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب یورپ میں یونیورسٹیاں کھل رہی تھیں تو مغل بادشاہ تاج محل اور شالامار باغ بنا رہے تھے۔ تاریخ کی گواہی بعد میں پیش کروں گا۔ پہلے بنیادی عقل کا ایک درس پیش کر دوں۔ اس ٹیلی ویژن چینل میں اگر کوئی معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی بیٹھا ہوتا تو اُسے یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہ آتی کہ مغلیہ دور کی شاندار عمارات' جس عظیم تخلیقی صلاحیت سے تعمیر کی گئیں' وہ دو چیزوں کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ پہلی فن تعمیر کی تفصیلی مہارت جس میں جیومیٹری، فزکس، کیمسٹری اور ڈھانچے کے خدوخال وضع کرنے تک کے علوم شامل ہوتے ہیں۔ دوسری کسی ملک کی مضبوط معاشی اور اقتصادی حالت۔ اس قدر مضبوط کہ وہاں کے حکمران شاندار عمارات تعمیر کرنے کا خرچ برداشت کر سکیں۔ فن تعمیر کی جو تفصیل تاج محل، شیش محل، شالامار باغ، مقبرہ ہمایوں، دیوان خاص وغیرہ میں نظر آتی ہے، اس سے لگتا ہے کہ ان کے معمار جیومیٹری کے علم کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے تھے۔ تاج محل کے چاروں مینار صرف آدھا انچ باہر کی جانب جھکائے گئے تاکہ زلزلے کی صورت گریں' تو گنبد تباہ نہ ہوں۔ مستری کے اینٹیں لگانے سے یہ سب ممکن نہیں۔ اس میں حساب کی باریکیاں شامل ہیں۔ پورا تاج محل نوے فٹ گہری بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اُس کے نیچے تیس فٹ ریت ڈالی گئی کہ اگر زلزلہ آئے تو پوری عمارت ریت میں گھوم سی جائے اور محفوظ رہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے حساب اور جیومیٹری کی باریک تفصیل درکار ہے۔ ٹائل موزیک فن ہے' جس میں چھوٹی چھوٹی رنگین ٹائلوں سے دیوار پر تصویریں بنائی جاتی اور دیوار کو منقش کیا جاتا ہے۔ یہ فن لاہور کے شاہی قلعے کی ایک کلومیٹر لمبی منقش دیوار اور مسجد وزیر خان میں نظر آتا ہے۔ ان میں جو رنگ استعمال ہوئے' انہیں بنانے کے لئے آپ کو موجودہ دور میں پڑھائی جانے والی کیمسٹری کا وسیع علم ہونا چاہیے۔ یہی حال فریسکو پینٹنگ کا ہے' جن کے رنگ چار سو سال گزرنے کے باوجود آج تک مدھم نہیں ہوئے۔ تمام مغل عمارتوں میں ٹیراکوٹا (مٹی کو پکانے کا فن) سے بنے زیر زمین پائپ ملتے ہیں۔ ان سے سیوریج اور پانی کی ترسیل کا کام لیا جاتا تھا۔ کئی صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہ صحیح حالت میں موجود ہیں۔ مغلیہ فنِ تعمیر کا مکمل علم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور موجودہ دور کے سائنسی پیمانوں پر ایک نصاب کی صورت تشکیل دیا جائے تو صرف ایک فنِ تعمیر کو مکمل طور پر سیکھنے کے لیے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں درکار ہوں گی۔ کیا یہ سب کچھ اس ہندوستان میں ہو سکتا تھا' جس میں جہالت کا دور دورہ ہو اور جس کے حکمرانوں کو علم سے نفرت ہو؟

میں یہاں صرف مغربی مصنفین کی گواہی پیش کروں گا۔ اس لیے کہ میرے ان ''عظیم'' صاحبان علم کو کسی مسلمان یا لوکل مصنف کی گواہی سے بھی بو آتی ہے۔ ول ڈیورانٹ مغربی دنیا کا مشہور ترین مورخ اور فلاسفر ہے۔ وہ اپنی کتاب (STORY OF CIVILIZATION) میں مغل ہندوستان کے بارے میں لکھتا ہے: ''ہر گاؤں میں ایک سکول ماسٹر ہوتا تھا' جسے حکومت تنخواہ دیتی تھی۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے صرف بنگال میں 80 ہزار سکول تھے۔ ہر چار سو افراد پر ایک سکول ہوتا تھا۔ ان سکولوں میں پانچ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ گرائمر، آرٹس اینڈ کرافٹس، طب، فلسفہ، منطق''۔ اُس نے اپنی ایک اور کتاب (A CASE FOR INDIA) میں لکھا کہ مغلوں کے زمانے میں صرف مدراس کے علاقے میں ایک لاکھ 25 ہزار ایسے ادارے تھے، جہاں طبی علم پڑھایا جاتا اور طبی سہولیات میسر تھیں۔ میجر ایم ڈی باسو نے برطانوی راج اور اُس سے قبل کے ہندوستان پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ وہ میکس مولر کے حوالے سے لکھتا ہے ''بنگال میں انگریزوں کے آنے سے قبل وہاں 80 ہزار مدرسے تھے۔'' اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک سیاح ہندوستان آیا' جس کا نام الیگزینڈر ہملٹن تھا۔ اس نے لکھا کہ صرف ٹھٹھہ شہر میں علوم وفنون سکھانے کے چار سو کالج تھے۔ میجر باسو نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہندوستان کے عام آدمی کی تعلیم یعنی فلسفہ، منطق اور سائنس کا علم انگلستان کے رئیسوں حتیٰ کہ بادشاہ اور ملکہ سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ جیمز گرانٹ کی رپورٹ یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس نے لکھا ''تعلیمی اداروں کے نام جائیدادیں وقف کرنے کا رواج دنیا بھر میں سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ 1857ء میں جب انگریز ہندوستان پر مکمل قابض ہوئے تو اُس وقت صرف روہیل کھنڈ کے چھوٹے سے ضلع میں' پانچ ہزار اساتذہ سرکاری خزانے سے تنخواہیں لیتے تھے۔'' مذکورہ تمام علاقے دہلی، لاہور یا آگرہ جیسے بڑے شہروں سے دور مضافات میں واقع تھے۔ انگریز اور ہندو مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کا عروج اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ اُس نے برصغیر کی تاریخ میں پہلی دفعہ مسلمان اور ہندو استاد کی تنخواہ برابر کر دی ورنہ اکبر جیسا ''سیکولر'' بھی ہندو اساتذہ کو کم تنخواہ دیتا تھا۔ اورنگزیب نے ہی پہلی دفعہ تمام مذاہب کے مقدس مذہبی مقامات کے ساتھ جائیدادیں وقف کیں۔ سرکار کی جانب سے وہاں کام کرنے والوں کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ اُس دور کے تین ہندو مورخ سجان رائے کھتری، بھیم سین اور ایشور داس بہت معروف ہیں۔ سجان رائے کھتری نے ''خلاصہ التواریخ''، بھیم سین نے ''نسخہ دلکشا'' اور ایشور داس نے ''فتوحات عالمگیری'' لکھی۔ یہ تینوں ہندو مصنفین متفق تھے کہ عالمگیر نے پہلی دفعہ ہندوستان میں طب کی تعلیم پر ایک مکمل نصاب بنوایا اور طب اکبر، مفرح القلوب، تعریف الامراض، مجربات اکبری اور طب نبوی جیسی کتابیں ترتیب دے کر کالجوں میں لگوائیں تاکہ اعلیٰ سطح پر صحت کی تعلیم دی جا سکے۔ یہ تمام کتب آج کے دور کے ایم بی بی ایس نصاب کے ہم پلہ ہیں۔ اورنگ زیب سے کئی سو سال پہلے فیروز شاہ نے دلی میں ہسپتال قائم کیا' جسے دارالشفا کہا جاتا تھا۔ عالمگیر ہی نے کالجوں میں پڑھانے کے لیے نصابی کتاب طبِ فیروز شاہی مرتب کرائی۔ اس کے دور میں صرف دلی میں سو سے زیادہ ہسپتال تھے۔

میں تاریخ سے ایسی ہزاروں گواہیاں پیش کر سکتا ہوں۔ ہو سکے تو لاہور کے انارکلی مقبرہ میں موجود 1911ء کی ہر ضلع کی مردم شماری رپورٹ ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کو ہر ضلع میں شرح خواندگی 80 فیصد سے زیادہ ملے گی جو اُس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ تھی۔ لیکن جب انگریز یہ ملک چھوڑ کر گیا تو یہی شرح دس فیصد تھی۔ بنگال 1757ء میں فتح کیا گیا۔ اگلے 34 برسوں میں مسلمانوں کے سبھی سکول اور کالج کھنڈر بنا دیئے گئے۔ پھر اس ملک کو تباہ کرنے کے لیے لارڈ کارنوالس نے 1781ء میں پہلا دینی مدرسہ کھولا۔ اس سے پہلے دینی اور دنیاوی مدرسے کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ ایک ہی مدرسے میں قرآن بھی پڑھایا جاتا تھا' سائنس اور فلسفہ بھی۔ یہ تاریخ کی گواہیاں ہیں۔ لیکن اشتہار بنانے والے جھوٹ کا کاروبار کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ ابوجہل کا نام عمرو بن ہشام تھا۔ وہ اس قدر ذہین اور پڑھا لکھا تھا کہ مکہ کے لوگ اُسے ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ کہتے تھے۔ لیکن میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ دانائی نہیں جہالت کا باپ ہے یعنی ابوجہل۔ آج کا دور بھی ابوجہلوں سے خالی نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ جنگ تو پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑی گئی تھی۔ایک جانب بھارتی افواج تھیں اوران کی تیار کردہ مکتی باہنی اور دوسری جانب پاکستان فوج اوران کے ساتھ لڑنے والے بنگالی جو اس مملکت خداداد پاکستان کی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔پورا ملک دو قسم کے دانشوروں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ایک وہ جو گزشتہ پچیس سالوں سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ کس طرف قومیتوں کے درمیان نفرت کو گہرا کیا جائے تا کہ وہ لوگ جو پنجابی، سندھی، بنگالی، بلوچ اور پٹھان نسلی امتیاز کو بھلا کر ایک کلمے پر متحد ہوئے تھے ایک دوسرے سے متنفر ہو جائیں۔یہ ایک جنگ تھی اور آج بھی جاری ہے۔اس جنگ میں آج بھی لوگ جانوں کا نذرانہ دے رہے ہیں اور اس مملکت خداداد پاکستان سے محبت کا حق ادا کر رہے ہیں۔اس ملک سے محبت کا قرض ایک اور جانثار پروفیسر غلام اعظم نے اپنی جان بنگلہ دیش کے عقوبت خانے میں جانِ آفرین کے سپرد کر کے ادا کر دیا۔تاریخ کا کیا عجب مذاق ہے کہ اس شہید پاکستان کی موت کا تمسخر بھی اڑایا جا رہا ہے۔وارث میر ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جو اس جنگ کے دوران ڈھاکہ گئے اور واپسی پر انہوں نے اکتوبر 1971ء میں اپنے سفرنامے پر مبنی کالم لکھنا شروع کئے۔میں یہاں اس سفرنامے کے چند اقتباسات درج کر رہا ہوں۔

”ایک طالب علم بولا ہمارے لیڈروں کا المیہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے مغربی پاکستان یا پنجاب کے عام مسلمانوں کا ذکر برائی کی علامت کے طور پر کیا، حالانکہ یہ برائی ملک کے دونوں حصوں کے عوام پر مسلط ہے“۔۔۔”یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ کم از کم تعلیمی اور رہائشی سہولتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں مشرقی پاکستان کے طلبہ کہیں آگے تھے بلکہ مغربی پاکستان کے طلبہ بجا طور پر شکوہ کر سکتے ہیں“۔۔۔”یہ بات عام سننے میں آئی کہ عوامی لیگ کی دہشت گردی میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ پیش پیش تھے اور فوج کی کارروائی کے دوران ایسے طلبہ کی اکثریت سرحد عبور کر چکی ہے اور انہی طلبہ کو چند روز تربیت دینے کے بعد بھارتی فوج پاکستان سرحدوں پر پھینک دیتی ہے“۔۔۔”اس ہال میں عوامی لیگ کے حامی طالب علموں نے اپنی ہی ہم جماعت غیر بنگالی لڑکیوں پر وہ ظلم و ستم ڈھائے ہیں کہ ان کا ذکر تو در کنار تصور کرتے ہی یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے“۔۔۔

”اساتذہ ہمارے منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا منصوبہ غیر بنگالیوں کی نسل کو ختم کرنا ہے اور آپ غیر بنگالی ہیں“۔۔۔

”مشرقی پاکستان کی نئی نسل کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں نیشنلسٹ مسلمان اساتذہ کے علاوہ ہندو اساتذہ نے جو کردار ادا کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں“۔ایک جگہ وارث میر نے پروفیسر گوبند چندر دیو کا ذکر کیا ہے جو اس نفرت کی فلسفیانہ اساس مہیا کرتا تھا۔”ان کی سرگرمیاں بہت ہی علمی اور پراسرار تھیں۔وہ دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی ”تعلیمی مصروفیت“ کے بہانے بھارت کا چکر ضرور لگاتے تھے“۔پاکستان کے دونوں حصوں میں غلط فہمیوں کو بڑھانے کی کوششوں کا سراغ لندن کے تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں 55ء اور 56ء کے سالوں کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔سندھ یونیورسٹی کے ایک استاد نے لندن کے ایک تعلیمی ادارے کو درخواست دی کہ وہ انہیں پاکستان میں بیٹھ کر ”ادائیگیوں کے توازن“ پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت دیں۔جواب آیا، اجازت ہے لیکن مقالہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی ادائیگیوں کے توازن پر لکھنا ہو گا۔اپریل 1971ء کے آغاز میں نیویارک کی سڑکوں پر بنگلہ دیش کی حمایت میں ایک جلوس نکالا گیا۔اس جلوس کے شرکاء میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔انہوں نے ایک بے تکلف یہودی دوست سے پوچھا:”ہمیں خفیہ طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ بنگلہ دیش تحریک کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دو۔““اندرا گاندھی کا فرمانا تھا کہ میری رائے میں مجیب الرحمٰن کی ہم سے زیادہ دوستی ہے“۔

چیف منسٹر بہار کا بیان تھا: نتائج کچھ بھی ہوں، میں بنگلہ دیش کے لیے اسلحہ فراہمی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا“۔۔۔

”اس وقت تو ہم تھرا گئے جب جلسے کے بعد ہمیں وہ سلاٹر ہاؤس دکھایا گیا جہاں غیر بنگالیوں کو ذبح کیا جاتا اور ایک بڑی میز پر لٹا کر ان کے جسم سے خون نچوڑ کر بڑے بڑے برتنوں میں جمع کیا جاتا۔““عوامی لیگ کی بغاوت کے بعد کپتائی ڈیم کے غیر ملکی انجینئروں کو قیامت صغریٰ کا سامنا کرنا پڑا۔اس علاقے میں آباد تمام خاندانوں کے مردوں کو ان کے اہل خانہ کے سامنے گولی سے اڑا دیا گیا اور عورتیں پاگلوں کی طرح گلی کوچوں میں چیختی چلاتی اور بھاگتی پھرتی تھیں۔محمد پور اور میر پور کے کیمپوں میں کٹے پھٹے جسموں والی عورتیں مکتی باہنی کے دہشت پسندوں کی غیر انسانی کارروائیوں کی دردناک کہانیاں سناتی تھیں۔“

وارث میر کا یہ آنکھوں دیکھا حال ہے جو ان دنوں کا ہے جب یہ جنگ مشرقی پاکستان کے کوچہ و بازار میں لڑی جا رہی تھی یہ وہی جنگ ہے جس کے جرائم کے ٹریبونل نے پروفیسر غلام اعظم کو پہلے موت کی سزا سنائی اور پھر ان کی ضعیف العمری کی وجہ سے اسے نوے سالہ قید میں بدل دیا۔شاید ہی کسی قوم نے اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو کہ جو پاکستان میں بسنے والے اٹھارہ کروڑ لوگوں نے ان شہیدوں کے ساتھ کیا ۔جو لوگ آج سوات، باجوڑ، اور شمالی وزیرستان کے آپریشن کے حق میں لکھ اور بول رہے ہیں، یہی لوگ بنگلہ دیش کے جنگلی جرائم کے ٹربیونل کے حق میں بھی دلائل دے رہے ہیں۔کل خدانخواستہ اگر ایسا ہی ٹربیونل ان آپریشنوں کے بارے میں قائم ہوا تو کیا ان کا قلم ایسی ہی گوہر افشانیاں کرے گا۔یقیناً کرے گا۔اس لیے کہ یہ اور ان کی قبیل کے دنیا بھر کے دانشوروں کو اس مملکت خداداد پاکستان سے ایک ضد ہے۔یہ ضد اور نفرت اس لیے ہے کہ یہ ان کے بتائے گئے اور بنائے گئے اصولوں کے خلاف رنگ، نسل اور زبان کے نظریے کی موت بن کر طلوع ہوا تھا۔

اس نظریے اور اس ملک سے محبت کے شہید پروفیسر غلام اعظم کو میں نے پاکستان ٹوٹنے سے پہلے کئی بار دیکھا اور سنا۔اپنی بنگالی طرز کی میٹھی اُردو میں ان کی گفتگو دلوں میں اتر جاتی تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے یہ نام نہاد دانشور یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کا غاصبانہ قبضہ ہے اور یہ لوگ بنگالیوں کے وسائل پر عیش کر رہے ہیں۔یہ وہ دور تھا جب دانشوروں نے بنگالیوں کے منہ میں ایک فقرہ ڈالا تھا کہ ”ہمیں اسلام آباد، لاہور اور کراچی کی سڑکوں سے پٹ سن کی خوشبو آتی ہے“ ایسے میں پروفیسر غلام اعظم جیسی چند آوازیں ہی تھیں جو ان نفرتوں کے ماحول میں محبتوں کی خوشبو بکھیرتی تھیں۔اس کے بعد کی کہانی خونچکاں بھی ہے اور دلگداز بھی۔تقریباً تیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد کوئٹہ میں میری ان سے لاتعداد ملاقاتیں رہیں۔وہ چند دن کیلئے وہاں آئے ہوئے تھے لیکن ان شخص کی شخصیت اور گفتگو کا سحر ایسا تھا کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔تحریکِ پاکستان کا یہ قافلہ سالار جس نے آسام کے ریفرنڈم میں حصہ لیا، پاکستان مسلم لیگ کے ہر اول دستوں میں شامل رہا، کس فخر سے بتا رہا تھا کہ جب ڈھاکہ کی سرزمین پر پاکستان نے بھارت سے کرکٹ میچ جیتا تو کسقدر جشن کا سماں تھا۔سٹیڈیم کے باہر لوگوں نے ستر بیل ذبح کئے تھے۔پاکستان سے یہ محبت آج بھی بنگلہ دیش میں رچی بسی ہے۔اسی لیے بیت المکرّم میں اس شہید پاکستان کا جنازہ تاریخی ہوا۔اس لیے کہ بنگلہ دیش کے ان دانشوروں کے جھوٹ کا خمیازہ اس طرح بری طرح بھگتا ہے کہ وہ 1971ء کے بعد بدترین حالات کا شکار ہوئے۔1971ء سے پہلے ایک بنگالی بھی بھارت نوکری کرنے نہیں گیا تھا، اسے اپنے ملک میں ہی روزگار میسر تھا۔آج نوے لاکھ بنگالی دربدر کی ٹھوکریں کھاتے بھارت میں غیر قانونی تارکین وطن ہیں۔1971ء سے پہلے ایک بنگالی عورت بھی دنیا کے بازاروں میں نہیں بکی تھی، آج دنیا بھر کے قابل اعتماد ادارے محتاط اندازے کے مطابق بتاتے ہیں کہ دس لاکھ بنگلہ دیشی عورتیں دنیا کے بازاروں میں بیچی گئیں۔ دانشوروں کے ”محروم“ مشرقی پاکستان میں اس کا تصور تک نہ تھا۔اس وقت بیس لاکھ کے قریب بنگلہ دیشی صرف پاکستان میں رزق کی تلاش میں نوکریاں کر رہے ہیں۔لیکن آج بھی یہ دانشور بنگلہ دیش کو جمہوریت اور ترقی کا ماڈل بنا کر پیش کرتے ہیں۔کوئی ان محروم بنگالیوں سے سوال نہیں کرتا جنہوں نے پاکستان سے علیحدگی کی اتنی بڑی سزا بھگتی ہے کہ آج ان کا ملک بھارت کی ایک محکوم کالونی ہے جس کی حیثیت کشمیر سے بھی بدتر ہے۔وہاں حکم چلتا ہے تو بھارت سرکار کا۔کیا یہ سزائیں، پھانسیاں اور جیلیں بنگلہ دیش کی حکومت خود دے رہی، وہ حکومتیں جو ان سیاسی رہنماؤں کے ساتھ سیاسی اتحاد کر کے الیکشن میں حصہ لیتی رہی ہیں۔یہ لوگ اس دھرتی کے بیٹے ہیں لیکن ان پر فرد جرم بھارت کی طرف سے عائد کی گئی ہے۔کیا یہ دانشور اس ملک پاکستان کے باقی صوبوں کو بھی ویسے ہی انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ان کی آج تک تصورِ پاکستان سے نفرت ختم ہی نہیں ہوتی۔انہیں ہر وہ شخص مجرم لگتا ہے جو پاکستان سے محبت کرتا ہے، مار کھاتا ہے، جان دیتا ہے اور ہر وہ شخص ہیرو ہے جو یہاں پر رہنے والوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوتا ہے۔لیکن پروفیسر غلام اعظم جیسے روشن چراغ عشاق کا وہ قافلہ ہیں جو آج 43 سال بعد بھی اپنی جان کا نذرانہ دے کر ثابت کرتے ہیں کہ ابھی محبت کی لو زندہ ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

بلوچستان: پورے سچ میں نجات ہے

میرا جی اپنی طرز اور اپنے خیالات کے اعتبار سے خوب شاعر تھے۔ زندگی متنازعہ رہی اور پُر زور بھی۔ آزاد نظم لکھی، بڑے عالمی شاعروں کے ترجمے کیے، لیکن گیت بلا کے لکھے۔ ایک سچے آدمی تھے، جو مانتے جانتے، زندگی بھر اُسی پر عمل کرتے رہے۔ میرا جی کی ایک نظم کی چند لائنیں میں بچپن سے بار بار دہراتا رہا ہوں۔ ان میں موجود کرب، دکھ اور المیہ میرے ملک کی تصویر ہے، یہ تصویر درست ہوتی ہے نہ میرا اس نظم کا دہرانا ختم ہوتا ہے۔ میرا جی نے لکھا تھا:

سچ تو اک پیڑ خمیدہ ہے
جو دروازے پہ تنہا
سوچتے سوچتے سو جاتا ہے
جانے کیا سوچ کے سو جاتا ہے

یہ لائنیں اس ملک میں سچ کی موت کا المیہ ہیں۔ لیکن یہاں ہر کوئی اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے۔ بلوچستان وہ سرزمین ہے جس کے بارے میں جو جانتا ہے وہ بھی پورا سچ نہیں بولتا۔ ہر کوئی ادھورا بولتا ہے۔ جو جتنا سن لیتا ہے اُسے بغیر تصدیق کے سچ سمجھ لیتا ہے۔ بلوچستان میں بسنے والے بلوچوں، براہویوں، پشتونوں اور پنجابیوں کا اپنا اپنا سچ ہے۔ بیورو کریسی اور فوج کا اپنا سچ ہے، صحافی کا اپنا سچ ہے۔ جو فوج کو نیچا دکھانا چاہتا ہے وہ ایک طرف کی داستان سچائی سے بیان کرتا ہے اور جو بلوچستان کے لوگوں کو قصوروار ٹھہرانا چاہتا ہے وہ چند کہانیوں کو پوری سچائی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی معلومات ان رپوٹوں پر مشتمل ہوتی ہیں جو ان کے خریدے ہوئے مخبروں کے ذریعے مرتب کی جاتی ہیں۔ وہ جس کو چاہیں غدار اور جس کو چاہیں محب وطن ثابت کردیں۔ جرنیل تک اُس پر یقین کر لیتے ہیں۔ تجزیہ نگاروں اور صحافیوں کا عالم یہ ہے کہ پریس کلب کی راہداریوں میں گھومنے والوں' مزاحمتی لیڈروں اور احتجاج کرنے والے ہجوم سے گفتگو کرنے کے بعد رپورٹ مرتب کرتے ہیں۔ ذہن میں ایک خاکہ بناتے ہیں کہ کسے نیچا دکھانا ہے اور پھر اُسی کو بیان کر دیتے ہیں۔ دانشوروں اور محققوں کا عالم بھی کمال کا ہے۔ امریکہ، روس، برطانیہ وغیرہ میں بلوچستان پر لکھی جانے والی کتابوں کا انبار جمع کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں کے مضامین کا ڈھیر لگاتے ہیں، ایک نقشے پر بلوچستان کے شہر اور قصبے ڈھونڈتے ہیں، چند تصویروں سے اندازہ لگاتے ہیں کہ بگٹی ایسے ہوتے ہیں، مری اس طرح کے نظر آتے ہیں، پشتون کا لباس یہ ہے اور پھر سگریٹ کے دھوئیں اور کافی کے گھونٹ پیتے ہوئے ''عظیم تحقیق'' سامنے لے آتے ہیں۔ ان دانشوروں میں چند سرکاری افسر بھی شامل ہوتے ہیں جو بلوچستان پر کتابیں لکھ کر اُس سچ کو حقیقت بنانے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں نوکری کے دوران خفیہ رپوٹوں، لیویز کے رسالداروں یا ان کی دعوتیں کرنے والے سرداروں نے انہیں بتایا ہوتا ہے۔ بلوچستان ادھورا سچ بولنے والوں کے ہاتھوں میں یرغمال ہے۔ بلوچستان کے بارے میں آج تک کسی نے پورا سچ بولنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اُس کی دو وجوہات ہیں: ایک وجہ لوگوں کا ذاتی تعصب ہے۔ یہ تعصب فوجیوں صحافیوں، سیاستدانوں اور بلوچستان کے رہنے والے رہنماؤں سب میں ہے۔ دوسری وجہ بلوچستان کے مخصوص قبائلی حالات اور صدیوں پر پھیلی ہوئی قبائلی دشمنیاں ہیں۔ کوئی بلوچ سردار یا رہنما کھل کر کسی دہشت گرد، فراری کیمپ والے یا اغوا کار کا نام نہیں لیتا۔ اُسے پتہ ہے کہ سیاست کا بازار تو چند دن گرم رہے گا' لیکن اگر اس نے براہ راست کسی ایسے شخص کا نام لے لیا تو اُس کی اولادیں بھی قبائلی دشمنی کو بھگتیں گی۔

بلوچستان کے بارے میں اگر آج پورا سچ نہ بولا گیا تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ نقصان صرف اس مملکت خداداد کا نہیں بلکہ سب کا ہوگا۔ ظلم یہ ہے کہ جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ یہ ملک اللہ کے نام پر بنا انہوں نے بھی بلوچوں کے ساتھ انصاف نہ کیا اور جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک غیر فطری ملک ہے انہوں نے بھی بلوچوں کو قتل وغارت اور خون کے سوا کچھ نہ دیا۔ پنجاب اور سندھ کے وہ تمام دانشور جو 73ء میں سرخ انقلاب کا پھریرا لہراتے بلوچستان والوں کے شانہ بشانہ لڑنے گئے تھے آج ڈالروں میں کھیل رہے ہیں اور بلوچ اُسی طرح خون میں لت پت ہیں۔

اس مظلوم قوم کے درمیان میں نے ایک عمر گذاری ہے، ان کے عام آدمی کے ہمراہ پہاڑوں، ریگستانوں اور نخلستانوں میں سفر کیا ہے۔ بجلی، گیس پانی اور سیوریج کی آسائشوں سے محروم دیہاتوں میں راتیں گذاری ہیں۔ ان کے شاعروں، ادیبوں، موسیقاروں کے ساتھ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کئی سال محفلوں میں شرکت کی ہے۔ پندرہ سال بلوچ اور پشتون معاشرے پر ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ پچیس سال وہاں گذارنے۔ ان کے سرد و گرم رویوں میں سانس لینے، پانچ سال یونیورسٹی میں پڑھانے اور بیس سال سرکاری نوکری کے تجربے کے آئینے میں جب میں بلوچستان کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُس کی حالت بزکشی کے اُس بکرے کی طرح لگتی ہے جو اس قدیم کھیل میں میدان میں پڑا ہوتا ہے۔ گھڑ سوار اُسے اپنی جانب کھینچنے کے چکر میں اُس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔

بلوچ بے چارہ اس خطے میں کئی جگہ تقسیم ہے۔ اس کی حالت ہر جگہ اجنبی کی سی ہے۔ عوام کو تقسیم کیوں کیا گیا، اور کس نے کیا؟ یہ تاریخ کا وہ سب سے ہولناک سچ ہے جسے آج کوئی بیان نہیں کرتا۔ سچ یہ ہے کہ جنگ عظیم اوّل کے بعد جب مسلم امّہ کو تقسیم کیا جا رہا تھا اور اُس کے چھوٹے چھوٹے حصے کیے جا رہے تھے' تین قومیں تقریباً سو فیصد مسلمان تھیں اور ان میں اسلام کا جذبہ اور سچائی اپنے آباؤ اجداد کی طرح روشن تھی۔ انہیں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ پھر ایک نہ ہو جائیں۔ یہ تین قومیں تھیں پشتون، کرد اور بلوچ۔ ان تینوں قوموں پر مسلسل ایسے حالات مسلط کیے گئے کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔ کبھی جانبر ہونے لگیں تو انہیں خون میں لت پت کر دیا گیا۔ بلوچ جتنے بلوچستان میں ہیں' اتنے ہی ایران میں ہیں۔ ایران کے بلوچ اس قدر پسماندگی، کسمپرسی اور ذلت کی زندگی گزارتے ہیں کہ پاکستان میں رہنے والوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ نہ وہاں سرکاری نوکری میں نظر آتے ہیں نہ سیاسی قیادت ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں تک کہ بلوچ ایک عام کونسلر بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق جمعہ اور عید کی نماز ادا نہیں کر سکتے۔ جو حقوق کی بات کرتا ہے' اوّل تو منافقین میں شمار کر دیا جاتا ہے یا پھر امریکی ایجنٹ۔ چند دن کا مقدمہ اور سرعام کرین پر لاش جھولتی نظر آتی ہے۔ بلوچوں کی کچھ تعداد افغانستان میں ہے۔ وہاں پشتونوں کے ساتھ بس ''گزارا'' کرتے ہیں۔ لفظ ''گزارا کرنا'' بلوچ اور پشتون معاشرے کی ایک ضرب المثل ہے جس کا مطلب ہے جو میسر ہے اُسے مجبوری سے سہنا۔ پاکستان میں رہنے والے بلوچوں کو انگریز نے پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں تقسیم کر دیا۔ پنجاب اور سندھ کے بلوچ' اپنے آپ کو بلوچ کہلوانا تو پسند کرتے ہیں لیکن بلوچستان کے بلوچوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انگریز نے ان کے لیے طاقت اور عزت کے مرکز اور بنا دیے ہیں۔ ان کی نظر پیچھے مڑ کر بلوچستان میں رہنے والے بلوچ بھائیوں کی جانب اٹھتی تک نہیں۔ وہ لاہور، کراچی اور اسلام آباد کے حسین خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

بلوچستان نے، جہاں بلوچ بھی ہیں اور پشتون بھی، براہوی بھی ہیں اور چند ہزار پنجابی بھی' اپنی موجودہ سرحدوں کے ساتھ انگریزی عہد میں وجود پایا۔ اس سے پہلے خان آف قلات کی ریاست ہوتی تھی اور اُس سے ملحقہ افغان علاقے۔ یہ علاقہ دو سو سال عالمی طاقتوں کی افواج کے درمیان ایک خلا یا بفر زون کے طور پر رکھا گیا۔ اس کی حیثیت ایک سرحدی اہمیت کے علاقے اور دفاعی حصار سے بڑھ کر متعین نہیں کی گئی۔ ایسے علاقوں کو استعماری قوتیں نہ ترقی دیا کرتی ہیں اور نہ انہیں ترقی کرنے کی آزادی دی جاتی ہے۔ انہیں وہاں وفادار چاہیے ہوتے ہیں، شہری نہیں۔ بلوچستان کی ساری تاریخ، عالمی، مقامی اور علاقائی طاقتوں کی رسہ کشی کی تاریخ ہے۔ وفادار بنانے، وفادار خریدنے اور وفادار کرنے کی تاریخ۔

KitaabPoint.blogspot.com

بلوچستان: پورے سچ میں نجات ہے......(2)

اس ملک کی ایک عجیب بدقسمتی ہے کہ یہاں کے دانشور' ادیب' صحافی' سیاسی کارکن یہاں تک کہ ایک دوسرے میں گتھم گتھا جرائم پیشہ گروہ' اپنے بونوں کا قد بلند کرنے کے لئے انہیں تاریخ کی عظیم شخصیات سے ایسی تشبیہ دیتے کہ لوگ ان شخصیات کے بارے میں بھی شک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے نسل پرست گوروں کی حکومت کے خلاف زندگی بھر جدوجہد کرنے والا' تشدد' بے گھری اور طویل ترین جیل کاٹنے والا نیلسن منڈیلا ان مظلوموں میں سرفہرست ہے۔ آپ کرپشن' بددیانتی اور چوری کے مقدمات میں جیل کاٹیں' مخصوص حالات میں خاموشی سے پرتعیش رہائش گاہوں میں دبئی' انگلینڈ یا امریکہ میں جلاوطنی اختیار کریں لیکن آپ کے مداح یوں گفتگو کرتے ہیں کہ نیلسن منڈیلا بھی آپ کے پاؤں کی دھول نظر آتا ہے۔ نفرت کا کاروبار کرنا ہو تو جس کو چاہو یزید یا فرعون کا لقب دے دو۔ اس کے لئے وردی میں ہونا ضروری نہیں' بس بولنے والے کے دماغ میں جذبات کی آگ کا الاؤ روشن ہونا چاہئے۔ سیدنا امام حسینؓ کی شخصیت' ان کی زندگی کی عبادت و ریاضت' ان کی سیدالانبیاء ﷺ کی گود میں تربیت' ان کی پارسائی اور زہد سب بالائے طاق رکھ کر آپ بدترین کردار والے بڑھک باز شخص کو بھی وقت کا حسین کہہ دیں' لوگ تالیوں کی گونج میں اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مجاہد اور شہید تو دو ایسے لفظ ہیں جن کی اس مملکت خداداد پاکستان میں وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مجاہدین اور شہدا بھی عالمِ ارواح میں بیٹھے حیرت سے سوچتے ہوں گے کہ کیا یہ وہی درجات ہیں جن کے لئے اللہ قرآن میں قسمیں کھاتا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی سردار جب اپنی قبائلی دشمنی میں اپنے ساتھ بندوق بردار جتھے لے کر گھومتے ہیں تو وہ ان اسلحہ برداروں کو مجاہد کہتے ہیں۔ اسی قبائلی خونریزی میں مارے جانے والے کو شہید کہا جاتا ہے۔ اسی طرح پورے پاکستان میں منشیات کے اڈہ چلانے پر لڑائی ہو جائے یا زمین کے قبضے پر دو گروہ لڑیں' مرنے والے کا رتبہ شہادت سے کم نہیں ہوتا۔ ہجرت اور جلاوطنی بھی اس ملک میں ایک تمسخر ہے۔ عام آدمی جن ملکوں میں جانے کے لئے زمین بیچتا ہے' ریکروٹنگ ایجنٹ کی منتیں کرتا ہے' بڑے بڑے کنٹینروں میں بند ہو کر جاتا ہے' چھوٹی چھوٹی لانچوں پر سمندری لہروں کا مقابلہ کر کے منزل پاتا ہے' ان ملکوں میں سالوں چھپ کر مزدوری کرتا ہے' وہاں یہ "عالی مرتبت لیڈرز" عالیشان محلات میں رہتے ہیں' آسائش کی ہر چیز انہیں میسر ہوتی ہے۔ ان کی اولادیں وہاں اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں علم حاصل کرتی ہیں' وہاں ایسا کاروبار جماتی ہیں کہ اس ملک کے رہنے والے بھی دنگ رہ جائیں۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی یہ جلاوطن ہیں' ہجرت نصیب ہیں' خانماں برباد ہیں۔ وطن کی اس مٹی سے دور ہیں کہ اگر یہ وطن میں ہوتے اور ان کے منہ پر دھول پڑ جاتی تو الرجی کے خطرے سے طرح طرح کے لوشن استعمال کرتے' مختلف قسم کی الرجی روکنے والی دوائیاں کھاتے۔

ظالموں اور مظلوموں کی ایک لمبی فہرست ہمارے ملک کے دانشوروں نے بنا رکھی ہے اور وہ اس میں روز بروز اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ اس میں جتنے بھی نام شامل ہیں سب کے سب مظلومیت میں حسینؓ سے کم درجے کے نہیں اور ظالموں میں ہر کوئی یزید سے بڑھ کر ہے۔ مظلوم کا ہر گناہ ان دانشوروں نے ایسے معاف کر دیا ہے' جیسے یہ میدانِ حشر میں اللہ کی کرسی پر بیٹھے فیصلہ صادر کر رہے ہوں۔ اسی لہجے کا سلوک ظالموں کے ساتھ بھی ہے۔ مجیب اور یحییٰ' بھٹو اور ضیاء الحق' نواز شریف اور مشرف' یہ ہیں انسانوں کے دیوتا اور فرعون۔ جبکہ ایک قوم ان تمام دانشوروں' سیاسی کارکنوں' تجزیہ نگاروں کی نظر میں مستقل فرعون یا یزید کا درجہ رکھتی ہے اور وہ ہے پنجابی۔ پاکستان کی تاریخ میں ہر معرکے کا ایک نیا حسین اور ایک نئی مظلوم قوم سامنے آتی رہی لیکن فرعون کی نشست پر مستقل اسی قوم کو بٹھایا گیا۔ گزشتہ ساٹھ سالوں میں پنجابی اس "عظیم" مرتبے پر فائز رہا۔

بلوچستان کی صورتِ حال کا پہلا سچ یہ ہے کہ 1971ء میں صوبہ بننے کے بعد سے لے کر آج تک کوئی سیاسی' قبائلی یا سماجی پلیٹ فارم ایسا نہیں تھا' جس میں اپنی تمام محرومیوں کا ذمہ دار پنجابی کو نہ ٹھہرایا گیا ہو۔ اس وقت سے لے کر آج تک دیواروں کی وال چاکنگ دیکھ لیں' آپ کو پنجابی استعمار کا نام ہر دور میں دیواروں پر لکھا نظر آئے گا۔ ایف سی جس میں کوٹے کے اعتبار سے مختلف قبیلوں سے پشتونوں کو بھرتی کیا جاتا ہے' جس میں پنجابی بہت کم ہوتے ہیں' یہ وہی فورس ہے جس سے بلوچستان کے لوگوں کو سب سے زیادہ شکایت ہے لیکن اس شکایت کا غصہ پشتون پر نہیں پنجابی پر نکلتا رہا ہے۔ جس سانحۂ مشرقی پاکستان کا ذکر میرے ملک کا دانشور بڑے زور و شور سے کرتا ہے اور کہتا ہے ہم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ وہاں مجیب الرحمٰن سے لے کر عام ورکر تک کسی نے پنجابی کو برا نہیں کہا تھا۔ بلکہ وہ نسبتاً سچ بولتے تھے' فوج کا نام لیتے تھے۔ بیوروکریسی کی بات کرتے تھے اور پھر مغربی پاکستان کی ترقی کو اپنی پسماندگی کی وجہ اور وسائل کی لوٹ مار قرار دیتے تھے۔ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ اب اس ملک کو نسل و رنگ اور زبان پر لڑانے کے لئے کسی ایک قوم کو فرعون بنانا ضروری تھا۔ اس لئے گالی کا رُخ پنجابی کی جانب موڑ دیا گیا۔ بلوچستان کی سیاست کا یہ سچ اتنا کڑوا ہے کہ اس کی تلخی وہاں کام کرنے والا پنجابی نائی' دھوبی' موچی' مستری اور خاکروب ہی جانتا ہے' جو گزشتہ چند سالوں میں سب سے زیادہ انتقام کا نشانہ بنا۔ جس کی آواز کسی میڈیا ہاؤس میں نہ سنی گئی۔ اس کے قتل کو مدتوں جائز بنایا گیا۔ بلکہ بلوچستان کی تاریخ کا یہ بھی کڑوا سچ ہے کہ جس بھی گروہ سے انتقام لینا ہو پہلے اسے پنجابیوں سے نتھی کرو اور پھر قتل کردو' جلاوطن کردو۔ تمہارے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ بلوچوں سے کئی سو سال پہلے آباد پارسی 90ء کی دہائی میں اغوا ہونا شروع ہوئے پھر بلوچستان چھوڑ گئے۔ صدیوں سے وہاں رہنے والے ہندو پہلے اغوا ہوئے' تاوان دیتے رہے اور پھر اسی قوم پرست ظلم سے تنگ آ کر بھارت کے شہر اندور میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ سب کے سب نہ اسٹیبلشمنٹ کا حصہ تھے اور نہ ہی پنجابی لیکن نفرت اور تعصب ان لوگوں کو اپنے آبائی وطن سے بہت دور لے گیا۔ (جاری ہے)

KitaabPoint.blogspot.com

بلوچستان: پورے سچ میں نجات ہے……(آخری قسط)

بلوچستان کی جاری مزاحمتی تحریک کو صرف بلوچستان میں رہنے والا ہی سمجھ سکتا ہے‘ جسے وہاں کی قبائلی روایت اور اس معاشرے کی دوستی و دشمنی کی حدود کا مکمل ادراک ہو۔ کتابوں، رسالوں، دانش وروں کے تجزیوں اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں ادھورا سچ بولا جا رہا ہے۔ بیوروکریسی کی فائلوں اور خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹوں میں آپ کو نامکمل حقائق ملیں گے۔ بلوچ رہنما اپنی مزاحمتی تحریک کو مقدس اور محترم سمجھتے ہیں۔ قبائلی معاشرے کی روایات انہیں مزاحمتی تحریک کے دوران ریاستی اداروں کا ساتھ دینے والے سرداروں، وڈیروں اور عام بلوچوں کا نام لینے کی اجازت نہیں دیتیں کہ پھر قبائلی دشمنی کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن نجی محفلوں میں، حال احوال میں اور کسی کے زخموں کو کریدنے پر لاوے کی طرح پھٹ پڑتے ہیں۔ دوسری جانب اس ملک کی اسٹیبلشمنٹ ہے جس کے نزدیک بلوچستان قطعہ ارضی ہے، جو اِن کی ریاست کی حدود میں واقع ہے۔ ویسا ہی نقشہ جو فوج کی بند کمروں میں ہونے والی فوجی منصوبہ بندیوں کے دوران‘ درمیان میں رکھا ہوتا ہے اور اُس کے پہاڑ، نالے، ریگستان وغیرہ کو فوج کی پیش بندی سے محفوظ بنایا جاتا ہے۔ اگر اس کو محفوظ بنانے کے دوران کوئی عوامی ردعمل ہو تو اُسے کچل دینا اپنا فرض سمجھا جاتا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی معاشرے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کو اس عوامی ردِعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے ناراض لوگ بھی وہیں سے مل جاتے ہیں۔ الحاق پاکستان کے زمانے میں جب ریاست قلات کے ساتھ قائداعظم کے مذاکرات ہو رہے تھے تو خان آف قلات سے قبائلی دشمنی رکھنے والے جام آف لسبیلہ، مکران کے نواب اور خاران کے نواب نے اپنی ریاستوں کا الحاق پاکستان سے کر دیا۔ خان آف قلات ایک چھوٹے سے علاقے ساراوان اور جھالاوان تک محدود ہو کر رہ گئے۔ یہاں اسٹیبلشمنٹ کا وہ رویہ سامنے آتا ہے کہ جب کسی کے اتحادی ساتھ چھوڑ دیں تو اُس کیسے مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ ان کی رگ وپے میں انگریز نے داخل کیا ہے۔ معاہدہ کرنے کے باوجود اپنی اندرونی سازشیں جاری رکھنا۔ رابرٹ سنڈیمن جب اپنی فارورڈ پالیسی کے تحت خان آف قلات سے معاہدے میں تھا تو اس نے خان کے دربار میں موجود تقریباً تمام سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور خان کے ساتھ صرف تین سردار باقی رہ گئے تھے۔ اس روّیے کا بلوچستان میں عمومی ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ ناراض رہنما یا سردار افغانستان چلے جاتے ہیں۔ نواب خیر بخش مری کے والد، نواب اکبر بگٹی کے بڑے بھائی اور دیگر نے ایسا ہی کیا۔ الحاق پاکستان کے خلاف خان آف قلات کے بھائی شہزادہ عبدالکریم نے بھی ماضی کی روایت کے مطابق ساتھیوں سمیت افغانستان جانا بہتر سمجھا۔ انگریز اگر ضمانتوں پر واپس لاتا تھا تو وہ اُن ضمانتوں کا تھوڑا بہت احترام کرتا اور بظاہر سزا نہ دیتا۔ شاید پاکستان کے حکمرانوں میں یہ ظرف نہیں تھا۔ شہزادہ عبدالکریم اور ان کے ساتھیوں کو ضمانت پر بلایا گیا لیکن بغاوت کے الزام پر سزائیں دے دی گئیں۔ مزاحمت کی یہ تحریک بہت محدود سی تھی، مگر نفرت کی ایک بنیاد رکھ گئی۔ دوسری مزاحمتی تحریک ون یونٹ کے قیام کے بعد شروع ہوئی۔ آرمی ایکشن سکندر مرزا کے حکم پر 6۔ اکتوبر 1958ء کو ہوا اور 7۔ اکتوبر کو پورے ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ نواب نوروز خان زہری قبیلے کے نواب تھے جو اس مزاحمت کی سربراہی کر رہے تھے۔ یہاں بھی اسٹیبلشمنٹ کو اسی قبیلے کے ناراض اور سردار بننے کے خواہش مند دودا خان زرکزئی کا ساتھ مل گیا جو قرآن کا واسطہ دے کر نواب نوروز خان کو پہاڑوں سے نیچے لے آیا، لیکن حکومت میں اتنا ظرف کہاں تھا کہ وہ اس معاہدے کا احترام کرتی یا ضمانت پر عمل کرتی۔ اسے تو بلوچ روایات سے بھی دور کا واسطہ نہ تھا۔ نواب نوروز خان اور ان کے سات ساتھیوں پر مقدمہ چلا، پھانسی کی سزائیں ہوئیں۔ نواب نوروز کو بڑھاپے کی وجہ سے عمر قید کی سزا دی گئی اور وہ جیل میں ہی چل بسے۔ اس دوران آرمی ایکشن کی سربراہی جنرل ٹکا خان بحیثیت کرنل کر رہے تھے۔ اس مزاحمتی تحریک کا دائرہ بھی محدود تھا لیکن یہ کل کے آنے والے واقعات کے لیے نفرت کی ایک اور بنیاد بن گیا۔

بلوچستان کی تاریخ کا کڑوا اور تلخ ترین سچ یہ ہے کہ پورے بلوچستان کو خون میں نہلانے اور چپے چپے کو لاشوں کا تحفہ بخشنے کا آغاز قائد عوام، فخر ایشیا جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی انا، آمرانہ سوچ، اپنے مخالف کو برداشت نہ کرنے کی خو اور طاقت سے دبانے کی پالیسی کی وجہ سے ہوا۔ انہیں اپنی مخالف نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت برداشت نہ تھی۔ انہیں اُس وقت تک برداشت کیا گیا جب تک آئین منظور نہ ہوا۔ پھر اس منتخب حکومت کو غداری اور ملک دشمنی کے الزامات پر برطرف کر دیا گیا۔ وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل اُس وقت کوئٹہ کے میزان چوک میں جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ذوالفقار علی بھٹو کے احکامات نشر کر رہے تھے۔ ایسے میں قبائلی ناراضگی پھر کام آئی اور نواب اکبر بگٹی‘ بھٹو کی اس بلوچ دشمنی میں اُس کے ساتھی بن گئے۔ کرنل ٹکا خان اب فوج کا سربراہ تھا۔ یہ چار سالہ فوجی آپریشن اسقدر خون آشام تھا کہ فوج کے 80 ہزار جوان وہاں جھونکے گئے۔ پانچ ہزار تین سو بلوچ اور تین ہزار تین سو فوجی جوان اپنی جان سے گئے۔ حیدر آباد جیل میں بلوچ اور پشتون لیڈروں پر غداری کا مقدمہ چلا۔ شاعر انقلاب حبیب جالب پر غداری کا واحد مقدمہ بھی اسی عوامی دور میں قائم ہوا۔ وہ آگ جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بلوچستان کے چپے چپے پر بھڑک رہی تھی جنرل ضیاالحق کی عام معافی اور چھ ہزار بلوچوں کو جیل سے رہا کرنے کے بعد ایک دم سرد پڑ گئی۔ اس کے بعد کا دور رنجشوں اور محرومیوں کا دور تو ہے لیکن بلوچستان کے عام شہری سے سوال کریں تو وہ بتائے گا کہ یہ گیس اسی دور میں آئی، بجلی کا گرڈ اسٹیشن اس زمانے میں لگا۔ کراچی کوئٹہ شاہراہ پر سفر اسی دور میں ممکن ہوا اور ترقی کی راہیں کھلیں۔ اس دور کے ثمرات لنگڑی لولی جمہوریت میں دس سال تک پھلتے پھولتے رہے۔ لیکن اس سارے امن کو تباہ و برباد جنرل پرویز مشرف کی آمرانہ سوچ، طاقت سے دبانے کے روّیے اور ذاتی انا نے کیا۔ ساٹھ سال سے سلگتی آگ جسے ذوالفقار علی بھٹو کے اقدامات نے ہوا دی، جو دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح موجود تھی، اُسے پرویز مشرف کے دور نے آتش فشاں کے لاوے میں تبدیل کر دیا۔ اسٹیبلشمنٹ نے کتابوں میں جو دیکھا تھا اسی پر عمل کیا، یعنی ناراض قبائلیوں کو ساتھ ملاؤ اور مزاحمت کرنے والوں کے خلاف استعمال کرو۔ ان کے نزدیک ہر کوئی دشمن ہے اور ہر علاقہ غیر محفوظ۔ پرویز مشرف کے دور میں جس لعنت نے اس پاکستان کا راستہ دیکھا وہ "لاپتہ افراد" تھے۔ یہ لاپتہ افراد اس ملک کے ہر خطے سے اٹھائے گئے۔ لیکن بلوچستان میں ان کی شدت اس لیے زیادہ ہے کہ پہلے دن سے اس کی قیادت نے بندوق اٹھا کر احتجاج کرنے کی سیاست کو اختیار کیا۔ افغانستان میں حالات موافق ہوں تو بلوچستان میں مزاحمت کامیاب ہو جاتی ہے۔ بصورت دیگر واپسی اور خاموشی۔ اس سیاست نے وہاں چھوٹے چھوٹے مزاحمتی گروہ پیدا کر دیئے ہیں کہ اب بلوچستان کی قیادت بھی امن اور صلح کی بات کرتے ڈرتی ہے کہ وہ خود نشانہ بن سکتی ہے۔ جیسے فرقہ وارانہ مذہبی جماعتیں اب صلح کا نام نہیں لیتی کہ ان کے کارکن ان کے لیے خود خطرہ ہیں۔ ہر کسی نے نسلی، مذہبی اور علاقائی بنیادوں پر ایسے گروہ بنا رکھے ہیں کہ وہ خود ان سے خوفزدہ ہیں۔ اس سارے سچ کا حاصل یہ ہے کہ جو دانشور فوج کو نیچا دکھانا چاہتا ہے وہ بھٹو کا ذکر تک نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ بھی نہیں بتائے گا کہ بلوچوں کے قاتل ٹکا خان کو پنجاب کا گورنر کس نے بنایا اور کیا پیغام دیا۔ جسے ضیاالحق سے نفرت ہے وہ اُس کے دور کو کلاشنکوف کا دور کہہ کر بات ختم کر دیتا ہے لیکن اُسے بلوچستان کا امن نظر نہیں آتا۔ جسے اسٹیبلشمنٹ کی نفرت دکھانی ہو، بے وفائیاں یاد کرانی ہوں اُسے وہ ضمانت یاد نہیں آتی جب نواب خیر بخش مری کو اسلم رئیسانی کی قیادت میں افغانستان کے جہنم سے پاک فوج کے سی ون تھرٹی طیارے میں لایا گیا تھا اور ائرپورٹ پر بپھرے ہجوم نے پاکستان کے جھنڈے کو ہی آگ لگا دی تھی۔ جو فوج کا حمایتی ہے اسے پرویز مشرف کے دور میں نواب اکبر بگٹی کے قتل کے بعد بلوچ قبائلی دشمنیوں کا فائدہ اٹھانا‘ وہاں کے لوگوں کو منظم کر کے ایک دوسرے سے لڑانا یاد نہیں رہتا۔ بلوچستان اس وقت ایک بدترین قبائلی جنگ میں الجھ چکا ہے۔ جس کے پاس چار بندوقیں ہیں وہ گوریلا لیڈر ہے۔ کوئی پاکستان کے حق میں اور کوئی خلاف۔۔۔۔ سچ بولو، پورا سچ بولو، ورنہ کچھ باقی نہیں رہے گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

باؤلا

"زیورخ کی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس جنت نما شہر کی وجہ شہرت سودی بینکاری نظام ہے۔ ہمارے مذہبی دانشوروں کی منطق کی رو سے تو اب تک اس شہر کا دیوالیہ نکل جانا چاہیے تھا مگر یہ شہر دنیا کے بہترین شہروں میں شمار ہوتا ہے" یہ الفاظ ایک معروف کالم نگار کے ہیں جو اپنی زیورخ یاترا کے بعد علم کی ایک نئی دنیا سے آگاہ ہو کر آئے ہیں۔ اگر لفظ "سودی" استعمال نہ ہوتا تو پھر بھی میرے لیے گنجائش تھی کہ میں حسن ظن سے کام لیتا کہ شاید موصوف کو بینکاری کے خون چوسنے والے نظام سے عشق ہے۔ لیکن سود کا دفاع اور اس قدر واضح اور کھل کر...... اس امت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال ایسی موجود ہو۔ موصوف کی یہ سطور پڑھ رہا تھا تو مجھے سود کی حمایت کرنے والوں کے بارے میں قرآن پاک میں اللہ نے جو کیفیات بتائی ہیں' یاد آ رہی تھیں۔ اللہ فرماتا ہے "مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں' ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا (پاگل) کر دیا ہو' اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "تجارت بھی تو آخر سود جیسی چیز ہے"۔ کس قدر سچا ہے میرا رب جو ایسے دانشوروں کی ذہنی کیفیت اور دلوں میں چھپے اسلام کے نظام کے ساتھ بغض و عناد کو جانتا ہے۔ کتنی صادق آتی ہے یہ آیت ان سطور پر جو موصوف نے اپنے کالم میں تحریر کی ہیں۔

چلیں چھوڑیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو کہ ان میں حکمت وہ لوگ تلاش کرتے ہیں جن کی آنکھیں مغرب کی روشنی سے چندھیا نہ گئی ہوں۔ ان کے آئیڈیل اور قابل تعریف سوئزر لینڈ اور زیورچ کے سودی بینکاری نظام کی اصل بنیاد کیا ہے۔ وہ کونسی لوٹ مار ہے جس پر اس کی عمارت تعمیر ہے اور آج بھی اس نے دنیا بھر کے مظلوم' مقہور اور مجبور انسانوں کی دولت کو لوٹنے والوں کو اپنا محسن قرار دیا ہے اور اس لوٹی ہوئی دولت سے لٹیروں اور ڈاکوؤں کا ایک شہر آباد کیا ہے۔ ایک ایسا شہر جو دنیا بھر کے ظالموں' چوروں' اچکوں' اٹھائی گیروں اور کرپٹ انسانوں کی دولت پر پلتا ہے۔ اس شہر کے لوگ ان بینکوں میں ان لٹیروں کی دولت کا حساب رکھتے ہیں' تحفظ کرتے ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں' عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ زیورچ اور سوئس بینکوں کی یہ روایت تین سو سال پرانی ہے۔ فرانس کے بادشاہوں کو اپنے عوام سے لوٹی ہوئی دولت کو چھپانے کی ضرورت تھی اس لئے 1713ء میں The Great Council of Geneva نے رازداری کا قانون "of Seerecy Code" متعارف کرایا جس کے تحت بینکار کھاتے کی رقم صرف کھاتے دار کو بتاتا ہے کسی دوسرے کو اس کی اطلاع نہیں دیتا۔ اس کے بعد انقلاب فرانس آیا تو وہ سب سیاستدان' وڈیرے' نواب جنھوں نے عوام کا سرمایہ لوٹا تھا بھاگ کر یہاں آ گئے اور اس لوٹی ہوئی دولت سے ان بینکوں کے کاروبار کا آغاز ہوا۔ یہ لوگ اسقدر ظالم ہیں کہ جس وقت 1930ء کا عالمی معاشی بحران آیا' دنیا کی حکومتیں اپنے لوٹے ہوئے پیسے کے بارے میں معلومات چاہتی تھیں تا کہ جو پیسہ عوام سے لوٹا گیا ہے ان کو واپس لوٹایا جا سکے تو سوئزر لینڈ نے Banking Act 1934 منظور کیا اور دنیا کے غریبوں کو ان چوروں' لٹیروں' اور ڈاکوؤں کے نام اور ان کا سرمایہ بتانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جب جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا تو اس وقت تک سوئزر لینڈ ایسے تمام لوگوں کے لئے ایک "محفوظ جنت" سمجھی جانے لگی تھی جو اپنے ملکوں کا سرمایہ لوٹ کر وہاں لے جائیں۔ اسے اس زمانے میں "Repository of capital for unstable countries" (غیر مستحکم ملکوں کے سرمایے کی جنت) کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں یہودیوں پر ظلم و ستم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہولو کاسٹ تھا' ان کا قتل عام ہو رہا تھا۔ یہودیوں نے اپنی حکومتوں کے خوف سے اپنا سرمایہ اور سونا ان سوئس بنکوں میں جمع کروانا شروع کیا۔ سونا ان رقوم میں صرف چار ارب ڈالر کا تھا۔ ان ظالم بینکاروں نے مرنے والے یا قید ہونے والے یہودیوں کے کاغذات کو آہستہ آہستہ جلانا شروع کر دیا۔ دوسری جانب سوئزر لینڈ وہ واحد ملک تھا جس نے نازی ظلم سے بھاگنے والے یہودیوں پر اپنی سرحدیں بند کر دیں۔ جرمن یہودیوں کے پاسپورٹوں پر "ل" کا لفظ لکھتے تھے اور اس پاسپورٹ کو دیکھ کر سوئزر لینڈ کی سرحد سے انہیں واپس دھکیل دیا جاتا تھا تا کہ یہ دولت واپس نہ مانگ لیں۔ جرمن آرکائیوز کے مطابق 1944 میں جرمن وزیر داخلہ ہینرچ ہملر Heinrich Himler نے سونے اور زیورات سے لدی ہوئی ایک ٹرین سوئزر لینڈ کے بنکوں کو بھجوائی تا کہ ناگہانی کیفیت میں جنگ میں اسلحہ کی خریداری کے لئے کام آ سکے۔ جنگ ختم ہوئی اور 1946 میں پیرس معاہدہ Paris Agreement وجود میں آیا جس کی وجہ سے اس سونے پر ان بنکوں اور عالمی اتحادی طاقتوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ ان بنکوں کو ملا۔ یہودی اپنی طاقت اور بالادستی کے باوجود ان سود خور بنکوں سے اپنی دولت نہ لے سکے۔ بددیانتی کے اس کاروبار نے سوئزر لینڈ اور موصوف کالم نگار کی جنت زیورچ کو سرمایہ فراہم کیا۔

آج بھی سوئزر لینڈ کے بنکوں میں 80 فیصد رقوم تین ذرائع سے آتی ہیں۔ 1- دوسرے ملک سے ٹیکس چوری کا پیسہ جن میں یورپ اور امریکہ جیسے ممالک بھی شامل ہیں' 2- غیر ترقی یافتہ ممالک کے آمروں اور حکمرانوں کا کرپشن اور لوٹ مار کا سرمایہ اور 3- دنیا کے بڑے بڑے مافیاز کے جرائم سے حاصل کردہ سرمایہ۔ یہ ہیں وہ تین بنیادی ذرائع جو اس "جنت نظیر" علاقے کی آمدن اور ترقی کی بنیاد ہیں۔ یہ ہے سوئزر لینڈ کا بزنس ماڈل۔ چند سال پہلے تک ٹیکس چوری سوئزر لینڈ میں جرم نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جرمن محکمہ Deutschepost کے سربراہ Klaus Zumwinkle کے بارے میں جرمن حکام نے کرپشن کی تحقیقات کا آغاز کیا تو سوئزر لینڈ نے کسی بھی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا۔ ان بنکوں کا سوئزر لینڈ کی سیاست پر اسقدر اثر ہے کہ اس ملک کے سیاستدان بینکاری کے غلیظ دھندے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ یورپی یونین کا حصہ بننے سے انکار کرتے رہے۔ دنیا کا ہر چور' بددیانت' قاتل' ڈاکو' ظالم حکمران اپنے سرمائے کے تحفظ کے لئے ان بنکوں کو پناہ گاہ سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ فرانس کے سوشلسٹ وزیر خزانہ Jerome cahuzac کا بھی یہاں ایک خفیہ اکاؤنٹ ہے۔ فلپائن کا مارکوس' چلی کا آلندے' ایران کا رضا شاہ' پاکستان کا زرداری اور افریقہ کے آمروں کی لوٹی ہوئی رقوم ان بینکوں کے کاروبار کو مستحکم کرتی ہیں۔ اس سارے سرمائے کا بدترین اور انسانیت دشمن استعمال یہ ہے کہ یہ سب کے سب بنک اس وقت دنیا بھر میں خوراک کی تجارت اور ذخیرہ اندوزی پر سرمایہ لگاتے ہیں۔ ملکوں سے خوراک خریدتے ہیں اور پھر ان کا ذخیرہ کر کے مہنگے داموں پر لوگوں کو بیچتے ہیں' جس کے نتیجے میں اس وقت دنیا میں ایک ارب مرد' عورتیں اور بچے قحط اور بھوک کا شکار ہیں۔ یہ قاتل اور انسانیت دشمن بنک اپنے سرمائے سے کھاتے داروں کو سود ادا کرتے ہیں اور سوئزر لینڈ کے عوام کو شاندار سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ پورا معاشرہ ڈاکوؤں' چوروں' آمروں' ڈکٹیٹروں اور انسانیت دشمن افراد کا ملازم ہے۔ ان کی فی کس آمدنی دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور کیوں نہ ہو ڈاکوؤں' چوروں اور پیشہ ور قاتلوں کے کارندے سرمائے میں نہاتے ہیں۔ یہ ہے وہ جنت جس کی تعریف مذکورہ کالم نگار نے کی ہے۔ لیکن میرے اللہ نے ایسے افراد کی کیفیت کے بارے میں کیا خوب ارشاد فرمایا تھا جو ان شہروں میں چند دن گزار کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے "دنیا کے شہروں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کا خوشحالی سے چلنا پھرنا تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ تو تھوڑا سا لطف اور مزہ ہے جو یہ لوگ اڑا رہے ہیں پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بدترین جائے قرار ہے (آل عمران 197)۔ کون ہے جو شہروں کی چہل پہل سے متاثر ہو کر بدترین جائے قرار کو منتخب کر لے۔

KitaabPoint.blogspot.com

بوسیدہ ملبوس اتارنے کے دن

دنیا میں زندہ قومیں آئین کی غلام نہیں ہوتیں بلکہ آئین ان کی خواہشات، امنگوں اور آرزوؤں کا غلام ہوتا ہے۔ ان کی امنگیں اور آرزوئیں بدلتی ہیں تو وہ اس میثاق کی کتاب کو بھی بدل دیتے ہیں۔ایسی قوموں کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ ان کے ملک کی سیاسی قیادت مفادات کی گروی ہے اور عوام پر مخصوص طبقات کی حکمرانی ہی اس دستاویز کا مقصد ہے تو پھر وہ ایسے نمائندوں سے آئین تحریر کرنے کا حق بھی چھین لیتے ہیں۔ یہ سب ایک خواب نہیں ہے، بلکہ دنیا کے ایک مہذب ترین ملک نے اسے حقیقت بنا کر دکھایا ہے۔ یہ ملک ایسا نہیں جہاں کوئی خونی انقلاب آیا ہو۔ یہ کسی فوجی آمر کے برسرِ اقتدار آنے کی کہانی بھی نہیں، بلکہ یہ تو سودی نظامِ بینکاری میں جکڑے ہوئے ایک جمہوری ملک آئس لینڈ کی صرف پانچ سال پرانی داستان ہے۔ایک ایسا قصہ جسے فرسودہ جمہوریت اور کارپوریٹ سودی نظام میں جکڑی انتخابی سیاست کا غلام میڈیا بیان نہیں کرتا۔

یہ تو چند سال پہلے کی بات ہے جب 2008 میں دنیا بھر میں سودی بینکاری نظام اپنے فراڈ اور جھوٹی کاغذی کرنسی کی وجہ سے ڈوبنے لگا تو امریکہ سے لے کر یورپ کے ہر بڑے معاشی ہیڈ کوارٹر پر دھرنے اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ بینکوں نے اپنی ساکھ اور عمارت بچانے کے لیے سود کی شرح صفر کے قریب کر لی۔ لیکن آئس لینڈ ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنگامے اور دھرنے اس قدر زور پکڑے کہ منتخب حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پوری قوم کو ایک عوامی پارلیمنٹ تصور کرتے ہوئے ایسے تیس (30) غیر سیاسی لوگوں کو منتخب کیا گیا جو ملک میں علم اور تجربے کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ ان تیس افراد کو کہا گیا کہ تم ہمارے ملک کا ایک نیا آئین تحریر کرو جو ان تمام غلاظتوں اور جتھ بندیوں سے پاک ہو۔ ایسی خرابیاں جو کارپوریٹ سرمائے سے پیدا ہوتی ہیں۔ کسی بھی جمہوری ملک میں عوام کے دھرنے سے اس طرح کی تبدیلی کی یہ واحد مثال ہے۔ اسی لئے دنیا بھر کی خوفزدہ کارپوریٹ کلچر کی گروی جمہوریتوں نے اپنے ملکوں کے میڈیا پر اس کی خبر تک نہ آنے دی۔ وجہ یہ ہے کہ میڈیا کو کارپوریٹ سرمایہ کنٹرول کرتا ہے اور کارپوریٹ سرمایہ سودی بینکاری کے فراڈ سے جنم لیتا ہے۔ یہ ہنگامہ اکتوبر 2008ء سے لے کر 2010ء میں آئین کے ازسرِنو تحریر کرنے تک چلتا رہا لیکن سی این این جیسے عالمی چینل پر بھی اسے ایک معمولی خبر کے طور دکھایا گیا۔ پورے امریکہ میں اس خبر کا بائیکاٹ کیا گیا۔ لیکن عوامی احتجاج کے ذریعے ایک جمہوری لیکن بددیانت حکومت کے خاتمے پر لوگ سوشل میڈیا پر متحرک رہے اور اس پورے انقلاب پر ایک ڈاکومنٹری بھی بن چکی ہے جس کا نام ہے۔(PotsPans&othersolutions)

انقلاب کی یہ کہانی دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ 18 اکتوبر 2008 کی سرد دوپہر ملک کی معاشی بدحالی اور سیاسی نااہلی کے خلاف ایک شخص Hordur اپنا گٹار اور مائیکروفون لے کر ایک مرکزی چوراہے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو بلا بلا کر حکومت کے خلاف بولنے کے لیے بلانے لگا۔ ایک ہفتے میں وہاں ایک ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر ہفتے یہاں جمع ہوں گے اور حکومت سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کریں گے اور یہ احتجاج اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حکومت چلی نہیں جاتی۔ 20 جنوری 2009 تک مظاہرے بڑھ گئے اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس دن پولیس نے ان پر کالی مرچوں کا سپرے کیا، لاٹھی چارج کیا اور پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے سے 20 لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ ہنگامے زور پکڑے، پارلیمنٹ کی کھڑکیاں توڑ دی گئیں۔ دھواں پھیلانے والے بم پارلیمنٹ کی کھڑکیوں سے پھینکے گئے۔ وزیراعظم کی کار پر 21 جنوری کو خالی ڈبوں، انڈوں اور برف کے گولوں سے حملہ کیا گیا۔ ہجوم نے تمام سرکاری عمارتوں کا گھیراؤ کر لیا۔ 22 جنوری کو پولیس نے آنسو گیس کا بے دریغ استعمال کیا۔ آئس لینڈ کی تاریخ میں ایسا 60 سال بعد ہوا، پہلے آنسو گیس 1949ء میں استعمال ہوئی جب لوگ نیٹو کے خلاف سڑکوں پر نکلے تھے۔ ہجوم نے دھرنا جاری رکھا اور سرکاری عمارتوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ 23 جنوری کو وزیراعظم (GeirHaardelthat) نے 25 اپریل کو وقت سے پہلے مڈٹرم الیکشن کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ لیکن عوام نے کہا کہ ہم اس آئین اور اس سسٹم کے تحت الیکشن نہیں مانتے۔ ہمیں ایک نئے آئین کی ضرورت ہے۔ عوام کے مطالبے پر 26 جنوری کو وزیراعظم نے استعفیٰ دے دیا اور تمام سیاسی پارٹیاں اس پر متفق ہو گئیں کہ ہمیں ایک نیا آئین مرتب کرنا ہو گا۔ وہ پارٹیاں جو سب سے کم نمائندگی رکھتی تھیں ان کو ملا کر ایک نگران حکومت بنائی گئی۔ انہوں نے عوام کے مطالبے پر فیصلہ کیا کہ تمام عوام کو آئین بنانے میں شریک کیا جائے۔ پورے ملک سے 1500 لوگوں کو بلایا گیا جسے عوامی پارلیمنٹ کہا گیا۔ یہ لوگ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے سرکردہ لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں میں سے 25 لوگوں کو آئین تحریر کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب کے خلاف پرانی وضع اور فرسودہ جمہوری نظام کے دیوانے سپریم کورٹ میں چلے گئے۔ سپریم کورٹ نے 26 اکتوبر 2010 میں ہونے والے یہ غیر سیاسی الیکشن غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دے دیے۔ لیکن پارلیمنٹ ڈٹ گئی۔ انہوں نے کہا کہ جو عدلیہ عوام کی امنگوں، آرزو اور خواہشات کے مطابق نہ ہو، اس کے فیصلے نافذالعمل نہیں۔ آئین تحریر کیا گیا۔ پرانا آئین مسترد ہوا اور 29 جولائی 2011 کو اس کا ڈرافٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس معاشی بدحالی کے ذمہ دار وزیراعظم کو سزا دینے کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا اور اپنے وزیراعظم کو وہاں مجرم کے طور پر کھڑا کر دیا۔

اس انقلاب میں نہ کوئی خون بہا اور نہ ہی قتل و غارت ہوئی، لیکن پورے ملک کا آئینی، قانونی اور انتظامی ڈھانچہ تبدیل ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پارلیمنٹ کو گھیرا تھا ان کی تعداد تین ہزار سے پانچ ہزار تک تھی۔ لیکن کسی نے یہ سوال تک نہ کیا کہ یہ پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتے۔ کسی نے یہ جملہ بھی نہ بولا کہ یہ لوگ جمہوریت کو پٹڑی سے اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ سب سیاستدانوں کو اس حقیقت کا ادراک تھا، کہ عوام کے تمام مطالبات درست ہیں۔ پوری قوم ایک ایسے آئین اور ایسے جمہوری نظام کی غلام ہو چکی ہے جو کارپوریٹ سرمائے اور سودی بینکاری کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان بینکوں نے پوری قوم کو ایک نہ ختم ہونے والے سودی قرضے میں جکڑا اور اسی سرمائے سے سیاسی پارٹیوں کو اپنے مفادات کا تابع بنایا۔ لوگوں نے اس محکوم سیاسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا۔ کیا ہمارا سیاسی جمہوری نظام بھی چند طبقات اور چند آئینی شقوں کا غلام نہیں ہے؟ آپ آج ریفرنڈم کرائیں کہ اس نظام سے اگلے سو سال میں بھی کسی صاحبِ علم، اہل اور عام آدمی کو راستہ مل سکتا ہے تو اکثریت کا جواب نفی میں ہو گا۔ قومیں ارتقائی منازل سے گزرتی ہیں تو اپنے میثاق بھی بدلتی ہیں اور اپنے قانون بھی۔ بوسیدہ کپڑے اتارے نہ جائیں ان کی بدبو اور غلاظت سے بدن میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ ہمارا جمہوری اور آئینی نظام بھی وہ بوسیدہ ملبوس ہے جو چند طبقات کا تحفظ کرتا ہے۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم ایک خارش زدہ جسم کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں یا صحت مند معاشرے کی طرح۔

KitaabPoint.blogspot.com

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

وہ لوگ جو آج بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جمہوریت میں عوام کے خوابوں کو تعبیر مل سکتی ہے‘ ان کی زندگی سنور سکتی ہے‘ وہ خوشحال ہو سکتے ہیں‘ انہیں دنیا کی سب سے کامیاب جمہوریت‘ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے 2014ء میں ہونے والے مڈٹرم الیکشن میں خرچ ہونے والے سرمائے اور سرمایہ فراہم کرنے والے افراد کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔ یہ امریکی تاریخ کے سب سے مہنگے الیکشن تھے جن پر چار ارب ڈالر لاگت آئی۔ سیاستدانوں کو خریدنے اور ان کے الیکشن پر سرمایہ لگانے کی دوڑ تو پہلے ہی سے تھی لیکن 2010ء میں امریکی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ کوئی بھی سرمایہ دار کسی بھی سیاسی پارٹی یا امیدوار کے الیکشن میں پیسہ دے سکتا ہے اور وہ اسے خفیہ بھی رکھ سکتا ہے اور حکومت کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ پارٹیوں کے فنڈز اور اخراجات کے معاملے میں کسی بھی قسم کی کوئی تحقیق کرنے کی مجاز ہو۔ یہ فیصلہ امریکی تنظیم Citizen United کی جانب سے دائر کردہ ایک درخواست پر کیا گیا جسے ڈیوڈ بوسی (DavidBossie) نے داخل کیا تھا۔ فیصلے کے بعد ہونے والے الیکشن سرمائے کی بہتات اور اراکین کانگریس کی خرید و فروخت کا بازار بن گئے۔ دنیا کے دس بڑے امیر آدمیوں میں سے دو بھائی Charls (چارلس) اور David (ڈیوڈ) ریپبلکن پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں جو کوچ (Koch) برادران کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے فنڈ میں 30 کروڑ ڈالر دیئے اور اپنی پارٹی کے الیکشن کی مہم میں میڈیا کو 44 ہزار اشتہارات دیئے۔ میڈیا اور سرمائے کے اس گٹھ جوڑ نے سینٹ پر ریپبلکن پارٹی کا اقتدار مستحکم کر دیا۔ یہ دونوں بھائی تیل کی صنعت سے وابستہ ہیں اور ان کا سب سے بڑا مفاد اس وقت کینیڈا اور امریکہ کے درمیان تیل کی ترسیل کی وہ پائپ لائن ہے جسے AL پائپ لائن کہتے ہیں۔ اس پائپ لائن پر بہت سے ماحولیاتی اعتراضات ہوئے اور باراک اوباما نے جنوری 2012ء میں اس پائپ لائن کے پراجیکٹ کو ملتوی کر دیا تھا۔ کانگریس میں ریپبلکن کی اکثریت کے بعد اب جمہوری طور پر وہ تمام اعتراضات دم توڑ جائیں گے اور اگر یہ پائپ لائن بن گئی تو دونوں بھائیوں کی آمدنی میں تیس ارب ڈالر کا اضافہ ہوگا۔ کیسا سستا سودا ہے یہ جمہوریت اور جمہوری نظام۔ 30 کروڑ ڈالر خرچ کرو‘ شاندار میڈیا کے ذریعے پراپیگنڈہ کرو‘ لوگوں کو صرف چند گھنٹوں کے لئے بے وقوف بناؤ کہ تم ہی اصل حاکم ہو اور تیس ارب ڈالر کماؤ یعنی 30 گنا زیادہ منافع۔

اسی جمہوریت اور جمہوری نظام کا ایک اور مکروہ چہرہ امریکی عوام سے کیا گیا تازہ ترین سروے ہے۔ یہ سروے ثابت کرتا ہے کہ کس طرح آپ لوگوں کے ذہنوں کو یرغمال بنا کر اکثریت کو قائل کر سکتے ہو کہ ظلم اور بربریت جائز ہے یعنی اکثریت اگر معصوم لوگوں کو قتل کرنا جائز قرار دے تو پھر چونکہ یہ ایک جمہوری فیصلہ ہے‘ اس لئے اس پر عملدرآمد کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ یہ سروے Gallup Daily Tracking نے کیا ہے۔ اس کے مطابق 65% امریکی عوام نے کہا ہے کہ امریکہ ان ملکوں پر ڈرون حملے کرے جہاں مشتبہ دہشت گرد موجود ہیں جبکہ 41 فیصد نے کہا کہ وہ ملک جہاں ایسے دہشت گرد بستے ہیں جو امریکی شہری ہیں تو ان پر بھی ڈرون گرائے جائیں۔ امریکہ میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر ڈرون حملوں کے حق میں 25 فیصد لوگ تھے جبکہ 13 فیصد یہاں تک حامی تھے کہ اگر کوئی مشتبہ دہشت گرد امریکی ہے اور امریکہ میں ہی رہتا ہے تو اس پر بھی ڈرون سے حملہ کیا جائے۔ یہ ہے وہ نفسیات جو امریکی عوام کی بنا دی گئی ہے۔ یہ نفسیات کس نے بنائی ہے۔ یہ سروے پارٹیوں کے لیڈران کے بارے میں بتاتا ہے کہ ریپبلکن کے 79 فیصد ممبران ڈرون حملوں کے حق میں ہیں جبکہ ڈیموکریٹس کے 55 فیصد ممبران کسی بھی ملک میں کسی بھی دہشت گرد کے خلاف ڈرون حملوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ حمایت کیسے پیدا ہوئی۔ یہ اجتماعی سوچ کس طرح پیدا کی گئی کہ کسی کو اس بات کا اندازہ تک نہیں کہ ان حملوں میں نوے فیصد سے زیادہ معصوم عورتیں‘ مرد اور بچے لقمہ اجل بنتے ہیں۔ ایف بی آئی (FBI) کے سپیشل ایجنٹ کولن راؤلی (ColeenRowley) نے موجودہ امریکی جمہوری نظام کی اس شدت پسندی کا ایک شاندار نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ اس کا مضمون اس عنوان سے ہے کہ ”امریکی سر قلم کرنے سے نفرت کرتے ہیں جبکہ ڈرون حملوں سے محبت کیوں؟“۔ وہ حیران ہے کہ فوجی ماہرین یہ تصور کرتے ہیں کہ ڈرون حملوں سے شدت پسندی میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ سیاسی لیڈران اور جمہوریت کے نظام کی اساس‘ اس کا میڈیا عوام کو قائل کر چکا ہے کہ ڈرون حملے دنیا میں امن قائم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ اس کی چار وجوہات بیان کرتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس جمہوری سیاست نے امریکی عوام کو یہ سکھایا ہے کہ تم اسقدر برتر اور اعلیٰ ہو کہ تم ایک جانب اور پوری انسانیت دوسری جانب۔ تمہارا ایک آدمی بھی مارا جائے تو دوسروں کے ایک لاکھ بھی مار کر انتقام لیا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا کی بدترین نسل پرستی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ سر قلم کرنے کی ویڈیو امریکی میڈیا کے ذریعے گھر گھر پہنچائی جاتی ہے اور عوام کو ایک خوف کا شکار کیا جاتا ہے جبکہ آج تک کسی ڈرون حملے میں مرنے والے بچوں‘ بوڑھوں اور عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے جسم دنیا اور خصوصاً امریکہ کے کسی بھی میڈیا پر نہیں دکھائے گئے۔ اگر یہ ایک دفعہ دکھا دیئے جائیں تو امریکی عوام ایک نفسیاتی شرمندگی کا شکار ہو جائیں۔ اس لئے کہ جن لوگوں نے عملی طور پر ڈرون کو کنٹرول کیا ہے ان میں سے کئی خودکشی کی کوشش کر چکے ہیں یا پھر نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ تیسری وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ ڈرون حملوں کی حمایت امریکہ کی امن کمیٹی ”PeaceCommittee“ کرتی ہے۔ اس کے ارکان ایک مقصد کے تحت برین واش کئے ہوئے ہیں‘ ان کا علم واجبی اور محدود ہے اور انہیں اندازہ تک نہیں کہ امریکہ کی طرف سے لڑی جانے والی جنگوں کے نتیجے میں القاعدہ‘ طالبان اور اب داعش جیسی تنظیمیں وجود میں آئی ہیں‘ جو ان جنگوں میں ہونے والے معصوم شہریوں کے قتل عام کا ردعمل ہیں۔ چوتھی اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ امریکہ خواہ ویت نام میں جائے یا عراق اور افغانستان میں‘ اس کے اسلحہ ساز فیکٹریوں کا کاروبار چمکنے لگتا ہے‘ اس کے ساتھ ساتھ ان علاقوں پر قابض ہو کر وہاں کے وسائل کو استعمال کرنے کے لئے کمپنیاں وہاں جاتی ہیں۔ اس سے امریکی معیشت میں بہتری آتی ہے‘ لوگوں کو نئی نوکریاں ملتی ہیں۔ عام امریکی کو علم تک نہیں ہوتا کہ امریکہ کسقدر مقروض ہوا۔ اسے تو روز بروز بڑھتی ہوئی تنخواہ اور نئی نئی نوکریوں سے غرض ہوتی ہے۔ سرمایہ دار دن دوگنی اور رات چوگنی دولت بناتے ہیں اور پھر اس دولت کو پارٹیوں کو فنڈ دینے میں لگا کر پوری جمہوری سیاست کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ دنیا کی سب سے کامیاب جمہوریت یوں چند سرمایہ داروں کے اشارے پر ناچتی اور انسانی لاشوں سے کاروبار سیاست و معیشت چمکاتی ہے۔ اسی جمہوری نظام کا تسلسل ہمارے پڑوس میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت میں نظر آتا ہے۔ اس تسلسل نے وہاں امبانی، متل‘ ٹاٹا اور برلا تو پیدا کئے لیکن عام آدمی کو بیت الخلا جیسی ضرورت مہیا نہ کر سکی۔ نریندر مودی کے الیکشن کارپوریٹ سرمائے کا کھلا اظہار تھا۔ اس سرمائے کے شکنجے میں ویسے ہی نعرے پلتے ہیں ایک بھارتی مرے تو ہزار مخالف مارو‘ سبق سکھاؤ۔ کیا کسی کو پاکستان کی سیاست میں سرمائے کی بہتات سے آنے والے دنوں کا چہرہ نظر نہیں آرہا۔ ایک بدترین متعصب‘ خونریز اور خون چوسنے والا کریہہ چہرہ۔ بقول اقبال۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

KitaabPoint.blogspot.com

چنگاری سلگ رہی ہے

ابن خلدون وہ شخص ہے جسے دنیا تاریخ کا پہلا غیر جانب دار مؤرخ مانتی ہے۔اس عظیم تاریخ دان سے پہلے تاریخ لکھنے والے عموماً واقعات تحریر کر دیا کرتے تھے جسے وقائع نگاری کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہ یا بڑے لوگ اپنی سوانح عمریاں لکھا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں ان کی زندگیوں کی کامیابیاں، جدوجہد اور واقعاتی ترتیب مل جاتی تھی۔ کبھی کبھار عوام، خواص یا علاقوں کے بارے میں بھی ان کے ذاتی تبصرے موجود ہوتے تھے۔ یونانیوں نے تاریخ کو ذرا مختلف انداز سے لکھنے کی کوشش کی۔ دیوی دیوتاؤں کے افسانوی کرداروں سے ہٹ کر اور قصے کہانیوں سے بالا ہو کر جنگوں کا حال لکھا گیا۔ اس میں ہیروڈوٹس کی تاریخ نمایاں ہے جو یونان اور ایران کی جنگوں کا حال بتاتی ہے۔ روم کے جولیس سیزر نے بھی روم کی سلطنت اور تہذیب کی بحیرۂ روم سے بحیرۂ اوقیانوس تک وسعت کی کہانی تحریر کی۔ کچھ تاریخیں زوال کی داستانیں سناتی ہیں۔ لیوی کی کتاب ''واقعات'' میں نیرو کے مظالم، روم کا جلنا اور نیرو کا بانسری بجانا درج ہے۔ یہ سب مرثیے اور نوحے جیسے گہرے تاثر کے ساتھ دردناک طریقے سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ نویسی مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں گئی تو یہ واقعات سے زیادہ مذہبی عقائد کی ترویج بن گئی۔ سینٹ آگسٹائن نے یوں تو ''خدا کا شہر'' میں پوری انسانیت کی تاریخ لکھی ہے لیکن یہ قصۂ آدم وابلیس اور زمین پر اترنے سے لے کر قیامت کے برپا ہونے تک مذہبی عقائد ہی کو بیان کرتی ہے۔ غرض قدیم تاریخ میں واقعات کے ذکر، اہم شخصیات کی تصویر کشی اور فتوحات کے علاوہ کچھ نہ ملتا تھا۔

ابن خلدون جس زمانے میں پیدا ہوا اس میں مسلمان فلسفہ، طب، سائنس، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ ابن خلدون کے دور طالب علمی میں مصر میں انسائیکلوپیڈیا لکھنے کا رواج شروع ہو چکا تھا اور اس انداز تحریر نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نویری نے 30 جلدوں پر مشتمل ایک خزانہ مرتب کیا جس میں تمام انسانی علوم اور تاریخی معلومات تھیں۔ عمری نے جغرافیہ کا انسائیکلوپیڈیا 36 جلدوں میں مرتب کیا۔ یوں نئے پڑھنے والے کے سامنے اس وقت کے موجود علم کا سارا خزانہ محدود حد تک میسر تھا جس سے اُسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس موضوع پر اب تک کتنا کام ہو چکا ہے اور کونسا موضوع ابھی تشنہ ہے۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائی یورپ، صلیبی جنگوں کے بعد مسلمانوں کے علم اور تہذیب سے اتنا مرعوب ومتاثر ہوا تھا کہ ان کے بڑے بڑے عالم مسلمانوں کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کرتے تھے۔ یورپ پر تقریباً تین صدیاں ایسی گزریں کہ ہر سکول میں عربی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی تاکہ اس زبان میں موجود علمی خزانے تک لوگ رسائی حاصل کر سکیں۔ اس دور تک تمام علوم خاطر خواہ ترقی کر چکے تھے لیکن تاریخ اب بھی قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ یہ ذاتی، علاقائی اور نسلی تعصب سے لتھڑی ہوئی تھی۔ خود اسلام کی تاریخ بھی اس دور تک ایسی ہی لکھی گئی۔ جو جس مسلک کا حامی تھا، جس قبیلے اور نسل کا مداح تھا اس نے تاریخ میں اتنا جھوٹ ملایا کہ آج تک امت اس میں الجھی ہوئی ہے۔ آپ اسلام میں اختلافات کی بنیاد ڈھونڈنے نکلیں تو آپ کو قرآن وسنت میں جھگڑا نہیں ملے گا۔ لیکن تاریخ میں جھگڑا، نفرت، تعصب اور جھوٹ اس قدر بھر دیا گیا کہ امت آج تک ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہے۔

ابن خلدون نے پہلی دفعہ تاریخی واقعات کی وجوہات جاننے، اس کے پس پردہ محرکات پر تحقیق کرنے اور ان میں حکمت تلاش کرنے کا آغاز کیا۔ ابن خلدون سے پہلے مورخوں نے جو سنا تھا، لکھ دیا۔ لیکن اس نے تحقیق اور چھان بین کو اپنا اصول بنایا۔ اس کے نزدیک تاریخ کی کوئی بڑی تبدیلی، کوئی فتح یا شکست، کسی قوم کا زوال یا عروج بلاوجہ نہیں ہو جاتا بلکہ مدتوں وہ اسباب پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں اور پھر حالات وواقعات پر غالب آجاتے ہیں۔ وہ قوموں کے اجتماعی رویے کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس کسوٹی پر رکھ کر واقعے کو جانچتا ہے۔ مثلاً کسی عادی عیش کوش اور بزدل قوم کا بادشاہ اپنی غیرت اور فتح کی داستان تحریر کرتا ہے تو اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح ایک جفاکش، محنتی اور اپنی روایت کا تحفظ کرنے والی قوم سے بزدلی کی توقع کرنا غلط ہے۔

ابن خلدون نے اپنے ان اصولوں کی بنیاد پر تمام اقوام کی تاریخ کا تجزیہ کیا اور تاریخ کو ایک سائنس بنا دیا۔ اپنے اس تجزیے کی بنیاد پر وہ اقوام کے تین دور بیان کرتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب یہ خانہ بدوش قسم کی زندگی گذار رہی ہوتی ہے یا پھر بکھری بکھری نظر آتی ہے۔ لیکن اپنی جفاکش عادتوں کی وجہ سے ایک سلطنت قائم کر لیتی ہے۔ اس کے بعد اس پر تیسرا دور آتا ہے جب وہ مغلوب اور محکوم قوموں کی عادتیں اختیار کر لیتی ہے اور پھر ان کی طرح خود بھی مغلوب ہو جاتی ہے۔ اس نے اس زوال کی تین وجوہات بتائی ہیں۔

(1) اشرافیہ یعنی حکمران طبقوں کی کمزوریاں

(2) غیر ملکی طاقتوں یا افواج کے مطالبات

(3) عیش پرستی

ان کسوٹیوں پر پاکستان کی قوم کو پرکھیں تو حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہم برصغیر میں ایک ہزار سال سے موجود ہیں۔ ان ہزار سالوں میں آٹھ سو برسوں سے زیادہ عرصہ ہندو قوم یہاں ایک مغلوب قوم کے طور پر رہتی رہی۔ مسلمان اپنے ساتھ جو تہذیب لے کر آئے ہندو قوم نے اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ کھانے میں کباب، نہاری، پلاؤ، بریانی، زردہ وغیرہ۔ ادب میں غزل، مثنوی، رُباعی، مرثیہ اور افسانہ۔ موسیقی میں ستار، بربط، رباب، طبلہ اور سارنگی۔ فن تعمیر میں گنبد، محراب، کاشی کاری، منبت کاری اور کیلی گرافی۔ لباس میں شلوار قمیض، شیروانی، اچکن اور ٹوپی۔ غرض ان آٹھ سو سالوں میں اس مغلوب قوم نے ہمارے تمام تہذیبی ورثے کو اپنا حصہ بنا لیا۔ لیکن آزادی کے ساٹھ سال بعد ہم دیکھیں تو ابن خلدون کے بقول آج ہم نے اسی مغلوب قوم کے کلچر کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھ کر اپنانا شروع کر دیا ہے۔ یہ کسی قوم کی تباہی پر مہر ثبت کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہم نے سب کچھ بخوشی اور برضاو رغبت اپنایا۔ اور آج اپنا وجود ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ ہم کون تھے، کیا تھے اور ایسے کیوں ہو گئے؟ جب غالب رہنے والی قومیں مغلوب قوموں کی عادتیں اختیار کر لیتی ہیں تو پھر ان کے حکمران طبقے میں ایسی کمزوریاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں جن کی بنیاد احساس کمتری ہوتی ہے۔ وہ اپنی عیش پرستی میں ڈوب کر غیرت وحمیت کی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ اپنے کل پر آج قربان کرتے ہیں اور نہ اپنے مفادات پر کسی قومی ذمہ داری کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو ان پر کوئی بھی طاقت جس طرح چاہے اور جیسے چاہے اپنے مطالبات مسلط کر دیتی ہے اور زوال پزیر قوم جان کی امان پاتے ہوئے سب تسلیم کر لیتی ہے۔ یہ ہیں قوموں کے زوال اور تباہی کے اسباب۔ ابن خلدون سے آج تک تمام مورخین تاریخ کی اس تعبیر سے متفق ہیں۔ لیکن جدید دور میں صنعتی ترقی اور اظہار رائے کی آزادی کی بدولت زوال کی داستان مکمل ہونے سے ذرا پہلے، جب سب کچھ ملبے کا ڈھیر بننے والا ہوتا ہے، راکھ ہوتی قوموں کی عمارت کے ڈھیر میں چنگاری سلگنے لگتی ہے، جس کا احساس نہیں ہوتا۔ بظاہر مایوسی کے ملبے نے سب کچھ ڈھانپ رکھا ہوتا ہے۔ مگر چنگاری آہستہ آہستہ پھیلتی رہتی ہے۔ قوم اُس ملبے کے ڈھیر کی طرح بظاہر ساکن نظر آتی ہے لیکن پھر یکدم چاروں طرف سے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جن کے بارے میں آج کے مورخین کہتے ہیں کہ تاریخ لکھنے والے اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ لمحے شعلوں کی طرح بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ مورخ صرف واقعات دیکھ پاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر نئی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ نئی قوم، نئی امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ جنم لیتی ہے۔ انسانوں کے کاٹھ کباڑ سے نجات مل جاتی ہے۔ ہم پر یہ سب علامتیں پوری ہو چکیں۔ چنگاری سلگ رہی ہے۔ بس اب اچانک دھماکے کا انتظار ہے!

KitaabPoint.blogspot.com

چڑچڑے دانشور

چاروں جانب برآمدے اور بیچ میں صحن۔ روز ہم سکول شروع ہونے سے پہلے یہاں جمع ہوتے، قرآن کی تلاوت کے بعد اقبال کی دعا "لب پہ آتی ہے......" ایک ساتھ لہک لہک کر گائی جاتی اور پھر قومی ترانہ۔ اس کے بعد سب اپنی اپنی کلاسوں میں جا بیٹھتے۔ یہ میرے شہر گجرات میں میونسپل کمیٹی کے تحت چلنے والا ایک پرائمری سکول تھا' لیکن آج کا دن مختلف تھا' یہ اس سکول سے رخصتی کا دن تھا۔ پانچویں کلاس کے نتیجے کا اعلان ہوا۔ سارے طالب علم کامیاب! ایک شور اٹھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خاموش ہونے کو کہا اور پھر ہمارے اسلامیات کے استاد سے دعا کرنے کی درخواست کی۔ اس دعا کا تاثر آج تک میرے دل و دماغ پر قائم ہے۔ دعا مانگتے ہوئے ماسٹر شریف صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، داڑھی بھیگ گئی' وہ ہچکیوں کے ساتھ دعا مانگتے رہے: "اے اللہ یہ بچے تیرے پیارے حبیب حضرت محمد ﷺ کے باغ کے پھول ہیں۔ ان کی حفاظت فرما، ان کو صداقت اور امانت کی بارش سے تروتازہ رکھ، انہیں سیدنا ابوبکرؓ کی صداقت، حضرت عمرؓ کی شجاعت، حضرت عثمانؓ کی سخاوت اور حضرت علیؓ کی عدالت سکھا"۔ کئی دہائیاں گذر گئیں لیکن آج بھی زندگی کے ہر موڑ پر یہ دعا ہمیشہ سایہ فگن رہتی ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا حیرت انگیز اور اثر کرنے والا واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے لیکن اس کی کیفیت اور اثرات مختلف ہیں۔ چوبیس سال بعد جب میں سول سروس اکیڈیمی سے فراغت حاصل کر کے کوئٹہ میں زیر تربیت اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر سے نوکری میں صداقت اور دیانت کے موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ عموماً سول سروس میں جونیئر افسر اور خصوصاً زیر تربیت افسر سے زیادہ بحث کی توقع نہیں کی جاتی نہ برداشت کی جاتی ہے۔ میری گفتگو ایک حد سے بڑھی تو ڈپٹی کمشنر صاحب نے تجربے کی سان پر کسا ہوا فقرہ آخری فیصلے کے طور پر بولا: نوکری میں کبھی تمہیں ایک ایماندار مگر نااہل۔ اور ایک بے ایمان مگر قابل میں سے کسی ایک کو چننا پڑ جائے تو ہمیشہ بے ایمان مگر قابل کو چننا ورنہ پچھتاؤ گے۔ یہ فقرہ ہتھوڑے کی طرح مجھے لگا۔ گزشتہ اٹھائیس برس کی نوکری میں ایسے کئی ہتھوڑے آئے روز برداشت کرتا اور ان کی اذیت سے گزرتا ہوں۔ سوچتا تھا' کیا چوبیس سال میں ہمارا معاشرہ اتنا بدل جائے گا کہ ماسٹر شریف جیسے ہزاروں استادوں کی دعائیں بے اثر ہو جائیں گی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا' خرابی میرے ساتھ تھی۔ میں ایک ایسے سکول سے' جہاں بیٹھنے کے لئے ٹاٹ گھر سے لانا پڑتا تھا، ایک ایسی نوکری کے ماحول میں آ گیا تھا جہاں مدتوں آکسفورڈ، ایچی سن، لنکن ان جیسے اداروں کے پڑھے ہوئے لوگوں کا راج رہا۔ جہاں سکہ رائج الوقت نوکری، سرکار کی خوشامد، کیریئر اور پھر کہنیاں مار مار کر آگے بڑھنے میں تمام اخلاقیات کو پاؤں تلے روندنے کا اصول ہی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

صداقت اور امانت دو ایسے لفظ ہیں جو ان خوبیوں سے آراستہ ہوئے سے صادق اور امین کہا جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی معاشرے، ملک، حکومت یا مذہب میں ان دونوں خوبیوں کا انکار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر معاشرہ انہیں تہذیب کی بنیاد تصور کرتا ہے۔ اُردو یا عربی میں یہ دونوں لفظ اسلام سے وابستہ ہیں خصوصاً ان دونوں صفات کی گواہی مشرکین مکہ نے میرے آقا سید الانبیاء ﷺ کیلئے دی اس لئے جب سے یہ دو الفاظ پاکستان کے آئین میں شامل کئے گئے میرے ملک کے "عظیم" دانشوروں کا غصہ، نفرت اور تعصب دیکھنے کے قابل ہے۔ آئین ان دونوں الفاظ کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ صادق یعنی (Truthful) اور امین یعنی (Man of integrity)۔ کیا یہ دونوں الفاظ دنیا کے ہر مذہب آئین اور ترقی یافتہ ملک کی جمہوری سیاست کا حصہ نہیں؟ کیا وہ اپنے کسی سیاست دان کو جھوٹا یا بددیانت ثابت ہونے کے بعد اپنی پارٹی کی صفوں میں رکھتے ہیں؟ کیا وہ بددیانت اور جھوٹوں کو دوبارہ عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں؟ اگر انہیں دوبارہ ووٹ ملتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ جمہوریت نے جھوٹ اور بددیانتی کو اصول مان لیا ہے۔ صرف ایک سچ چھپانے پر نکسن صدارت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور پھر اُس کی پارٹی مدتوں اُس کا نام تک نہ لیتی تھی۔ چھوٹی سی بددیانتی پر وزارتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے اور پھر ایسے لوگوں کے لئے سیاست کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ ان سب لوگوں کو بددیانت، چور، یا جھوٹا عوام ثابت نہیں کرتے' ان کے لئے کوئی ریفرنڈم نہیں کرایا جاتا بلکہ اکثر اوقات انہیں ایک معمولی مجسٹریٹ یا جج اپنے کسی معمول کے فیصلے میں جھوٹا، بددیانت یا چور قرار دے دیتا ہے اور پھر سیاست کے ایوانوں، اخبار کے اداریوں یا تجزیہ نگاروں کے تجزیوں میں بحث ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی نہیں کہتا اسے اپیل کا حق ہے، اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے یا ہم پارلیمنٹ یا کانگریس کے سامنے معاملہ پیش کریں گے۔ سب ذلت و رسوائی کے ساتھ اُس شخص کو سیاست کے میدان سے رخصت کر دیتے ہیں۔

لیکن میرے ملک میں منافقت کا یہ عالم ہے کہ جو سیاستدان، تجزیہ نگار، دانشور اور انسانی حقوق کے علمبردار وکیل رہنما صادق اور امین کے لفظ سے چڑتے ہیں، ان کی ذاتی زندگی میں اگر کوئی ڈرائیور پٹرول چوری کرتا پکڑا جائے، کسی ملازم کے بارے میں علم ہو جائے کہ اُس نے سودے میں سے پیسے مار لئے ہیں، کوئی نوکر ان کے منہ پر جھوٹ بولے، کسی گھریلو ملازمہ پر بددیانتی کا شبہ ہو تو وہ انتظار نہیں کریں گے کہ جرم عدالت میں ثابت ہو۔ کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیں گے۔ یہ تو عام ملازم کی بات ہے جس کی اوقات ہی معمولی چوری یا بددیانتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی شوگر مل، ٹیکسٹائل فیکٹری، دکان یا کاروبار کسی ایسے شخص کے حوالے کریں گے' جس کے بارے میں انہیں شبہ ہو جائے کہ وہ بددیانت، چور اور جھوٹا ہے۔ وہ صادق اور امین نہیں۔ کیا وہ اپنی اولاد کے رشتے کسی ایسے لڑکے یا لڑکی کے ساتھ کریں گے، جن کے بارے میں انہیں یہ اطلاع مل جائے کہ لوگ انہیں جھوٹا، بددیانت یا چور سمجھتے ہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کرتے بلکہ ان تمام موقعوں پر وہ صادق اور امین کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسمگلنگ، چرس، ہیروئن کا کاروبار کرنے والے اور جوئے کا اڈہ چلانے والے بھی اپنا کاروبار ایک جھوٹے، بددیانت یا چور کے حوالے نہیں کرتے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ سب لوگ کس قدر دلیل کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ایک جھوٹا، بددیانت یا چور عوام کے ووٹ لے کر آتا ہے تو اسے عوام کی قسمت سے کھیلنے کا پورا حق ہے۔ ان کے بقول' آئین میں صادق اور امین کی شرط لایعنی ہے۔ اسے ایک ڈکٹیٹر نے ڈالا تھا۔ نفرت ڈکٹیٹر سے نہیں ہے' نفرت صادق اور امین کے لفظ سے ہے اس لیے کہ ان دونوں الفاظ سے میرے آقا ﷺ کی سیرت کی خوشبو آتی ہے۔ اگر لوگوں کی زبان پر یہ لفظ عام ہو گئے تو لوگ کہیں اس دور کی خوشبوؤں میں واپس لوٹنے کی خواہش نہ کرنے لگیں۔ یہ وہ منافقت ہے جو ہمارے معاشرے پر چھائی ہوئی ہے۔ امانت اور سچ دو ایسی خوبیاں ہیں جن کے اُٹھ جانے پر سرکار دو عالم ﷺ نے قوموں کو عذاب کی بشارت دی ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت حذیفہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی وہ احادیث' بخاری اور ترمذی میں موجود ہیں' ان میں قرب قیامت اور عذاب کی 72 علامات ہیں، ان میں امانت اور سچ کا اٹھ جانا سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ دوسری علامتوں میں آپ ﷺ نے فرمایا قوم کے لیڈر کمینے، بدخلق اور لالچی ہوں گے، حکومت کا انتظام ایسے لوگوں کے سپرد ہو گا' جو اس کے اہل نہ ہوں گے۔ جب ایسا ہونے لگے تو پھر انتظار کرو سرخ آندھیوں کا' زلزلوں کا' چہروں کے بدلنے کا اور آسمانوں سے پتھر برسنے کے عذابوں کا کہ یہ ایسے تواتر سے ہوں گے جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جائے اور دانے برابر گر رہے ہوں۔

KitaabPoint.blogspot.com

کالم نگار کے لئے ہدایت کی دعا کے ساتھ

پاک ہے میرا اللہ جو دلوں میں چھپی سچائیوں اور جھوٹ کو جانتا ہے، اور سچا ہے اس کا کلام جو سود کی حمایت کرنے والوں کی ذہنی حالت کو بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ انہیں شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہے (البقرہ)۔ اس سچے کلام پر ایمان لانے کے بعد مجھے قطعاً حیرت نہ ہوئی جب سود کے موضوع پر ''زیورچ'' شہر پر لکھے گئے ایک کالم نگار کے کالم پر میں نے خالصتاً علمی بنیاد پر بحث کی، تو جواب میں میری ذات پر کیچڑ اچھالا گیا۔ میں اپنی ذات کے حوالے سے کوئی جواب نہیں دوں گا کہ میرے سامنے سیّدنا علیؓ کا وہ اسوہ ہے کہ ایک معرکے میں آپ ایک کافر کو زیر کر کے اس کی چھاتی پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ اس کی گردن اڑا دیتے، مگر اس نے ان کے چہرے پر تھوک دیا۔ آپ فوراً نیچے اتر آئے۔ کافر نے پوچھا کہ آپ نے مجھے قتل کیوں نہ کیا، تو جواب دیا کہ اگر اب میں تمہیں قتل کرتا تو اس میں میرا ذاتی انتقام بھی شامل ہو جاتا اور میں اس لڑائی کو اللہ کے لیے خاص رکھنا چاہتا ہوں۔ میں بھی اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان کردہ سود کے خلاف جنگ میں ذاتی انتقام کو شامل نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ اس کالم میں اٹھائے گئے چند علمی طور پر بحث طلب نکات کا جواب دینا چاہتا ہوں تاکہ خلق خدا گمراہی سے بچ سکے۔

موصوف نے تحریر کیا ہے کہ کالم میں انہوں نے بینکاری سود کے بارے میں جامعہ الازہر کے فتوے کا ذکر کیا تھا جس کا جواب نہیں دیا گیا۔ شیطان جب کسی کو چھو جائے تو یادداشت بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ موصوف کے جس کالم ''زیورچ'' کا جواب دیا گیا وہ مورخہ 13 جولائی 2014ء کو چھپا تھا اور اس میں اس فتوے کا دور دور تک ذکر نہیں۔ البتہ آج سے دو سال قبل جب موصوف نے سود کی کھلم کھلا حمایت میں کالموں کا آغاز کیا تو کسی کالم میں اس فتوے کا ذکر کیا تھا۔ جس کا صراحتاً جواب میں نے دیا تھا اور ان سے فون پر بھی اس کے عربی متن کے حوالے سے گفتگو بھی کی تھی، تاکہ اللہ اور اس کے رسول کی اصل منشا واضح کر سکوں۔ یہ فتویٰ ہے کیا؟ کس نے تحریر کیا؟ اس کے مقاصد کیا تھے اور اس کو دنیا بھر کے تمام علما جن میں ہر مسلک کے عالم شامل تھے انہوں نے کیسے مسترد کیا۔ ان تمام سوالوں کا جواب حاضر ہے۔ یہ جواب کسی ویب سائٹ کے لنک سے حاصل مواد سے نہیں بلکہ اصل عربی متن کے مقالہ سے دیا جا رہا ہے۔ یہ فتویٰ ڈاکٹر محمد سید طنطاوی کا جاری کردہ ہے۔ یہ فتویٰ ڈاکٹر صاحب نے 1989ء میں تحریر کیا تھا جب ان کا الازہر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ انہوں نے ایم اے آنرز کی ڈگری تعلیم کے شعبہ میں حاصل کی اور پی ایچ ڈی کا مقالہ بنی اسرائیل پر تحریر کیا۔ اسی تعلیم کی بنیاد پر مصر کی حکومت نے انہیں ایک سرکاری عہدے ''مفتی اعظم'' کی نشست پر 1986ء میں بٹھا دیا۔ 1989ء میں مصر میں اسلامی معاشی نظام کے نفاذ کی ایک زوردار تحریک شروع ہوئی اور مغربی طرزِ سودی بینکاری کے خاتمے کا مطالبہ زور پکڑا تو حکومت نے طنطاوی کو فتویٰ جاری کرنے کے لیے کہا۔ جس پر انہوں نے ایک گول مول سا فتویٰ جاری کیا جس میں صرف حکومت کے سکیورٹی بانڈز اور سیونگ اکاؤنٹ کے منافع کو جائز قرار دیا گیا مگر بینکوں کے قرضوں پر وصول کی جانے والی رقم کو سود ہی قرار دیا۔ اپنے اسی فتوے کی تشریح میں طنطاوی نے 2001ء میں ایک کتاب ''معاملات ال بنوک'' لکھی جس کے صفحہ 139 سے 142 تک انہوں نے بینک کے قرضوں اور بینکوں کے ڈیپازٹ پر بھی ہر قسم کے منافع کو حرام اور رباء (سود) قرار دیا۔ ان کے اس فتوے کو مصر میں بھی کوئی پذیرائی نہ مل سکی اس لیے کہ علامہ یوسف القرضاوی کی سربراہی میں تمام علماء نے اسے مضبوط دلائل کی بنیاد پر مسترد کر دیا۔ اور ان تمام علماء نے بینکوں کے ہر قسم کے منافع کو سود قرار دیا۔ مصر کی حکومت کی حالت بھی پاکستان کی طرح رہی کہ کسی جانب مت جھکو، بس خاموشی سے سودی نظامِ بینکاری کو چلنے دو۔ ڈاکٹر طنطاوی کو اپنے انہی خیالات کے انعام میں حسنی مبارک نے ایک انتظامی حکم نامے کے ذریعے 27 مارچ 1997ء کو الازہر کا سربراہ ''الامام اکبر'' مقرر کر دیا۔ اس مسند پر انہوں نے 28 نومبر 2002ء کو الامام اکبر کی حیثیت سے کالم نگار کا محبوب فتویٰ جاری کیا۔ فتویٰ چار صفحات پر مشتمل ہے اور صرف سکیورٹی بانڈز اور سیونگ اکاؤنٹ سے متعلق ہے۔ فتوے میں کہا گیا ہے کہ اگر دو افراد یا دو گروہ ایک پہلے سے طے شدہ منافع کی شرح پر متفق ہو جائیں تو یہ شرعاً حلال ہے کیونکہ منافع کی شرح حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ فتویٰ میں مصر کے حکومتی سکیورٹی بانڈ کی مثال دی گئی جو پہلے 4 فیصد منافع دیتے تھے پھر 15 فیصد دینے لگے اور اب 10 فیصد دے رہے ہیں۔ اس فتوے میں کسی قسم کے نقصان میں شراکت کا ذکر تک نہیں۔ اور بینکاری کی بھی کسی اور قسم کو حلال نہیں بتایا گیا۔ عربی متن یوں ہے (ومما لاشک فیہ ان تراضی الطرفین علی تحدید الربح مقدما من الامور ال مقبولۃ شرعا و عقلا حتی ی عرف کل طرف حقہ)۔ اس کا ترجمہ جناب کالم نگار اپنے کسی بھی سیکولر، لادین اور اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا مذاق اڑانے والوں سے ہی کروا لیں۔ یہ سب لوگ آجکل موصوف کے کالم بڑے شوق سے حوالوں کے طور پر نیٹ پر پیش کرتے ہیں، اور انہیں سودی بینکاری کا مبلغ ثابت کرتے ہیں۔ انہیں کہیں بھی اس فتوے میں بینک کا سود حلال نہیں ملے گا۔ یہ سب الگ بات ہے کہ اس ذریعے سے جو تھوڑی سی گنجائش طنطاوی صاحب نے نکالی ہے، اللہ کے رسول نے اس کی بھی نفی کی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر وہ قرض جس سے نفع اٹھایا جائے وہ رباء (سود) ہے۔ (بیہقی، مسند حارث بن اسامہ) طنطاوی نے صرف حکومتی بانڈز اور سیونگ اکاؤنٹ پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ باقی تمام بینکاری کو وہ کلیتہ حرام تصور کرتے ہیں ان کی کتاب ''معاملات ال بنوک' اس پر واضح ہے۔ لیکن فتوے میں دی گئی رعایت کو بھی پوری امت کے علماء نے مسترد کیا ہے۔ یہ طنطاوی وہی ہیں جنہوں اسقاطِ حمل کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اکتوبر 2009ء میں طنطاوی قاہرہ کے نصر کے علاقے میں لڑکیوں کے ایک سکول گئے اور نوجوان لڑکیوں کو حجاب اتارنے کا حکم دیا اور کہا کہ تمہیں زندگی بھر حجاب پہننے کی شرعاً ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب دس مارچ 2010ء میں ان کا انتقال ہوا تو تعزیت کرنے والوں میں براک اوباما، پوپ اور ہلیری کلنٹن شامل تھے۔

موصوف کالم نگار نے دوسرا معاملہ کار ساز کمپنی کے بارے میں لوگوں کو گمراہ کرنے اور سود کی پرزور حمایت میں اٹھایا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی میں اپنے 27 جنوری 2014ء کے کالم بعنوان ''سود ایک کا، لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات'' میں تفصیلاً دے چکا ہوں۔ کار ساز کمپنی کے بانی نے بینکوں سے قرضہ لے کر کاروبار کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کمپنی صرف دو فیصد حصے اپنے پاس رکھ کر لوگوں میں نفع اور نقصان کی بنیاد پر شراکت کرتے ہوئے ان سے انوسٹمنٹ مانگتی ہے۔ اس خالصتاً غیر سودی کاروبار میں لوگوں نے بھی سرمایہ لگایا ہے فنانس کمپنیاں بھی لگاتی ہیں کیونکہ کمپنی کی ساکھ مضبوط ہے۔ اس کمپنی کی موجودہ مالیت 120 ارب ڈالر ہے جس میں مالک خاندان کا حصہ صرف 2.2 ارب ڈالر ہے۔ اس کمپنی (Tandoku) کی بیلنس شیٹ میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں کہ انہوں نے کسی بینک سے سود پر قرضہ لیا ہو۔ البتہ کمپنی کے پاس اگر انوسٹمنٹ زیادہ آ جائے تو وہ اسے بینک میں رکھتی ہے جس پر اسے سود مل جاتا ہے۔ لیکن یہ پورے کاروبار کا ایک فیصد ہے۔ مختلف فنانس کمپنیاں کار ساز کمپنی کے حصص خریدتی ہیں اور کمپنی کے منافع میں سے حصہ لیتی ہے۔ یہ تو خالصتاً ایک غیر سودی کاروبار ہے۔ اگر کوئی اپنی سود یا کسی اور ناجائز کاروبار سے کمائی رقم یہاں لگاتا ہے تو اس سے کیا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کار ساز کمپنی سودی کاروبار کر رہی ہے۔ مگر کیا کیا جائے سود کی وکالت کرنے والوں کے بارے میں اللہ نے قرآن میں کتنی وضاحت سے ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کر دی ہے۔ تیسرا نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ میں لوگوں کو ڈراتا ہوں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں تو یہ سنت تو انبیاء کی ہے۔ قرآن پاک میں بار بار منکرین کا ذکر ہے جو اللہ سے ڈرانے کا تمسخر اڑاتے تھے اور اسے جھوٹ کا کاروبار کہتے تھے، جیسے موصوف کالم نگار نے مجھے کہا ہے۔ تمام پیغمبر یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کو بس ایک جواب دیتے جو قرآن پاک میں درج ہے۔ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ بتاؤ کب آئے گی وہ گھڑی جس کا وعدہ ہے، ان سے کہہ دو، اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے اور میں تو بس صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں'' (الملک 26) ۔ میں نے اپنے ہر کالم میں لکھا کہ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے لیکن خبردار کرنا ہماری سب کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہ جھوٹ کا کاروبار ہے تو مشرکین مکہ بھی اسے جھوٹ کا کاروبار ہی کہتے تھے اور وہ بھی یہی پوچھتے تھے کہ کب آئے گا وہ عذاب۔ میں ایک کم علم گناہ گار، کم مایہ اور بے وقعت شخص ہوں لیکن میرے اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے سود کے خلاف اس جنگ میں حصہ بننے کی توفیق عطا کی جس کا اعلان اللہ اور اس کے رسول نے کیا ہے۔ جبکہ موصوف کالم نگار جس صف میں کھڑے ہیں ان کے لیے میں صرف ہدایت کی دعا کر سکتا ہوں۔ جو میں دل کی انتہائی گہرائیوں سے کر رہا ہوں۔

KitaabPoint.blogspot.com

کارپوریٹ سرمایہ، بکی ہوئیں جمہورتیں، لائف سٹائل

جنگ، خوف، دہشت، بدامنی، قتل وغارت اور لوٹ مار کے اس عالمی منظر نامے میں کیا کسی کو اندازہ ہے کہ گذشتہ ایک سال قبل یعنی صرف 2013 میں ارب پتی افراد میں 210 افراد کا اضافہ ہوا اور یوں ان کی کل تعداد ایک ہزار چار سو چھبیس (1,426) ہوگئی ہے۔ جن کی مجموعی دولت پانچ ہزار چا سو ارب ڈالر ہے۔ یہ تمام ارب پتی ڈالروں کے ارب پتی ہیں جو عالمی سطح پر نظر آتے ہیں۔ ارب پتیوں کی یہ تفصیل ہر سال Forbes میگزین میں شائع ہوتی ہے۔ یہ اعداد و شمار بھی 2013 کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون (billionaires list Inside 2013) میں دیئے گئے ہیں جسے L.K.Roll نے تحریر کیا ہے۔ 2014 کے بارے میں ابھی تک رپورٹ آنا باقی ہے۔ یہ ارب پتی افراد ہر دوسرے دن کسی نہ کسی فیشن میگزین، ٹی وی کے ٹاک شو یا کسی دوسرے ایسے میڈیا کے واسطے سے نمایاں ہوتے رہتے ہیں اور ان کے خوبصورت اور متمول لائف سٹائل کے بارے میں گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کے خیراتی کاموں کو بھی دنیا بھر کا میڈیا یوں اچھال کر پیش کرتا ہے جیسے یہ ان کے خون پسینے کی کمائی تھی جو انہوں نے عوام پر لٹادی۔ لوٹ مار کی کمائی کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کر کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کا تصور صدیوں سے عام ہے۔ ایسے ڈاکوؤں کو لوگ بہت پسند کرتے تھے جو امیروں کو لوٹتے اور غریبوں میں تقسیم کرتے۔ برصغیر پاک و ہند کا کردار سلطانہ ڈاکو اسی کی ایک مثال ہے۔ لیکن موجودہ دور کے کارپوریٹ کلچر کے نمائندہ افراد کا کمال یہ ہے کہ وہ پوری دنیا میں غربت، بھوک، بیماری، افلاس اور بے روزگاری کے ذمہ دار ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مصنوعات کے ذریعے انہی مفلوک الحال لوگوں کو لوٹ کر اپنے خزانے بھرتے ہیں، امیر سے امیر ترین ہوتے ہیں اور اگر کوئی ان سرمایہ داروں میں سے غریبوں سے لوٹی ہوئی دولت کا کچھ حصہ خیرات پر خرچ کر دے تو وہ عظیم ترین انسان کہلاتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو کم از کم امیروں کو لوٹ کر غریبوں پر خرچ کرتا تھا، غریبوں کو لوٹ کر، انہی کا مال انہیں کو خیرات کر کے عزت نہیں کماتا تھا۔

دولت کمانے کی یہ دوڑ اب اس قدر خوفناک ہوتی جارہی ہے کہ دنیا بھر کے ایک فیصد امیر افراد کے پاس اس وقت ایک سو دس ہزار ارب ڈالر کا سرمایہ ہے جو دنیا کے پچاس فیصد غریب ترین افراد کے کل سرمایہ سے پینسٹھ گنا زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں 2008 میں مالی بحران آیا۔ عام آدمی جس نے بینکوں میں اپنی بچت رکھی ہوئی تھی، یا جائیداد خرید کر سرمایہ کاری کی تھی وہ لٹ گیا لیکن اس ایک فیصد سرمایہ داروں کے منافع میں حیران کن اضافہ ہوتا رہا۔ کارپوریٹ منافع بڑھتا رہا، ان کے سربراہوں (CEOs) کی تنخواہوں میں ہوشربا اضافہ ہوتا رہا اور سٹاک ایکسچینج کا حال یہ ہے کہ Dow Jones، 117 سال کی تاریخ میں سب سے زیادہ بلندیوں پر جا پہنچا۔ یہ وہ چند لوگ ہیں جن کی دولت اکثر حکومتوں کے کل سرمائے سے بھی زیادہ ہے۔ جولائی 2013 کے (Bloomberg) کے مطابق پوری یورپی یونین کے دس امیر ترین افراد کی دولت یورپی یونین کے تمام ممالک نے جو سرمایہ معاشی بحالی کے لیے خرچ کیا اس سے زیادہ ہے۔ ان دس افراد کے پاس دو سو سترہ ارب یورو تھے جب کہ یورپی یونین کے تمام ممالک اپنی معاشی بحالی کے لیے صرف 200 سو ارب یورو نکال سکے۔ OXFAM کی وہ مشہور رپورٹ (Workingforthefew) حیران حقائق بیان کرتی ہے۔ (1) دنیا کی آدھی دولت صرف ایک فیصد لوگوں کے پاس ہے۔ (2) ان ایک فیصد افراد کے پاس 110 ہزار ارب ڈالر ہیں۔ (3) دنیا کے 85 فیصد غریب افراد کی کل دولت 110 ہزار ارب ڈالر سے بھی کم ہے۔ گذشتہ 30 سال سے جن ملکوں میں غریب اور امیر کا فرق بڑھا ہے، ایسے ملکوں میں دنیا کے ستر فیصد افراد رہتے ہیں۔ یعنی غریب ملکوں میں چند لوگوں کو امیر بنانے کا عمل زیادہ تیز ہوا ہے۔

دنیا کے ان ایک فیصد امیر افراد نے دنیا بھر میں ایک ایسا جمہوری نظام دنیا پر مسلط کر رکھا ہے جسے ان تمام افراد نے خریدا ہوا ہے۔ یہ سرمایہ دار سیاست دان نہیں بلکہ پارٹی فنڈنگ کے ذریعے پوری کی پوری پارٹی خرید لیتے ہیں اور پھر پارٹی وفاداری کو جمہوریت کی معراج سمجھا جاتا ہے ہر کوئی بکی ہوئی پارٹی کی پالیسیوں کا پابند ہوتا ہے۔ آکس فیم کی یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ 1930 کے معاشی بحران کے بعد ان تمام افراد نے جو صرف ایک فیصد ہیں، ہر ملک کی سیاسی پارٹیوں کی پالیسیوں کو اپنی دولت سے خریدا ہوا ہے۔ یہ پالیسیاں ان پارٹیوں کے منشور کا حصہ بنتی ہیں اور نافذ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام ممالک میں مزدور کی تنخواہ کی اوسط چیونٹی سے بھی کم رفتار سے بڑھائی جاتی ہے۔ جہاں سستا مزدور ملے، وہاں فیکٹریاں لے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر بڑے سرمایہ دار کو چھوٹے ملکوں میں کارخانے لگا کر ان کی دولت اپنے ملک میں لے جانے کا اختیار ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں قانون ایسے بنائے جاتے جن سے (CorporatetaxLoopholes) یعنی ٹیکس چوری کرنے کے آسان راستے نکل سکیں۔ یہی سرمایہ دار ایک غیر فطری معاشی بحران پیدا کرتے ہیں اور پھر حکومتیں بچت کی طرف چل پڑتی ہیں اور یہ بچت صحت، تعلیم، صاف پانی اور دیگر سہولیات میں ہی ہوتی ہے۔ آکس فیم کی یہ رپورٹ بھارت کی مثال دیتی ہے جو اس بدترین سرمایہ داری کی غلیظ ترین شکل ہے۔ جہاں ایک ارب بیس کروڑ آبادی کے ملک میں صرف ایک درجن افراد کے پاس 250 ارب ڈالر کی دولت ہے اور باقی تمام بھارت ایک بہت بڑی جھونپڑپٹی ہے، اور ساتھ ہی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھی، جو اپنی جی ڈی پی کا صرف ایک فیصد صحت پر خرچ کرتی ہے۔ یہ سرمایہ دار جنہوں نے بھارت کی جمہوری پارٹیوں کو خریدا ہوا انہوں نے 1985 میں موروثی ٹیکس ختم کروایا، 1993 میں ویلتھ ٹیکس کو نہ ہونے کے برابر کروایا اور اب وہاں براہِ راست ٹیکس صرف 37.7 فیصد ہیں، باقی سب غرباء کی جیب سے وصول ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں ان سرمایہ داروں نے جمہوری اداروں سے معاشی رازداری کے قوانین منظور کروا رکھے ہیں۔ کسی کے بینک اکاؤنٹ، بیرون ملک دولت اور دیگر سرمایہ کے ادھر ادھر کرنے کو خفیہ رکھنے کے قانون منظور ہیں۔ آف شور (Offshore) کمپنیاں جن پر کسی ملک کا قانون لاگو نہیں ہوتا وہاں صرف امریکی سرمایہ داروں کے 19 ہزار ارب ڈالر پڑے ہیں۔ زیمبیا وہ ملک ہے جہاں سے سرمایہ دار کمپنیاں سالانہ دس ارب ڈالر کا تانبہ لے کر جاتی ہیں لیکن اس ملک کو اس کے صرف چوبیس کروڑ روپے ملتے ہیں، اور اس ملک میں 69 فیصد لوگ ایسے ہیں جن کی آمدن ایک ڈالر روزانہ سے بھی کم ہے۔

یہ تمام کارپوریٹ سرمایہ دار دو طریقوں سے لوٹ مار کو مستحکم کرتے ہیں، ایک پوری کی پوری جمہوریت کو خرید کر۔ اس سے لوگوں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ تو تمہاری اپنی منتخب کردہ حکومت ہے۔ آمریت ہو تو لوگ احتجاج بھی کریں۔ جمہوریت اور جمہوری حکمران تو عوام کے نمائندہ ہیں، ان کے ذریعے لوٹنا کس قدر آسان اور خوبصورت ہے۔ دوسرا میڈیا کے ذریعے ایک لائف سٹائل کو جنم دے کر لوگوں کو اپنی مصنوعات کا عادی کرنا تاکہ سرمایہ غریب آدمی کی جیب سے نکل کر ان تک چلا آئے۔

یہ لائف سٹائل میڈیا کے ذریعے لوگوں کے ذہن میں راسخ کیا جاتا ہے۔ آپ اپنی 25 سال پرانی شاپنگ لسٹ نکالیں، اب پچاس فیصد سے زیادہ اشیاء خریدتے تک نہیں تھے۔ میڈیا پوری دنیا کو ایک لائف سٹائل کا غلام بناتا ہے۔ جس سے اربوں ڈالر کی انڈسٹری چلتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دیکھیں، دنیا بھر کے ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ مسواک ٹوتھ پیسٹ سے بہتر ہے کیوں کہ ٹوتھ برش میں جراثیم کی ایک (Repository) یعنی ذخیرہ جمع ہوتا ہے لیکن لائف سٹائل کی بات ہے کہ میڈیا ٹوتھ پیسٹ ہی استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ بھی کسی غریب ملک کی بنائی ہوئی ٹوتھ پیسٹ نہیں بلکہ ملٹی نیشنل کارپوریشن کی بنی ہوئی۔ کیا ہر ملک اتنی بھی اہلیت نہیں رکھتا کہ ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ بنا سکے۔ یہی حال برگر، پیزا، جوتے اور دیگر اشیاء کا ہے۔ ایک جانب دنیا بھر کے غریب لوگ ہیں جن کو ان اشیاء کا لائف سٹائل کے نام پر عادی کیا جاتا ہے اور پھر ان کی جیب سے سرمایہ ایک فیصد لوگوں کی جیب میں جاتا ہے اور یہ ایک فیصد سرمایہ دار دنیا بھر کی جمہورتیں خرید لیتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

اوریا مقبول جان کا کالم جو چھپ نہ سکا

درندوں کی لڑائی

بہت کم ایسے پروگرام ہیں جن میں ٹیلی ویژن کے اینکر پرسن اور موجودہ دور کے فن اداکاری کے آسمان کے چمکتے ستارے، عام آدمی کو پروگرام کے دوران فون کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ ٹیلیفون بھی پیچھے بیٹھے پروڈیوسروں کے سنسر بورڈ کی چھلنی سے ہو کر گذرتے ہیں، نام، شہر، اگر ممکن ہو تو سوال نہیں تو مقصد تک پوچھا جاتا ہے۔ ایسے میں جس خوش نصیب کی کال مل جاتی ہے وہ سوال کرے، رائے کا اظہار کرے یا پروگرام پر تبصرہ، یہ اس کی مرضی ہے، کہ اس نے ایک لمبے امتحان کے بعد میڈیا کے ان اجارہ داروں سے چند سیکنڈ چھین لئے ہوتے ہیں۔ ایسے ٹیلیفون کرنے والے کی گفتگو، اگر ان اینکر پرسنوں کو ناگوار گذرے تو ان کا لہجہ بدلنے لگتا ہے۔ ماتھے پر تیوریاں چڑھ جاتی ہیں محبت کی جگہ ڈانٹ زبان پر آنے لگتی ہے اور پھر اس کے بعد ایک دم اس کی فون کال یہ کہہ کر کاٹ دی جاتی ہے کہ میں اپنے پروگرام میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا اور پھر جیسے ہی وہ عام انسان ٹیلی ویژن پر جواب دینے کے موجود نہیں ہوتا تو جی بھر کے اس کو ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ یوں تو اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن تازہ ترین مثال ایک ٹیلی ویژن پروگرام جس میں دو مشہور اینکر پرسن آپس میں لڑنے کا منظر پیش کر رہے ہوتے ہیں، وہاں ایک فون کرنے والے شخص نے جمہوریت کے علمبردار سیاسی رہنماؤں کو مافیا کا لقب دیا۔ فون کاٹ دیا گیا اور پھر اس شخص کو پتہ نہیں کس کس کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ یہ دونوں اصحاب عالمی حالات سے باخبر صحافی ہیں۔ انہیں یقیناً خبر ہوگی کہ کتنے مہینے امریکہ اور یورپ کے شہروں میں جمہوریت اور اس کے ''گاڈ فادرز'' کارپوریٹ سسٹم اور بینکنگ کے خلاف مظاہرے ہوئے جو مہینوں چلتے رہے۔ لوگوں نے کتوں کے گلے میں پلے کارڈ ڈال کر اس پر لکھا ''ہم ننانوے فیصد ہیں جن پر ایک فیصد مافیا حکومت کرتا ہے''۔ کسی شخص نے ان کو جمہوری نظام کے لیئے خطرہ قرار نہ دیا، کوئی ان کو خفیہ طاقتوں کا ایجنٹ نہ کہتا رہا۔ کسی نے میڈیا پر ان کو اس طرح نہ دھتکارا جس طرح میرے یہ طاقت کے نشے میں سرشار اینکر پرسن جھاڑتے رہے۔ یہ روز کا معمول ہے۔ لوگ اپنی فریادیں، آہیں، مصیبتیں لے کر ان میڈیا باونسرز کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور پھر جن کو یہ افراد پسند فرمائیں یا پھر جس کی درخواست میں ان کو چاشنی نظر آئے، جہاں وہ کسی مخالف کو زیر کرنا چاہیں، جس میں کسی خاص مکتبہ فکر کا تمسخر اڑانا مقصود ہو، اسے شہ سرخیوں کی زینت بنا دیا جاتا ہے۔

یہ دھتکارے ہوئے لوگ، یہ میڈیا کی طاقت کے نشے سے کچلے ہوئے افراد، مدتوں خاموشی سے اپنے گھروں میں آنسو بہا کر خاموش ہو جاتے تھے، صبر شکر کر لیا کرتے تھے۔ لیکن پھر ان کے ہاتھ میں سوشل میڈیا آ گیا۔ یہ تمام روایات جن پر آج یہ کالم نگار، اینکر پرسن اور میڈیا کے اجارہ دار تیخ پا ہیں اور سوشل میڈیا پر ان کا غصہ تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ان تمام روایات کو جنم دینے والے یہ خود یا ان کے پیش رو ہیں۔ ایک زمانے میں جب صرف پرنٹ میڈیا ہوتا تھا، اس پر 1970 کے الیکشنوں سے پہلے ایک شریف النفس عالم دین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا سر اداکارہ نغمہ کی اس زمانے کے حساب سے فحش تصویر کے دھڑ پر لگایا گیا تھا تو میں نے اس ''کاوش'' پر ان سب کو بغلیں بجاتے دیکھا تھا۔ اس حرکت کے مرتکب آج عظیم ترین صحافیوں کی صف میں ہیں۔ لیکن آج جب سوشل میڈیا پر ان لوگوں کے سر اور دھڑ جوڑے جاتے ہیں تو ان کو اخلاقیات یاد آ جاتی ہیں۔ بھٹو خاندان کی ذات پر گندے ترین کیچڑ بھی انہی عظیم صحافیوں کی فوج ظفر موج نے اچھالے تھے اور پھر اس پر خوشی کے شادیانے بجاتے رہے۔ ایک طویل مدت جب ان کے ہاتھوں میں پرنٹ میڈیا تھا ان کے رپوٹروں، تجزیہ نگاروں اور نامہ نگاروں نے کس کس کی بیٹی، بہو، اور بہن کی عزت نہیں اچھالی۔ نام لینے پر آؤں تو ابکائی آتی ہے۔ گمنام ناموں سے رپورٹیں چھاپی گئیں۔ ایک لفظ ایجاد کیا گیا ''ذرائع'' اور پھر اس لفظ سے جو کھیل کھیلا گیا اس کی دست برد سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ جن لوگوں نے ''ذرائع'' اور ''خفیہ رپورٹوں'' اور ''گمنامی'' کے لفظ سے اس ملک کے عوام کو یرغمال بنائے رکھا آج اگر سوشل میڈیا پر ایک ٹوٹے پھوٹے کمپیوٹر کے پیچھے بیٹھا ایک گمنام شخص ان کی عزتوں سے کھیلتا ہے تو یہ لوگ تیخ پا ہیں۔ لیکن یہ سب تو آپ ہی نے ان لوگوں کو سکھایا ہے۔ یہ سارے گر تو آپ نے ان کو ازبر کروائے ہیں۔ کسی کی عزت اچھالنے کے بعد ایک چھوٹی سی ''معذرت'' یا ''اعتذار'' نام کی ایک خبر چھاپ کر بری الذمہ ہونے کی روایت تو آپ نے ڈالی ہے۔ آپ پر جب کوئی اخلاقی کنٹرول کی بات کرتا تو آپ اسے میڈیا کی آزادی پر حملہ قرار دیتے اور آج آپ ان دھتکارے ہوئے، آپ کے ستائے ہوئے لوگوں کے غصے کو کنٹرول کرنے کے لیئے کالم تحریر کر رہے۔ حکومت کو ان کو لگام دینے کا مشورہ دے رہے ہیں آپ کو لوگوں کی عزت نفس اور جذبات یاد آ رہے ہیں۔

یہ لوگ جنہیں سوشل میڈیا میسر آیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو آپ کی جانبداریوں اور میڈیا پر آپ کی اجارہ داریوں کے ستائے ہوئے لوگ ہیں۔ جب آپ سوات میں لڑکی پر کوڑوں والی وڈیو کئی مہینے چلائیں گے اور داڑھی والے شخص کی اس وڈیو کو نہیں چلائیں گے جسے سکورٹی فورسز بے دردی سے پیٹ رہی ہوتی ہیں اور وہ اللہ کے واسطے دے رہا ہوتا ہے۔ جب آپ مون مارکیٹ لاہور کے بم دھماکے میں مرنے والوں اور زخمی افراد کو بار بار ٹی وی پر دکھائیں اور ڈرون حملوں میں مرنے والوں اور بلوچستان میں ویرانوں میں پڑی مسخ شدہ لاشوں کی تصویریں نہیں دکھائیں گے تو یہ سب سوشل میڈیا پر نظر آئے گا اور نظر آ بھی رہا ہے۔ لیکن جو شخص یہ سب کچھ سوشل میڈیا پر بھیجتا ہے وہ آپ سے بھی، آپ کی جانب داری سے بھی شدید نفرت کرتا ہے۔ اس کا غصہ اسی طرح نکلتا ہے جیسے آپ کے بڑوں نے مولانا مودودی کی تصویر نغمہ کے دھڑ پر لگا کر اور انہیں مولانا انورا کا لقب دے کر نکالا تھا (انورا وہ فلم تھی جس سے نغمہ کی یہ تصویر لی گئی تھی)۔ وہ آپ لوگوں کا شاگرد رشید ہے۔ جیسے آپ ایک مخصوص گروہ اور نظریے کی ترجمانی کرتے ہو اور اسے اپنی رائے کہتے ہو۔ اور ایک خوبصورت لفظ ایجاد کرتے ہو ''**Opinion Journalism**'' ویسے ہی سوشل میڈیا نے یہ اختیار خود حاصل کر لیا ہے۔ وہ آپ کی اجارہ داری، ٹھیکیداری اور جاگیرداری میں گھس آیا ہے۔ آپ کی تڑپ بے جا نہیں۔ مجھے خان عبدالولی خان یاد آ گئے۔ ایک دفعہ وہ لاہور میں پھٹ پڑے، قصور گردیزی ان کے ساتھ بیٹھے تھے، کہنے لگے یہ سب بیان جو میرے نام سے اس نظریہ پاکستان کے علمبردار اخبار میں شائع ہوئے ہیں، میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں یہ میں نے دیئے ہی نہیں۔ وہ چند لوگوں کے سامنے اپنا رونا روتے رہے، کسی نے ان کا رونا نہیں چھاپا۔ اسی طرح اس قوم کے مظلوم عوام آپ کی اجارہ داری کا رونا اپنے گھروں میں بیٹھے روتے رہے، آج ان کے گھر میں ہی ایک چھوٹا سا کمپیوٹر ان کو میسر آ گیا ہے۔ جہاں وہ آپ کے سکھائے ہوئے ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہاں ان کا فون کوئی بند نہیں کر سکتا، انہیں جھاڑ کوئی نہیں پلا سکتا، ان کی عزت کوئی نہیں اچھال سکتا۔ آپ اپنے میدان میں شیر ہو، وہ اپنے میدان میں۔ وہ دو درندوں کی لڑائی میں انسانوں کا ہی فائدہ ہی ہوتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

دو میدانِ جنگ

تینوں ابراہیمی مذاہب کے ماننے والے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس دنیا کے خاتمے سے پہلے ایک انتہائی خونریز جنگ برپا ہوگی اور اس کے بعد اللہ ایک ایسی حکومت قائم کردے گا جو دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دے گی۔ تینوں اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس جنگ میں فتح کا سہرا کسی مسیحا کے ماتھے پر سجے گا۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کے لوٹ آنے پر ذرا مختلف انداز میں یقین رکھتے ہیں جبکہ مسلمانوں کے ہاں ایک امیر، خلیفہ یا رہنما یا امام کی صورت میں مہدی کا ظہور ہے جو مسیح دجال سے جنگ کرے گا۔ دجال کا مطلب جھوٹا ہوتا ہے اور مسلمان احادیث کی روشنی میں یہ تصور بھی رکھتے ہیں کہ اس جھوٹے مسیح یعنی دجال سے آخری جنگ کے لیے اللہ حضرت عیسیٰ کو دوبارہ دنیا میں نازل فرمائے گا۔ جبکہ یہودیوں کے مسیحا کا تصور ان کی روایات کے مطابق ایک ایسے شخص کا ہے جسے اللہ دوبارہ اس دنیا میں یہودی عالمی سلطنت کے قیام کے لیے بھیجے گا۔ تینوں مذاہب ایک خوفناک جنگ کی تیاریوں میں مدتوں سے مصروف ہیں۔ لیکن ان میں دو مذاہب عیسایت اور یہودیت کے نزدیک میدانِ جنگ، بیت المقدس، یروشلم یا بیت اللحم اور اس کے گردو نواح کے علاقے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے نزدیک میدانِ جنگ دو ہیں۔ ایک یروشلم کے اردگرد شام، لبنان، اردن اور عراق جبکہ دوسرا میدانِ جنگ ہندوستان ہے۔ یہ دونوں ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوگے۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے ایک لشکر ضرور ہند پر حملہ کرے گا۔ جس کو اللہ فتح دے گا۔ یہ لشکر ہند کے حکمرانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائے گا۔ اللہ اس لشکر کے گناہ معاف کردے گا۔ پھر جب یہ لوگ واپس لوٹیں گے تو شام میں عیسیٰ ابن مریم کو پائیں گے۔ (الفتن۔ نعیم بن حماد)۔ یہ حدیث دونوں جنگوں کا ایک ہی زمانے اور وقت میں ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ ان دونوں جنگوں کے میدان میں لڑنے والوں کے لیے بشارتیں بھی کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ "حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت کی دو جماعتوں کو اللہ نے جہنم کی آگ سے محفوظ فرمایا ہے "ایک وہ جماعت جو ہندوستان سے جنگ کرے گی اور دوسری وہ جماعت جو عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہوگی۔ (نسائی۔ کتاب الجہاد، مسند احمد)۔

اس مقدس جنگ کا سب سے پہلے آغاز پوپ اربن دوم نے 25 نومبر 1095ء کو کونسل آف کلیر مونٹ میں اپنی تقریر سے کیا۔ اس نے انتہائی جوشیلے انداز میں اعلان کیا کہ مسلمان ایک وحشی قوم ہے اور ان کو قتل کرنا ایک مقدس مذہبی فریضہ ہے۔ یروشلم کو کافروں سے آزاد کرانا اور ایشائے کوچک کو اس "گند" سے صاف کرنا ہم پر فرض ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ یسوع کا مزار مسلمانوں کے قبضے میں ہے"۔ اس کے صرف چھ ماہ بعد 1096ء کے موسم بہار میں ساٹھ ہزار فوجیوں کے پانچ لشکر مسلمانوں سے جنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ایسے لگتا تھا پورا یورپ مسلمانوں سے جنگ کے لیے نکل کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد کی کئی صدیاں کشت وخون کی صدیاں ہیں۔ لیکن پوپ اربن کی تقریر کا ایک اور حصہ بہت عجیب ہے۔ اس نے یورپ کے تمام عیسائیوں کو پکارتے ہوئے کہا کہ "اگر باہر کا کوئی شخص تمہارے کسی رشتے دار کو قتل کردے تو کیا تم اس کا انتقام نہیں لو گے۔ کیا تم اپنے خداوند، اپنے مصلوب یسوع کا انتقام نہیں لو گے"۔ اس کی نیت یہودیوں پر حملہ کرنے کی نہیں تھی، لیکن اس سے پہلے کہ یورپ کے مسلمانوں کے لیے لشکر ترتیب دیتے وہ اپنے اندر بسنے والے یہودیوں پر ٹوٹ پڑے۔ صلیبی جنگجوؤں نے یہودیوں کا قتل عام کیا، سینا گوگوں کو مسمار کیا، تورات کے نسخوں کو جلایا اور انہیں ڈرایا کہ یا تو عیسایت قبول کر لو، یا پھر موت قبول کر لو۔ ایسے میں پوپ کے کہنے پر بیشتر بشپوں نے یہودیوں کو گرجا گھروں میں پناہ دی۔ لیکن یہ حربے کچھ دیر تک ہی کامیاب رہے، پھر صلیبی جنگوں کے خاتمے پر پوپ نے سولہویں صدی میں یورپ میں یہودیوں کی نسل کشی کی حمایت کردی۔ اس کے بعد کی تین چار صدیاں ایسی گزریں کہ یہودی کبھی ایک شہر سے نکالے جاتے اور کبھی دوسرے سے۔ ہر عیسائی اپنی تقریروں اور تحریروں میں سپین میں ازابیلا اور فرڈینیڈ کی جنگ کا حوالہ دیتا۔ وہ اس معرکے کو عیسائی غلبے کی علامت سمجھتے، جس کے نتیجے میں سپین کو مسلمانوں اور یہودیوں، دونوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ لیکن یورپ میں چرچ کے اقتدار نے جو مظالم عام آدمی پر ڈھائے، اور جس کے طرح ان کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے ہی لوگوں کو کافر کہہ کر زندہ آگ میں جلایا، اس سے ایک ایسی نفرت پھوٹی جس نے مسیحی چرچ کے اقتدار کو زمین بوس کر دیا۔ انقلاب فرانس کے بعد ان کا اقتدار گرجا گھروں تک محدود ہو گیا۔ ایسے میں یہودی اپنی اس مقدس جنگ کو یاد کرنے لگے جو انہیں ارضِ مقدسہ واپس دلائے گی اور وہاں ان کی حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسی عالمی حکومت قائم ہوگی۔ صیہونیت ایک نظریہ بن کر ابھری اور اس نے جلد ہی پوری یہودی قوم کو جذباتی طور پر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ باقی اقوام کو یہودی دانشوروں اور مفکروں نے سیکولر نظریات کی بنیاد پر رنگ، نسل، زبان اور علاقے میں ایسا الجھایا کہ وہ جو کبھی مسلمانوں اور یہودیوں کو قتل کر کے ان سے اس دنیا کو پاک صاف کرنے کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے آپس میں اس طرح لڑے کہ جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم میں کروڑوں لوگوں کا خون بہا کر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اس دوران معیشت اور میڈیا پر قابض یہودیوں کو ارض مقدس کی جنگ یاد آئی اور وہ آہستہ آہستہ وہاں جا کر آباد ہونے لگے: ان کا یورپ کے مسیحیوں سے ایسا گٹھ جوڑ ہوا کہ سب نے مل کر انہیں ایک ریاست تحفے میں دے دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کی سرزمین پر ایسی لکیریں بھی کھینچیں کہ وہ 51 ریاستوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ ان ریاستوں کی سرحدوں کو محترم اور مقدس بنا دیا گیا تاکہ یہ کبھی ایک ملت کی صورت اکٹھے نہ ہو سکیں

۔

تینوں مذاہب آج بھی اس آخری جنگ کا انتظار کر رہے ہیں اور تیاری بھی۔ تقریباً 919 سال قبل جس آخری جنگ کی طرف پیش قدمی کا اعلان پوپ اربن نے کیا تھا اور 118 سال قبل جس عالمی ریاست کے قیام کے لیے ہزال نے دنیا بھر کے یہودیوں کو اکٹھا کر کے مشہور عالم پروٹوکولز تحریر کیے تھے، اب یوں لگتا ہے اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دوران مسلمانوں کے مرکز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنگ عظیم میں مسلمانوں کا خیمہ شام کے شہروں میں سب سے اچھے شہر دمشق کے قریب "الغوطہ" کے مقام پر ہوگا (سنن ابوداؤد، مستدرک)۔ اس ہیڈکوارٹر پر فاتح مسلمان خراسان سے آئیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب کالے جھنڈے مشرق سے نکلیں گے تو ان کو کوئی چیز نہیں روک سکے گی حتیٰ کہ وہ ایلیا (بیت المقدس میں نصب کر دیئے جائے گے (مسند احمد)۔ یہ جنگ تو برپا ہو چکی، اور اس کے لئے دنیا بھر سے لوگ وہاں پہنچ رہے ہیں۔ لیکن سب حیران ہیں کہ ایسے وقت میں جب افغانستان اور پاکستان کے وہ علاقے جو خراسان کہلاتے ہیں، وہاں سے لوگ اس آخری جنگ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ ادھر پورا یورپ اور امریکہ ان کے خلاف متحد ہو رہا ہے اور بقول باراک اوباما، اس جنگ میں فتح بہت مشکل ہے، ہو سکتا ہے ہمیں تیس سال لگ جائیں۔ ایسے ماحول میں بھارت پاکستان کی سرحدوں پر حملہ آور کیوں ہے۔ یہ ہے وہ دوسرا میدانِ جنگ جس کی ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ نریندر مودی کی اٹھان بالکل ویسی ہی ہے جیسے جرمنی میں ہٹلر کی ہوئی تھی۔ جمہوری طور پر منتخب، نسلی تعصب کا علمبردار اور پڑوسی اقوام کو ختم کرنے کا عزم لیے ہوئے۔ ہٹلر کے اس جنون کی قیمت جرمنی کو بھگتنا پڑی تھی اور نریندر مودی کے جنون کی قیمت بھارت بھگتے گا۔ اس لیے کہ میرا ایمان ہے اور میرے ایمان کی وجہ ہے کہ اس جنگ میں فتح کی بشارت میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ مجھے حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جو دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی تمام اقوام ان سے لڑنے کے لیے پر تول رہی ہیں، ان پر حملہ آور بھی ہیں، اور یہ سب وہ اپنی الہامی کتابوں کی روایتوں پر یقین کر کے ایک ہزار سال سے کر رہی ہیں۔ ایسے میں ہم عزت کی زندگی نہیں ذلت کی موت چاہتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

حرفِ راز

اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

دوقومی نظریے پر قائم ہونے والا ایک اور ملک

رمضان کا مہینہ تھا، میں وطن سے دور ایک ایسے شہر میں تھا جہاں شام ہوتے ہی قحبہ گری کے بازار کھل جاتے، رقص و سرود کی محفلیں سج جاتیں اور ہر جانب دنیا بھر کے امیر اور عیاش سیاح، کم سن لڑکیوں کو ساتھ لئے گھومتے نظر آتے۔ یہ منظر تھا منیلا کا۔ میں 1999ء میں رمضان کے آخری عشرے میں وہاں پہنچا۔ ایشیائی ترقیاتی بنک میں امریکہ کی ریاست ایری زونا کے نومسلم ڈیوڈ بوگس کے گھر پہلی افطاری کی اور پھر میرے وہاں آنے کی خبر شہر میں موجود تھوڑے سے مسلمان گھرانوں تک جا پہنچی۔ مہمان کا روزہ کھلوانا ان کے نزدیک بہت بڑی عبادت سمجھا جاتا ہے۔ یوں میری ہر سحری اور افطاری کا بصد شوق اہتمام ہونے لگا۔ افطاری کے بعد مغرب کی نماز ہوتی۔ ان کے ہاں ایک روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ امام کے مصلّے پر مہمان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے اور سب اس کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہیں۔ نہ کسی فرقے کی پروا اور نہ کسی مسلک کا اختلاف۔ فلپائن کی سرزمین پر 1380 عیسوی میں کریم المخدوم نے قدم رکھا۔ وہ ایک عرب تاجر تھا۔ اس کے کردار اور حسنِ سلوک سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کرنے لگے۔ یوں مندناؤ کے علاقے میں پہلی مسجد بنائی گئی جسے شیخ کریم المخدوم مسجد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے مسلمان تاجر، علما اور صوفیا وہاں آنا شروع ہوئے اور شریف محمد کبنگوسوان کی قیادت میں وہاں اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔ یہ ریاست مدتوں قائم رہی۔ سیمولی، مندناؤ اور سولو کے جزائر بھی اس کے زیر اثر آ گئے۔ پندھوریں اور سولہویں صدی عیسوی تک اسلام کی کرنیں فلپائن کے طول و عرض میں پھیلنے لگیں۔ 1565ء میں چند مسلمانوں کی منیلا آمد کی برکت سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چونکہ اس علاقے میں سپین کے رومن کیتھولک حکمران 1541ء میں قبضہ جما چکے تھے اس لئے انہوں نے مسلمانوں پر سخت تشدد کیا اور انہیں منیلا سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد فلپائن کی تاریخ بدترین غلامی کی تاریخ ہے۔ ایک ایسی غلامی جس میں تشدد، قتل و غارت، آبروریزی اور نسل کشی تک سب کچھ ملتا ہے۔ دنیا اس قتل و غارت کی تاریخ بہت کم بیان کرتی ہے۔ لیکن فلپائن کے عظیم شاعر، ناول نگار اور فلسفی رزال (RAZAL) کی کتابیں ایک ایک ظلم کی گواہی دیتی ہیں۔ سمندر کے کنارے موجود جیل خانے میں جب میں داخل ہوا تو تنگ و تاریک راستہ اس زیر زمین کوٹھری کی طرف لے کر جاتا تھا، جس میں اس شخص کے کئی سال گزرے اور اس نے اپنی مشہور تحریر (NOLI ME TANGERE) صفحہ قرطاس پر منتقل کی۔ اس کی والدہ کو روزانہ کھانا لانے کی اجازت تھی۔ وہ رات کو کوٹھری میں روشنی کے لیے ایک لیمپ میں تیل ڈال کر لاتی۔ ماں نے اس لیمپ کے اندر ایک خانہ سا بنا رکھا تھا جس میں چند کاغذات اور قلم دوات رکھ دیتی۔ رزال ساری رات لکھتا اور لیمپ میں رکھ کر واپس کر دیتا۔ ماں دوسرا لیمپ لاتی اور پہلے والا لے جاتی۔ یوں اُس کی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ جیل خانے کے باہر ایک سٹال سے میں نے وہ کتاب خریدی اور پھر اپنے ہوٹل کے راستے، لفٹ اور دروازہ کھولنے تک میں اس کتاب سے نظر نہ ہٹا سکا۔ اندھوں کی طرح تالا کھولا اور کتاب میں غرق ہوگیا۔ کتاب کیا ہے، ہسپانوی عیسائیوں کے ظلم و تشدد کا ایک ہیبت ناک باب جسے پڑھ کر غرناطہ کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ آج منیلا میں آپ کو ہر سڑک اور گلی کا نام کسی عیسائی راہب یا سینٹ (Saint) کے نام پر ملے گا۔ یہ نام اور عیسائیت کا غلبہ لاکھوں فلپائنی عوام کو قتل کر کے اور بدترین تشدد سے حاصل کیا گیا۔ لیکن دوسری جانب مندناؤ کے دور دراز علاقوں میں مسلمان، سپین کے ان ظالم حکمرانوں سے علیحدہ رہ کر اپنے مذہب کی اساس کو بچانے میں مصروف رہے۔ مسلمانوں کو فلپائن میں ''مورو'' کہا جاتا ہے۔ آج کے دور کا سیکولر میڈیا بھی انہیں مورو قبائل لکھتا ہے تاکہ معلوم نہ ہو سکے کہ کبھی اس ملک میں مسلمانوں نے جدوجہدِ آزادی کی داستان رقم کی تھی۔ ان کا نام ''مورو'' ہسپانوی حکمرانوں نے رکھا، اس لیے کہ وہ سپین میں حکومت کرنے والے مسلمانوں کو MOORS کہتے تھے اور آج بھی مغرب کی تمام تحریروں میں انہیں اسی نام سے لکھا جاتا ہے، تاکہ کہیں اسلام کی درخشاں تاریخ سے لوگ واقف نہ ہو جائیں۔ تین سو سالہ ہسپانوی اقتدار کے بعد برطانیہ اور سپین کی قبضے کی جنگ شروع ہوئی اور پھر 1898ء میں امریکہ فلپائن کے عوام کو سپین سے آزادی دلانے کے لیے آیا۔ امریکہ جس ملک میں بھی گیا اُس ملک کو ایک قحبہ خانے میں تبدیل کر دیا۔ امریکی فوج کی ایک پوری یونٹ فلپائن کے مختلف علاقوں سے کمسن بچیوں کو لے کر آتی اور منیلا کے بازاروں میں فوجیوں کے تعیش کے لیے لا بٹھاتی۔ آج مکاتی، پاسک اور میٹرو منیلا میں سر شام گناہ کی یہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

اس شہر میں رمضان گزارنا میرے لیے عجیب تجربہ تھا، اس ماحول میں فلپائن کے مسلمانوں کے حسنِ سلوک میں وہ جادو تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ سب لوگ اپنے علاقے کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ جو چند منیلا میں موجود تھے وہ چھپتے پھرتے تھے۔ نماز تک گھروں میں ادا کرتے۔ ان میں سے ایک ایسے شخص سے میری بھی ملاقات ہوئی جو مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے قائدین میں سے تھا اور ان دنوں فلپائن کی حکومت خفیہ طور پر جن سے مذاکرات کر رہی تھی، وہ ان میں شامل تھا۔ زخموں سے بھرا ہوا اُس کا جسم لیکن بے داغ روح۔ مورو لبریشن فرنٹ 1977ء میں قائم ہوا جسے وہاں کے عالم دین ہاشم سلامت کی سربراہی میسر آئی۔ اسلام کے اس مجاہد نے پوری دنیا میں فلپائن کے مظلوم مسلمانوں کا مقدمہ لڑنے کے لیے سفر شروع کیا۔ وہ مملکت خداداد پاکستان بھی آئے۔ دوقومی نظریے پر بننے والے پاکستان میں اس مجاہد کی آمد خبر نہ بن سکی۔ صرف جماعت اسلامی کے چند کارکنان اس کی بصیرت سے مستفید ہو سکے۔ 1977ء میں آزادی کی اس جدوجہد کا آغاز ہوا اور عالمی برادری نے اپنی طاقت ان مسلمانوں کو کچلنے پر لگا دی۔ الزامات وہی جو آج کا سکہ رائج الوقت ہیں۔ یہ دہشت گرد ہیں، ظالم ہیں، لوگوں کا چین اور سکون چھیننا چاہتے ہیں، قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ یہ سب القاعدہ کے ساتھی ہیں۔ ابوسیاف گروپ کا نام اقوام متحدہ تک گونجا۔ لیکن فلپائن کی حکومت کو علم تھا کہ یہ عالمی غنڈے اس خطے کے وسائل پر قبضہ کرنے کی چال چل رہے ہیں۔ حکمران باغیرت تھے اور وہاں کے لکھنے والے بھی بکے ہوئے نہیں تھے جو 35 سال کی اس جدوجہد کو القاعدہ کہہ کر جھوٹ کے زور پر اسے شکست دیتے۔ اس سیاسی اور مسلح جدوجہد میں ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ ان کی یہ قربانی تھی کہ 12 اکتوبر 2012ء کو مورو اسلامک لبریشن فرنٹ اور فلپائن کی حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت مسلمانوں کے پانچ صوبوں کے علاقے باسلان، کوٹاباٹو، دواؤ ڈیل سور، سلطان قدرت، تاوی، سولو، داوی، دیولوگ، اور وتیان پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے گی۔ اس اسلامی سلطنت کا نام ''بنگسا مورو'' رکھا گیا ہے بنگسا فلپائنی زبان میں گھر کو کہتے ہیں اور مورو مسلمانوں کو۔ یوں اس ملک اس کا نام ''مسلمانوں کا گھر'' ہوگا۔

دنیا کے نقشے پر ایک اور ملک ابھر رہا ہے جس کی بنیاد دوقومی نظریہ ہے۔ ان مسلمانوں میں کوئی عرب، عراقی یا ایرانی نہیں، سب وہاں کے رہنے والے ہیں۔ انہیں کسی بابر، غزنوی یا غوری کی فتوحات کے نتیجے میں اسلام کی نعمت نہیں ملی بلکہ چند مسلمان تاجروں نے ان تک اپنے کردار کی عظمت سے دین پہنچایا۔ لیکن کمال ہے کہ یہ لوگ جو پرامن راستے سے مسلمان ہوئے انہیں اسلام کی بقا اور آزادی کے لیے جہاد بھی کرنا پڑا اور ایک لاکھ بیس ہزار شہداء کے خون کا نذرانہ بھی دینا پڑا۔ ایک اور صبح کا آغاز۔ دنیا کی وہ ازلی تقسیم جو میرے اللہ نے قائم کی ہے کہ اس دنیا میں صرف دو گروہ ہیں۔ ایک حزب اللہ (اللہ کے دھڑے کے لوگ) اور حزب الشیاطین (شیاطین کے دھڑے کے لوگ)...... ایک بار پھر اس دوقومی نظریے کا اعلان ایک مسلم قوم اپنے خون سے تحریر کرنے جا رہی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جا

یہ قوم بھی کس قدر بد قسمت ہے کہ یہاں قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے گزشتہ چند سالوں سے وہ لوگ مل کر بیٹھ رہے ہیں جن کے لئے زندہ رہنے کا جواز ہی قومی اختلاف رائے ہے۔ جن کی سیاست کی آبیاری ہی اختلاف سے ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے آل پارٹیز کانفرنس نہیں بلکہ کوئی بہت بڑا سیمینار' ورکشاپ یا کانفرنس ختم ہوئی ہے۔ جس طرح ایسے تمام سیمیناروں' ورکشاپوں یا کانفرنسوں کے آخر میں ایک ورکنگ گروپ بنا دیا جاتا ہے جو چند گھنٹے بیٹھ کر سفارشات مرتب کرتا ہے اور پھر ایسی ناقابل عمل اور دور از کار قسم کی سفارشات کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ جیسے آبادی کے مسئلے پر کانفرنس ہو تو پہلی سفارش یہ ہوتی ہے کہ "پاکستان کی آبادی کم کرنے کے لئے عملی اقدام کیے جائیں"۔ یہ عملی اقدام بھی کیا خوبصورت لفظ ہے جو ہمارے حکمرانوں' دانشوروں اور ارباب حل و عقد نے ایجاد کیا ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو مسائل کے حل کے لئے منعقد آل پارٹیز کانفرنس یا پھر اس جیسے اجلاسوں' سیمیناروں وغیرہ نے ایجاد کر لیے ہیں' جیسے "ٹھوس سفارشات" "فوری سدباب" "تمام توانائیاں بروئے کار لا کر" وغیرہ وغیرہ۔ کانفرنس سیمینار یا ورکشاپ کے لوگوں سے تو گلہ نہیں کہ ان کی دال روٹی اور دھندا ہی یہی ہے۔ کسی نے ڈونرز کے پیسے کو حلال کرنا ہوتا ہے تو کوئی اپنے ادارے کی ٹوپی میں کامیاب کانفرنس جیسا سرخاب کا پر لگانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنما' جن میں ہر کوئی برسراقتدار آ کر اس قوم کے مسائل حل کرنے کے نعرے پر سیاست کر رہا ہوتا ہے' ووٹ مانگ رہا ہوتا ہے' اکٹھے ہو کر جو "ٹھوس سفارشات" مرتب کرتے ہیں' جو "عملی اقدامات" تجویز کرتے ہیں یا جس "حکمت عملی" کا اعلان کرتے ہیں۔ ان رہنماؤں کی گزشتہ کارکردگی دیکھی جائے تو یوں لگتا ہے یہ سب سفارشات کسی خلائی مخلوق کے لئے ہیں جو اچانک کسی سیارے سے اترے گی' اس ملک کا انتظام سنبھالے گی اور ان سفارشات پر عمل درآمد شروع کر دے گی۔ پشاور کا سانحہ جسے ہر کوئی پاکستان کا "نائن الیون" کہہ رہا ہے' اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان تمام رہنماؤں کو مسئلے کا کتنا ادراک ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے اپنا ایک دشمن وضع کیا تھا جو اس سے ہزاروں میل دور ایک مفلوک الحال ملک تھا۔ وہ یہ جنگ اپنے شہروں' قصبوں یا پہاڑوں میں لڑنے نہیں جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ 48 ملک آ ملے تھے تو اس نے فضائی بمباری سے اس ملک کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اسے اس ملک یعنی افغانستان پر بم برسانے کے لئے اس کے پڑوسی یعنی ہماری سرزمین میسر آئی تھی جہاں سے ستاون ہزار دفعہ جہاز اڑے تھے اور انہوں نے وہاں بم برسائے تھے۔ نائن الیون کے بعد امریکی صدر جارج بش کو ایک لمحے کے لئے پالیسی کا اعلان کرنے یا عوام کو ساتھ ملانے کے لئے اپوزیشن یا فوج سے مشاورت کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان تیرہ سالوں میں ایک گھنٹے کے لئے بھی امریکی فوج امریکہ میں کسی آپریشن کے لئے کسی شہر یا علاقے میں نہیں بھیجی گئی۔ وہاں کی سول انتظامیہ کو اپنی طاقت اور قوت کا اندازہ تھا اور اس حماقت پر بھروسہ بھی۔ پاکستان اپنی یہ جنگ کونسے ملک پر مسلط کرے گا جو اس سے ہزاروں میل دور بھی ہو اور کمزور بھی ہو اور دنیا اس ملک پر حملہ کرنے کے لئے بھی اس کا ساتھ دے لیکن ہم نے بھی لفظ ایجاد کرنے اور تشبیہات تراشنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کیا سیاست دان اور کیا دانشور' جس کو کیمرہ اور مائیک میسر آتا ہے ایسی ہی اصلاحات ایجاد کرتا رہتا ہے۔ پاکستان کے اس "نائن الیون" کے بعد جو قومی اتفاق رائے پیدا ہوا اس کی ہنڈیا بیچ چوراہے میں پھوٹنے لگی ہے۔ ہر سیاست دان نے اپنے اپنے چوراہے میں اس ہنڈیا کو پھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ رحمان ملک نے کہا اگر فوجی عدالتوں سے کسی بے گناہ کو سزا ہوئی تو پارلیمانی ایکشن کمیٹی ختم ہو جائے گی۔ گویا گناہ گار اور بے گناہ کا فیصلہ پارلیمانی ایکشن کمیٹی کرے گی نہ کہ فوجی عدالت۔ فاروق ستار نے کہا اگر کسی سیاسی مجرم کو فوجی عدالت نے سزا سنائی تو سپریم کورٹ جائیں گے۔ گویا قتل کرنے' اغوا برائے تاوان یا کسی بھی قسم کی دہشت گردی کے مقدمے کو فوجی عدالت سے بچانا ہے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کی ممبر شپ حاصل کر لینی چاہیے۔ یہی "اتفاق رائے" آصف زرداری نے بے نظیر کی برسی والے دن تقریر کرتے دکھایا

۔

سفارشات کا سب سے مضحکہ خیز حصہ وہ ہے جس پر حکومت نے عملدرآمد کرنا ہے۔ کام کرنے کی صلاحیت اور گزشتہ کارکردگی کو دیکھ کر آئندہ کے لیے سفارشات مرتب کی جاتی ہیں۔ لیکن حیرت میں ڈوب جائیے کہ یہاں ہم کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ہمارے معیارات کتنے بلند ہیں۔ یہ حکومت مدارس کی رجسٹریشن کرنے اور ان کے نصاب تعلیم کو درست کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ وہ حکومت جو گزشتہ چالیس سالوں سے پرائیویٹ سکولوں کو رجسٹرڈ کر رہی ہے۔ ہر صوبے میں ہزاروں پرائیویٹ سکول ہیں جو کم از کم تین حکومتی اداروں کے تحت رجسٹرڈ ہوتے ہیں۔ آج کسی بھی صوبے کے محکمہ تعلیم کے اعلیٰ ترین عہدیدار سے پوچھ لیں' ان سکولوں میں کیسا نصاب تعلیم پڑھایا جا رہا ہے' بچوں سے کتنی فیسیں لی جا رہی ہیں' اساتذہ کی تنخواہوں کا کیا حال ہے' عمارتیں کیسی ہیں' ان کی لائبریریاں اور لیبارٹریز کس طرح کی ہیں۔ آپ کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملے گا۔ آپ حیرت میں گم ہو جائیں گے کہ یہ تمام محکمے گزشتہ تیس سال سے مسلسل ان سکولوں کو رجسٹرڈ کر رہے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ایسی حکومت جب مدرسوں کی رجسٹریشن کا دعویٰ کرتی ہے۔ اور ٹیلی ویژن سکرینوں پر بیٹھے دانشور جب زور دے کر کہتے ہیں کہ یہ فوراً کرو تو ہنسی آ جاتی ہے۔ بے بسی کے عالم میں آخر کار تجویز یہ دی جاتی ہے کہ فوج کے ذریعے یہ کام کروا لیا جائے۔ کیا انہیں پرویز مشرف کے زمانے میں سیلز ٹیکس کی رجسٹریشن کا حشر یاد نہیں جو فوج کے ذریعے کروایا گیا تھا۔ وہ تو بیچارے کاروباری اور دکاندار قسم کے لوگ تھے جو جھگڑوں سے دور بھاگتے ہیں' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں تو بریلوی' دیوبندی' شیعہ' اہل حدیث' سب اپنی "قوت ایمانی" کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ اس ملک میں چار ایسے ادارے ہیں جو این جی اوز کو رجسٹرڈ کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہزاروں این جی اوز رجسٹرڈ ہیں۔ آپ ان اداروں کے سربراہوں سے سوال پوچھ کر دیکھ لیں کہ ان این جی اوز کے فنڈز کہاں سے آتے ہیں' کہاں خرچ ہوتے ہیں' ان کا دائرہ کار کیا ہے۔ آپ کو یقیناً مایوسی ہو گی۔ اس کے باوجود ہمارا حوصلہ دیکھیں ہم مدرسوں پر ہاتھ ڈالنے جا رہے ہیں۔ ایک اور ٹھوس سفارش یہ بھی ہے کہ دہشت گردوں کی مالی معاونت روکی جائے گی۔ حیرت ہے جس ملک میں 45 کے قریب سفارت خانوں میں امداد حاصل کرنے کے لئے کھڑکیاں کھلی ہوں۔ جہاں ڈونرز فنڈز قائم ہوں، وہاں مالی معاونت روکی جا سکے گی۔ جہاں روز کروڑوں ڈالر ہنڈی کے ذریعے اس ملک میں آتے جاتے ہوں اور ہر بڑے صاحب اقتدار کے کاروباری وسائل بھی اسی ہنڈی کے ذریعے سے پورے ہوتے ہوں' وہاں مالی معاونت پر کنٹرول کی سفارش عجیب لگتی ہے۔

آپ ایک ایک ٹھوس سفارش اٹھائیں اور پھر دیکھیں اس کے ساتھ ہم آئندہ دنوں میں کیا سلوک کریں گے تو ہمیں مایوسی گھیر لیتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ہمارے مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ حل ہے اگر ہم منافقت ترک کر دیں۔ اگر ہم جو سوچ رہیں اور ہمارے جو دلوں میں چھپا ہے اسے زبان پر لے آئیں۔ ہم فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اس ملک کو کیسا بنانا ہے۔ ایک سیکولر قومی ریاست یا ایک خالص اسلامی فلاحی مملکت۔ ہماری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ہم اسلامی فلاحی مملکت میں سیکولرزم ڈھونڈتے ہیں اور سیکولر قومی ریاست میں اسلامی اقدار تلاش کرتے ہیں۔ ایسے نہیں چل سکتا۔ سیکولر قومی جمہوری ریاست بنانا ہے تو پھر اللہ کو خوش رکھنے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو جیسے دنیا کی ایسی تمام ریاستیں کر رہی ہیں۔ ویسا ہی کرو، شہادت کی آرزو اور جنت کی تمنا چھوڑو اور قومی سوچ اپناؤ۔ اگر یہ نہیں تو پھر اسلام کی بنیاد پر آگے بڑھنا چاہتے ہو تو کم از کم جو کچھ اس آئین میں درج ہے وہ فوراً نافذ کر دو۔ نیک نیتی کے ساتھ اور شاید ایک دن سب کچھ گنوانے کے بعد آپ کو یہی حل ہی نظر آئے گا۔ اس لیے کہ سیکولر قومی ریاست کے علمبرداروں کو جو بندوق آج میسر ہے اس کا رخ وقت کی عالمی سیاست کے ساتھ بدلتا ہے۔ جب کہ پاکستان میں بسنے والے اٹھارہ کروڑ عوام کی خواہشوں اور امنگوں کا مرکز کچھ اور ہے۔ ان کے خواب اسلام سے وابستہ ہیں۔ چلو کچھ دن لڑائی لڑ کر دیکھ لو۔ ابھی تو آغاز ہے اور "قومی اتفاق رائے" کی ہنڈیا بیچ چوراہے میں پھوٹنے لگی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ڈوبتی کشتی کے مسافر

چراغ جب بجھنے لگتا ہے تو آخری بار اپنے پاس موجود تیل سے شعلے کو یوں بھڑکاتا ہے کہ پورے ماحول میں روشنی چھا جاتی ہے۔ ٹمٹماتی لو کے عادی لوگ ایک دم چونک پڑتے ہیں، لیکن یہ روشنی صرف چند سیکنڈ کے لیے ہوتی ہے، پھر اس کے بعد گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گزشتہ تقریباً ایک صدی سے دنیا کی سیاست، معیشت اور طرزِ زندگی پر راج کرتے امریکہ نے 2008ء کے معاشی بحران کے بعد اپنے قدموں میں جو لڑکھڑاہٹ پائی، اسے ہزار جتن سے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن سنبھل نہیں پا رہی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے بھی چند سال پہلے اس نے دنیا پر سیاسی، معاشی اور فوجی بالادستی کا آغاز کر دیا تھا۔ فلپائن کو سپین کی غلامی سے نجات دلانے کے بہانے 1998ء میں داخل ہوا، وہاں اپنے اڈے قائم کیے، پورے ملک کو خانہ جنگی کا تحفہ دیا اور اپنے فوجیوں کی عیاشی کے لیے منیلا کو دنیا بھر کیلئے قحبہ گری اور جسم فروشی کا مرکز بنا دیا۔ اس کے بعد اس دنیا کا کونسا خطہ ہے جہاں اس معاشی اور سیاسی عفریت نے اپنے پنجے نہیں پھیلائے۔ 1917ء میں روس میں کیمونسٹ انقلاب آیا تو امریکہ نے دنیا کو اس کی دست برد سے بچانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ ابھی تو جنگ عظیم اوّل ختم ہوئی تھی۔ اپنے اردگرد جنوبی امریکہ کے ممالک پر امریکہ کی خونخوار نظریں جمی ہوئی تھیں۔ 1930ء کا معاشی بحران پوری دنیا کیلئے خوفناک تھا، لیکن امریکہ کے پاؤں نہ ڈگمگائے۔ جنگ عظیم دوم تک اس کی معاشی، سیاسی اور فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک عفریت بن چکا تھا۔ جاپان پر ایٹم بم گرا کر اس نے دنیا کو خوفزدہ کیا اور یورپ کو تباہ حالی سے بچانے کیلئے مارشل پلان کے ذریعے امداد دے کر نیٹو کی پابندیوں میں جکڑ لیا۔ پورا مغرب امریکی معیشت کا غلام بن گیا۔ اس غلامی کی تصویر دنیا کے سامنے اسوقت آئی جب فرانس کے صدر نے 1971ء میں امریکی صدر نکسن سے مطالبہ کیا کہ اس کے بینکوں میں جو فرانس کے دو ارب ڈالر پڑے ہوئے ہیں اس کے بدلے میں سونا دیا جائے کہ یہ ایک معاہدے کا حصہ ہے جو جنگ عظیم دوئم کے بعد 1945ء میں برٹن ووڈ میں ہوا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ تمام ممالک اپنی کرنسی کی مالیت کے برابر سونا اپنے پاس محفوظ رکھیں گے تاکہ مانگنے پر ادا کیا جا سکے۔ اس مطالبے پر صدر نکسن نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا تم کیا سمجھتے ہو یہ وعدہ پورا کرنے کیلئے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ نے سونا کے متبادل یعنی گولڈ سٹینڈرڈ کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ "حکومتی ساکھ (GoodwillofCountry)" کا لفظ ایجاد کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسی معاشی قوت کے بل بوتے پر امریکہ نے پوری دنیا کو ایک ہیجانی جنگ کا شکار کر رکھا تھا۔ یہ جنگ کیمونسٹ شدت پسندی کے خلاف تھی۔ مشرق میں ویت نام سے شروع ہو کر مغرب میں چلی تک کتنے ملک تھے جو اس شدت پسندی کی جنگ میں خون میں نہا رہے تھے۔ امریکی اسلحہ ساز فیکٹریاں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھیں اور خانہ جنگی کے شکار ممالک کے وسائل امریکہ اور اس کے حواریوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول بک رہے تھے۔ ان وسائل میں ایک اہم اور شاید سب سے بڑا اثاثہ تیل ہے جو دنیا بھر کی توانائی کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ مسلم امہ کی قسمت ہے کہ اس اثاثے کا بڑا حصہ اس کے پاس ہے۔ اسی تیل کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے عالمی معیشت کی ترقی وابستہ ہے۔ اس کی خرید و فروخت سے وابستہ کرنسی کی ساکھ مضبوط ہوتی ہے اور اس کی ترسیل کو یقینی بنانے کیلئے جنگ کے میدان کھولے اور سمیٹے جاتے ہیں۔

کیمونسٹ روس کے زوال کے بعد جو میدان سجایا گیا وہ اسلامی شدت پسندی کا تھا جسے دہشت گردی کا نام دیا گیا۔ کیمونسٹ روس کے ہم خیال ممالک یا علاقوں میں لڑی جانے والی جنگ اور اس جنگ میں ذرا برابر بھی فرق نہیں۔ نہ تکنیک مختلف ہے اور نہ ہی حربے۔ اس جنگ میں بھی افواج کو امریکہ میں تربیت دی جاتی، ان سے مراسم بڑھائے جاتے اور پھر ان کے جرنیلوں کے ذریعے چلی اور نکاراگوا جیسے بے شمار ملکوں میں فوجی انقلاب لایا جاتا، ہزاروں افراد لاپتہ ہوتے، لاکھوں قتل کیے جاتے۔ اذیت رسانی اور ٹارچر کے طریقوں کی تربیت باقاعدہ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں دی جاتی۔ اس جنگ میں کیمونسٹ گوریلوں کا خوف پوری دنیا پر مسلط کیا گیا تھا اور آج کل اسلامی شدت پسندی کے خلاف جنگ میں اسلامی دہشت گردوں سے دنیا کو ڈرایا جاتا ہے۔ کیمونسٹ گوریلوں کو سوویت روس یا دیگر ہم خیال ممالک سے امداد ملتی تھی لیکن اسلامی دہشت گرد تو نیٹو کے مقابلے میں بالکل اکیلے ہیں۔ بہت سی تھیوریاں پیش ہوئیں، ہم نے خود انہیں پروان چڑھایا ہے، ان کو منشیات کے کاروبار سے پیسہ ملتا ہے، چند ممالک اپنے مسلکی مفاد کی خاطر انہیں سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ دنیا نے یہ ساری منطقیں تسلیم کر لیں اور طے کر لیا کہ دنیا کے امن کو اسلامی دہشت گردی سے خطرہ ہے۔ افغانستان اور عراق میں افواج اتریں، پڑوسی ملکوں نے اس خطرے سے بچنے کیلئے امریکہ کی امداد کی اپنی زمین امریکہ کیلئے پیش کی۔ 13 سال کی اس جنگ نے جہاں لاکھوں انسانوں کا خون کیا وہیں دنیا کی معیشت کے پاؤں بھی ڈگمگا دیئے۔ شروع شروع میں عراق کے تیل اور عرب ریاستوں کی اسلحے کی خریداری نے اسے سہارا دیا لیکن 2008ء میں یہ ایسے ڈوبی جیسے شدید طوفان میں نرم شاخیں ڈوبتی ہیں۔ امیدیں قائم تھیں مشرقِ وسطیٰ میں جنگ جاری تھی، شام اور عراق کی خانہ جنگی امریکی معیشت کا خواب پورا کر سکتی تھی۔ لیکن دس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے پانچ لاکھ عراقی فوج جسے امریکہ دنیا کی بہترین تربیت یافتہ فوج تصور کرتا تھا صرف دس بارہ ہزار افراد کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھا گئی اور ایسے افراد کے ہاتھ تیل کے کنویں لگے جہاں سے بیس لاکھ ڈالر کا تیل روزانہ مارکیٹ میں آنے لگا۔ لیکن یہ کیا ہو گیا، تیل کی قیمتیں اچانک گرنے لگیں۔ کیا اس لیے کہ وہ لوگ تیل سستا بیچ رہے ہیں۔ نہیں۔ بلکہ امریکہ نے اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالنے کیلئے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا ہے، ترپ کا آخری پتہ کھیلا ہے۔ ترکش کا یہ آخری تیر صرف معیشت کو سنبھالنے کیلئے ہی نہیں بلکہ اس جنگ میں تھوڑی سی مخالف قوتوں کی معیشت تباہ کرنے کیلئے بھی چلایا گیا ہے۔

امریکہ کی سرزمین میں تیل کے ذخائر کی بہت بڑی مقدار موجود ہے جسے Shale تیل کہا جاتا ہے۔ اس تیل کو امریکہ نے برے وقتوں کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ اس کو نکالنے کے لیے جو لاگت صرف ہوتی ہے اور جس طرح کی ٹیکنالوجی کا استعمال درکار ہوتا ہے اس سے تیل کی قیمت میں منافع کی امید بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود اوکلوہاما کے وہ تیل کے کنویں اور شمالی ڈکوٹا اور ٹیکساس کے تیل کے سرمایہ کار اس تیل کو نکال کر مارکیٹ میں لا رہے ہیں۔ انہوں نے تقریباً بیس ہزار کے قریب ایسے کنویں کھودے ہیں جو سعودی عرب کے کنوؤں کی تعداد سے دس گناہ زیادہ ہیں۔ اس قدر تیل مارکیٹ میں آنے سے تیل کی قیمت 40 فیصد کم ہو گئی ہے۔ جون میں ایک بیرل تیل کی قیمت 110 ڈالر تھی جو گر کر 68 ڈالر ہو چکی ہے، جسے امریکہ پچاس ڈالر کی قیمت پر لانا چاہتا ہے تاکہ مرتی ہوئی معیشت کو پاؤں پر کھڑا کیا جائے اور ان ملکوں کو تباہی کی طرف دھکیلا جائے جن کا سارا دارومدار تیل کی برآمد پر ہے۔ ان میں روس ہے جس کی کرنسی روبل 30 فیصد گر چکی، ایران جس کو اپنا بجٹ مستحکم رکھنے کے لیے تیل 136 ڈالر بیرل کی قیمت چاہیے، اس نے یکم دسمبر کو روٹی کی قیمت میں 30 فیصد اضافہ کیا، نائیجیریا جس نے دو دسمبر کو تمام سبسڈی ختم کر دی اور وینزیلا نے 28 نومبر کو تنخواہوں میں کمی کا اعلان کر دیا۔ Shale تیل کے مارکیٹ میں آنے سے وہ تمام عرب ریاستیں بھی متاثر ہوں گی لیکن اس کا ایک فائدہ یہ تصور کیا جا رہا ہے کہ دنیا بھر کا جی ڈی پی بڑھ جائے گا، معیشت مستحکم ہو گی۔ یہ ایک ایسا جواء ہے کہ اگر مارکیٹ نے تیل کی قیمت پچاس ڈالر فی بیرل سے نیچے گرا دی تو یہ دنیا ایک بہت بڑے بحران کا شکار ہو جائے گی جو اس پوری سودی معیشت کی عمارت کو دھڑام سے گرا دے گا۔ ایسے میں وہ تمام منصوبے، فتح کے وہ تمام افسانے، امریکہ اور نیٹو کی وہ بالادستیاں سب خواب ہو کر رہ جائیں۔ چاروں جانب بحران ہے، خوف سے بھاگتے امریکہ اور نیٹو کو اس معاشی معجزے کا یقین ہے۔ یہ ڈوبتی کشتی ہے جس پر ہم ایک دفعہ پھر سوار ہونے جاتے رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ، افغانستان اور بھارت سے مل کر ہماری بقا ہے، ہم امن کی زندگی گزار سکیں گے۔ لیکن شاید اس سے بڑا سراب اور کوئی نہیں۔ ڈوبتی معیشت اور ہچکولے کھاتی کشتی پر سوار ہونا۔ چلو چند سال بعد اس کا ماتم کریں گے۔

نوٹ: درویش خدامست، نسیم انور بیگ کی سوانح پر ملک بھر کے دانشوروں اور ان کی محفل کے خوشہ چینوں نے جو کچھ تحریر کیا، اس کتاب کی رونمائی 21 دسمبر کو گیارہ بجے دن قائداعظم لائبریری میں ہو گی۔ درویش کی یاد میں محفل بپا ہو گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

دنیا کے دو خیموں میں بٹنے کا وقت

جو لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ اسرائیل کی غزہ پر بمباری ایک اچانک عمل ہے اور یہ چند دنوں تک جاری رہے گا اور پھر عالمی طاقتیں بیچ بچاؤ کروادیں گی۔ اس دوران غزہ کے مسلمانوں کو کافی سبق سکھایا جا چکا ہوگا۔ ایسے افراد کو ایک دفعہ گزشتہ پندرہ سالوں کے دوران یہودی دانشوروں' سیاستدانوں اور خصوصاً صیہونی لٹریچر کا مطالعہ کر لینا چاہیے جو ان سالوں میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے شائع ہو تا رہا ہے۔ جن "عظیم" دانشوروں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اسرائیل دنیا میں موجود قومی ریاستوں کی طرح کی ایک ریاست ہے جس کی متعین حدود ہیں' اقتدار اعلیٰ ہے' جمہوری حکومت ہے تو انہیں بھی اس خوش فہمی کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ یہودی دنیا بھر کے ممالک میں اگرچہ مطعون تھے' دو ہزار سال سے دربدر تھے' انہیں شدید نفرت کا سامنا تھا' اس کے باوجود وہ دنیا کے کاروبار' بینکاری اور میڈیا پر انیسویں صدی کے آخر تک چھا چکے تھے۔ سپین میں ازابیلا اور فرڈیننڈ کی حکومت آنے پر یہودیوں کو خلافت عثمانیہ کے علاقوں میں امان بھی مل چکی تھی اور یورپ سے امریکہ ہجرت کرنے والوں میں جہاں ہر ملک کے بدنام زمانہ لوگ شامل تھے وہیں کثیر تعداد میں یہودی تھے جنہوں نے جنگ عظیم اول سے پہلے ہی امریکی اقتدار کو اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ 1896ء میں جب صیہونیت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے مشہور زمانہ پروٹوکولز لکھے گئے تو وہ تاج برطانیہ جو یہودی سودی سرمائے کا مقروض تھا اس نے انہیں ایک قوم تصور کرتے ہوئے بالفور ڈیکلریشن 1916ء میں جاری کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہودیوں کو پوری دنیا میں کوئی جائے پناہ میسر نہ تھی۔ تمام اتحادی ممالک اور امریکہ کے دروازے ان کے لیے کھلے تھے۔ پھر وہ حیفہ اور تل ابیب جیسے بے آب و گیاہ علاقے میں کیونکر آباد ہوئے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد تو یورپ میں بھی ان کا غلبہ ہو چکا تھا۔ ان کے خلاف گفتگو کرنا بھی قابل سزا جرم بن چکا تھا۔ پھر وہ یورپ کے "جنت نظیر" اور پر امن ممالک کو چھوڑ کر ایک ایسے ملک میں کیوں آباد ہو گئے جہاں انہیں چاروں جانب سے دشمنوں کا سامنا تھا۔ انہیں اپنے دفاع کے لئے اربوں ڈالر خرچ کرنا پڑیں۔ حفاظت کے لئے اونچی اونچی دیواریں بنانا پڑیں۔ پوری قوم کو لازمی فوجی تربیت دینا پڑے۔ قومی ریاست کے تصور کے علمبردار اور سیکولر نظریے کے داعی اس سوال کا جواب نہیں دیتے۔ اس لیے کہ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے کہ یہودی ایک آخری عالمی جنگ کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ایسی جنگ کے نتیجے میں ان کے مذہبی ربیوں کے نزدیک فتح نصیب ہو گی اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی طرح کی عالمی حکمران حکومت قائم ہوتی ہے جسے وہ Rulingstateoftheworld کہتے ہیں۔ پوری دنیا کے یہودی اس جنگ کے لئے وسائل مہیا کرتے ہیں اور متحد ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی یہ جنگ مسلمانوں سے ہونا ہے۔ گزشتہ پندرہ سالوں سے یہودی مفکرین' مذہبی رہنما' یہاں تک کہ ان کے اہل تصوف بھی بار بار یہ تحریر کر رہے تھے کہ 2014ء اور 2015ء میں لگنے والے چار مکمل چاند گرہن اس وقت کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ دنیا کا ہیڈ کوارٹر اب امریکہ سے اسرائیل منتقل ہونا ہے۔ ان پندرہ سالوں میں انہوں نے ایک مستقل منصوبہ بندی کے ساتھ امریکہ اور اس کے حواریوں سے اپنے لیے راہ ہموار کروائی۔ عراق کی طاقت کا خاتمہ' عرب بہار کے نتیجے میں مسلم امہ میں انتشار جس کا نتیجہ یہ کہ مصر میں اخوان حکومتی تشدد کا شکار' حزب اللہ شام اور عراق میں اپنے ہی مسلمانوں کے خلاف لڑتی ہوئی' ایران جو آواز اٹھاتا تھا وہ سعودی عرب سے کشمکش اور داعش کے خطرے کی وجہ سے عراق میں الجھا ہوا' سعودی عرب اور عرب ریاستیں اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے امریکہ کی دست نگر' ایسے میں یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنی پیش گوئیوں اور منصوبہ بندی کے مطابق جنگ کا آغاز کر دیا۔ اب کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ یہ جنگ انجام سے پہلے ختم کر دی جائے گی۔

لیکن کیا مسلم امہ نے کبھی غور کیا کہ یہی وقت ہے جس کی بشارت سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دی تھی۔ آپ نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مسلمان یہودیوں سے جنگ نہ کر لیں۔ اس لڑائی میں مسلمان یہودیوں کو قتل کر دیں گے' یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپ جائیں گے تو پتھر اور درخت یوں کہے گا۔ "اے مسلمان اللہ کے بندے ادھر آ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے اس کو مار ڈال۔ مگر غرقد نہیں کہے گا کیوں کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔ (مسلم)۔ اسے دنیا بھر میں JEWTREE کہا جاتا ہے اور اسرائیل میں اس کی سب سے زیادہ شجرکاری کی گئی ہے۔ دنیا بھر سے یہودی اسرائیل کی سرزمین پر پکنک منانے یا کسی معاشی فائدے کے لئے جمع نہیں ہوئے بلکہ اس جنگ کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کے بعد ان کے بقول ایک ایسی حکومت قائم ہونی ہے جو عالمی سپر پاور کی حیثیت رکھتی ہو۔ وہ اپنی کتاب ایزاخیل کی اس پیش گوئی پر یقین رکھتے ہیں۔ "اے صیہون کی بیٹی خوشی سے چلاؤ' اے یروشلم کی بیٹی مسرت سے چیخو' دیکھو تمہارا بادشاہ آ رہا ہے۔ وہ عادل ہے اور گدھے پر سوار ہے۔ خچر یا گدھی کے بچے پر۔ میں یوفریم سے گاڑی کو اور یروشلم سے گھوڑے کو علیحدہ کر دونگا۔ جنگ کے پر توڑ دیئے جائیں گے۔ اس کی حکمرانی سمندر اور دریا سے زمین تک ہو گی۔ (زکریا 9:9-10) اسی کتاب میں لکھا ہے "اس طرح اسرائیل کی ساری قوموں کو ساری دنیا سے جمع کرونگا' چاہے وہ جہاں کہیں بھی جا بسے ہوں اور انہیں ان کی اپنی سرزمین میں جمع کرونگا۔ میں انہیں اس سرزمین میں ایک ہی قوم کی شکل دے دونگا' اسرائیل کی پہاڑی پر جہاں ایک ہی بادشاہ ان پر حکومت کرے گا۔ (ایزاخیل' 37:21-22) انہی بشارتوں کے مکمل ہونے کے لئے وہ اس سرزمین پر جمع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا حال بھی ویسا ہے جیسا آج ہمارے مسلمانوں کا ہے۔ اپنی مرضی کی آیت اٹھا کر اسے مکمل سمجھ لیتے ہیں۔ اسی کتاب ایزاخیل میں اس آخری جنگ کا وہی انجام درج ہے جو سید الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ایزاخیل کے 22ویں باب میں لکھا ہے "پھر ایلی کہتا ہے کہ کیونکہ تم لوگ میرے نزدیک کھوٹے سکے ثابت ہوئے ہو۔ اس لئے تمہیں یروشلم میں جمع کرونگا جیسے سونا' چاندی' ٹن' لوہا اور کانسی کو آگ میں ڈالنے کے لئے جمع کرتے ہیں۔ اس طرح میں بھی تمہیں غصے اور غضب کے درمیان جمع کرونگا اور پھر تمہیں پگھلا دوں گا۔ میں تم پر اپنے غضب کی آگ بھڑکا دونگا اور تم پگھل جاؤ گے پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے رب نے تمہارے اوپر اپنا غضب نازل کیا ہے۔ (22:19-22) لیکن ان کی کتاب جرمیاہ (Jeramiah) میں تو اس آخری معرکے کے اختتام کا منظر ہولناک ہے۔ "ان کی تباہی اور سزا کے اعلان کے بعد جس کے بعد ان کی لاشیں کھلے آسمان تلے ڈال دی جائیں گی' جہاں گدھ اور کیڑے مکوڑے ان کو کھا لیں گے حتیٰ کہ ان کے بادشاہوں اور لیڈروں کی ہڈیاں بھی گل جائیں گی اور زمین میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھیل جائیں گی"۔ (8:3) لیکن کیا مسلم امہ اور خصوصاً عرب دنیا کو اس کا اندازہ ہے۔ اسرائیل جس جنگ کے لئے سات دہائیاں قبل قائم کیا گیا' جس کی تیاری پوری یہودی قوم 1896ء سے کر رہی ہے ہمیں اس کا احساس نہیں۔ ہم خصوصاً عرب اقوام ایک ایسے فتنے میں مبتلا ہیں جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا' ایک ایسا فتنہ ظاہر ہو گا جو سب عربوں کو لپیٹ میں لے لے گا۔ اس فتنے میں قتل ہونے والے جہنم میں جائیں گے۔ اس فتنے میں زبان کی کاٹ تلوار سے زیادہ ہو گی۔" (مسند احمد' ابی داؤد' ترمذی' ابن ماجہ) کیا اس لمحے جب اسرائیل نے اپنی جنگ کا آغاز کر دیا ہے' وہ سب لوگ جو مسالک کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ لوگ جو زبان کی کاٹ سے حکومتوں کی گدیوں پر بیٹھے یا منبروں پر براجمان امت کے گروہوں کو لڑنے پر اکسا رہے ہیں کیا ان کے سامنے سید الانبیاء ﷺ کی جہنم کی وعید موجود نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا "عرب کی تباہی"۔ ابھی تو شامت اعمال کے دن ہیں کہ اس اندرونی فتنے سے جو بچ نکلے گا وہی ہو گا جس کے ہاتھ میں اللہ کی نصرت کا پرچم ہو گا۔ یہ بڑی جنگ جس کے آخر میں دجال کا ظہور ہو گا اس سے پہلے دنیا دو خیموں میں بٹ جائے گی۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب لوگ دو خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے' ایک اہل ایمان کا خیمہ جس میں بالکل نفاق نہیں ہو گا دوسرا منافقین کا خیمہ جن میں بالکل ایمان نہیں ہو گا۔ جب ایسا ہو تو دجال کا انتظار کرو کہ آج آئے یا کل"۔ (ابوداؤد' مستدرک) ابتلا کا دور ہے' شامت اعمال ہے' صفائی کا موسم ہے' دنیا دو خیموں میں بٹنے کے نزدیک ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ذرا صبر

کیا یہ سب لوگ مایوس لوٹ جائیں گے؟ کیا انہیں موسم کی سختیاں‘ عوام کی بے حسی اور انتظامیہ کا تشدد بے دل کر دے گا اور یہ نا امیدی کی چادر اوڑھے گھروں کو لوٹ جائیں گے؟ کیا وقت ان کے رہنماؤں کو تھکا دے گا اور وہ جیسا تیسا معاہدہ کر کے اگلے سفر پر روانہ ہو جائیں گے؟ یہ لوگ جو گزشتہ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ سے کھلے آسمان تلے مکین ہیں‘ آپ ان کے رہنماؤں کے بارے میں جو مرضی کہیں‘ اس مہم جوئی کو عالمی سازش کا حصہ قرار دیں‘ اس کے پیچھے مقتدر قوتوں کا ہاتھ بتائیں‘ لیکن یہ لوگ اٹھارہ کروڑ عوام کا عطر ہیں۔ یہ وہ خوشبو ہیں جن سے قوموں کے وجود مہکا کرتے ہیں۔ یہ وہ سادہ دل اور پختہ یقین لوگ ہیں جو بے غرضی سے حالات بدلنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش انہیں بے چین کر دیتی ہے۔ وہ جہاں روشنی کی کرن دیکھتے ہیں اس پر پروانوں کی طرح لپکتے ہیں۔ یہ پاکستان کی سات دہائیوں پر پھیلی مایوسی کی پیداوار ہیں۔ کیا یہ لوگ مایوس لوٹ جائیں گے؟ انہیں مایوس لوٹنا چاہیے؟ یہ اگر آج مایوس لوٹے تو ان کی امیدیں اسی بوسیدہ‘ مکروہ اور انسانی تاریخ کے سب سے فریب زدہ نظام سے وابستہ رہیں گی۔ یہ سمجھتے رہیں گے کہ جمہوریت ہی دراصل ”عوام کی حکمرانی“ کا دوسرا نام ہے۔ انہیں اگر جمہوریت‘ پارلیمنٹ اور اس پر قابض لوگ ہی مایوس اور نا امید کر کے واپس لوٹائیں تو اس دن انہیں یقین آئے گا کہ سودی سرمایہ اور کاغذی کرنسی کی جعلی دولت کا جو نظام ان پر مسلط کیا گیا ہے‘ وہ اگلے سو سال دھرنے دینے سے بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ جس دن ان لوگوں کا واپسی کا سفر شروع ہو گا‘ اس دن واپس لوٹنے والا ہر شخص ایک ایسی مشعل بن جائے گا جو روشنی تو بکھیرے گا لیکن ساتھ ہی اس دل میں ہر اس نشیمن کو جلا کر راکھ کرنے کی خواہش بھی کروٹیں لے رہی ہو گی جو ان کی زندگیوں میں زہر گھولتا ہے۔ کیا یہ لوگ مایوس اور نامراد لوٹیں گے‘ میرے سوال پر درویش نے مسکرا کر کہا‘ نہیں ان کے ہاتھ میں کلہاڑی دے دی جائے گی۔ سوال کیا‘ مایوسی کے عالم میں کلہاڑی‘ یہ غضب ہو جائے گا۔ کہنے لگے جو لوگ ان کو نامراد لوٹائیں گے ان کو اس کا اندازہ نہیں۔ ہرگز نہیں‘ وہ اپنی طاقت کے غرور میں ہیں۔ کیا نشہ تھا کہ ہر کوئی پارلیمنٹ میں اپنے آپ کو اٹھارہ کروڑ عوام کا نمائندہ ہی نہیں جائز حکمران سمجھ کر بات کر رہا تھا۔ دو ہفتے ایوان میں طاقت کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ایسے تھا جیسے کوئی طوفان پارلیمنٹ کو گھیرے ہوئے ہے۔ پارلیمنٹ سیلاب میں بہتے ہوئے اس تختے کی طرح تھی‘ جس میں خوف میں سہمے شیر اور بھیڑیے بھی ساتھ کھڑے بکرے یا ہرن پر حملہ نہیں کرتے۔ سب دریا کے پار اترنے کا انتظار کرتے ہیں۔ جان کے لالے ایسے پڑے کہ ان دو ہفتوں میں ہر کسی کا خوف اور خواہش سب کھل کر سامنے آ گئے۔ اٹھارہ کروڑ لوگ منتظر تھے کہ کوئی ان کے بارے میں بھی بات کرے گا لیکن یہاں تو نشہ ہی اور تھا۔ نشے کا کمال یہ ہے کہ آدمی کا دلیل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جمہوریت اور سسٹم کے تسلسل کی وکالت کرتے ہوئے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ احسن اقبال دنیا میں ترقی کی مثالیں دینے پر آئے تو اٹھارہ کروڑ عوام کو جاہل گردانتے ہوئے چین‘ سنگاپور اور کوریا کی مثالیں دے گئے۔ کیا یہ تینوں ملک جمہوریت کے منافقانہ نظام میں ترقی کے کمال تک پہنچے۔ چین کو اگر ایک جمہوری ملک تصور کر لیا جائے تو پھر موجودہ جمہوری تصورات کا نصاب دوبارہ تحریر کر کے پڑھانا پڑے گا اور شاید اسے پڑھانے کیلئے بھی احسن اقبال صاحب جیسا ”صاحب علم“ چاہیے ہو گا جسے آمریت اور جمہوریت کے فرق کو خوبصورتی سے ختم کرنا آتا ہو۔ سنگاپور کا نام لیا گیا۔ کیا دنیا میں کوئی ماہر سیاسیات 1959ء میں برسر اقتدار آنے والی لے کوان یو (LeeKuanYew) کو ایک جمہوری حکمران کہہ سکتا ہے۔ سنگاپور کی جمہوریت کو ایک سنگل پارٹی آمریت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہ ملک جس میں عدلیہ تک آزاد نہیں اور مخالفین کو دبانے کیلئے حکومت ان کے خلاف عدالتوں میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے مقدمے لے کر جاتی ہے اور عدالتیں حکومت کے حق میں فیصلے دیتی ہیں۔ جہاں میڈیا پر مکمل سنسر شپ ہے۔ جس نے دنیا کی جمہوری حکومتوں کے دباؤ کے مقابلے میں بہت سارے جرائم پر موت کی سزا برقرار رکھی ہوئی ہے۔ پورے کا پورا نظام جس میں عدلیہ‘ انتظامیہ اور مقننہ شامل ہے صرف ایک شخص کی آمریت کے تحت ہے اور اس کے کنٹرول میں ہے۔ نیوزویک کے فرید ذکریا نے لی کوان ہو اسے سوال پوچھا کہ تم اتنے پڑھے لکھے اور لبرل آدمی ہو تم نے اپنے ملک میں جمہوریت کو کیوں نہیں پنپنے دیا۔ اس نے جواب دیا یورپ کو ترقی کرنے کیلئے دو تین سو سال مل گئے تھے‘ وہ تجربے سے سیکھ گئے۔ میری قوم کے پاس ضائع کرنے کیلئے اتنا وقت نہیں ہے۔ جنوبی کوریا کی مثال کس قدر ڈیسک بجا بجا کر دی گئی اور ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے ہمارا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ نقل کیا اور ترقی کی۔ بددیانتی کا عالم یہ ہے کہ کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ منصوبہ ایک آمر ایوب خان کے زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ لیکن جس کوریا کی مثال دی جاتی ہے اور وہاں کے جمہوری تسلسل اور نظام کو سراہا جاتا ہے۔ وہ 1979ء سے اب تک یعنی 35 سالوں میں 27 وزیر اعظم دیکھ چکا ہے جن کا اوسط ڈیڑھ سال سے بھی کم بنتا ہے۔ ان کے ہاں آئین موم کی ناک ہے جس میں 1962, 1972, 1981 1952, 1954, 1960, اور 1987 میں ایسی ترامیم کی گئیں کہ ہر دفعہ اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ لیکن شاید احسن اقبال صاحب کو یاد ہو کہ 1960ء میں کوریا میں طلبہ کے مظاہرے شروع ہوئے‘ اقتدار کے ایوانوں کا گھیراؤ کیا گیا۔ جمہوری طور منتخب لیکن انتہائی بددیانت صدر سنگ مین ری (SyngmanRhee) کو استعفے دینے پر مجبور کیا گیا۔ یہ شخص 1948ء سے برسر اقتدار تھا اور اپنے اقتدار کو طویل کرنے کیلئے آئین میں ترامیم کرتا رہتا تھا۔ 19 اپریل کو طلبہ ایوان اقتدار ”بلیو ہاؤس“ کے گرد جمع ہوئے‘ پولیس کو فائر کھولنے کا حکم ہوا‘ 180 طلبہ مارے گئے۔ 25 اپریل کو ہجوم بڑھتا چلا گیا‘ 26 اپریل کو سنگ مین نے استعفے دے دیا۔ اس کا منظور نظر نائب صدر لی کی پونگ (LeekiPoong) جو ساری کرپشن کا مرکزی کردار تھا‘ اس نے پورے خاندان سمیت 27 اپریل کو خودکشی کر لی۔ پارلیمنٹ نے اپنے آپ کو بچانے کی آخری کوشش کی۔ صدارتی کی جگہ پارلیمانی نظام منظور کیا۔ تمام اختیارات وزیر اعظم چینگ مایوں (ChangMyon) کو دے دیئے گئے۔ لوگ ان بددیانت چہروں کو جانتے تھے۔ افراتفری‘ انارکی‘ بے چینی اور بدحالی۔ ایسے میں 16 مئی 1961ء کو جنرل پارک چنگ ہی (ParkChenghee) نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اسی نے اپنی ٹیم کو پاکستان میں جنرل ایوب کے ترقیاتی منصوبے کا جائزہ لینے بھیجا اور اس کے اٹھارہ سالہ دور اقتدار میں کوریا نے جو ترقی کی وہی آج اس کی بنیاد ہے۔ کیا احسن اقبال صاحب کی نظر میں ایسا ہی نقشہ ہے۔ آدمی کی زبان خوف کے عالم میں پھسلتی ہے یا پھر نشہ کے عالم میں۔ خوف تو یہ ہے کہ ہماری کشتی ڈوب نہ جائے اور نشہ یہ ہے کہ اس پارلیمنٹ کی کشتی پر سوار ہم سب متحد ہو گئے ہیں۔ ایسے میں زبانیں لڑکھڑاتی بھی ہیں اور مدعا بیان بھی ہو جاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہم منتخب تو جمہوری طور پر ہوں لیکن حکومت آمروں کی طرح کریں۔ سوال پھر وہی ہے کہ کیا یہ لوگ مایوس اور نامراد لوٹیں گے۔ ہرگز نہیں۔ یہ اس معاشرے کا عطر ہیں۔ یہ بے غرضی میں وہاں بیٹھے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا۔ ہاں یہ مایوس ضرور لوٹیں گے‘ اس نظام سے‘ اس جمہوریت سے جو سرمائے اور طاقت کی کوکھ میں پل کر جوان ہوتی ہے اور بددیانتی‘ ظلم اور اقرباپروری پر پھلتی پھولتی ہے۔ اللہ انہیں ضائع نہیں کرتا لیکن ان کا تمسخر اڑانے والوں‘ انہیں گمراہ کرنے والوں اور ان کو مایوس کرنے والوں کا انجام قریب کر دیتا ہے۔ درویش نے کہا‘ کلہاڑی ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ گٹر ابل چکے‘ ہر کسی کے اندر کا گند باہر آ گیا۔ ہر کسی کا باطن ظاہر ہو گیا۔ کب مایوسی کی لہر شروع ہوتی ہے اور صفائی کا آغاز ہے‘ وقت تو صرف اللہ جانتا ہے۔ لیکن شاید اب کچھ نہ بچے‘ نہ نظام‘ نہ تسلسل اور نہ اقتدار‘ بس زندہ اور پائندہ رہے گا تو پیارا پاکستان۔ پرانی بوسیدہ عمارتوں کو گرا کر نئے گھر تعمیر کرنے کے دن آ رہے ہیں۔ خوشحال پاکستان کے دن لیکن بوسیدہ‘ کرم خوردہ اور خطرناک عمارتوں کو گرانے تو دو۔

KitaabPoint.blogspot.com

گروہوں میں منقسم ہونے کا عذاب

شام، عراق اور اب یمن۔ ہر کوئی ایک ہی دلیل لے کر سامنے آتا ہے کہ علاقائی سرحدوں اور ریاست کی خود مختاری کا تحفظ سب سے اہم ہے۔ ہم اپنی یا اپنے دوستوں کی سرحدوں کا آخر دم تک دفاع کریں گے۔ یہ سرحدیں کب بنیں، یہ حکومتیں کب قائم ہوئیں اور ان کے دفاع اور سلامتی کو کب سے تقدس کا درجہ دیا گیا؟۔ کیا یہ سب تقسیم خود بخود ہو گئی تھی۔ کیا پہلی جنگ عظیم کے بعد اچانک مصر، اردن، شام، عراق، لبنان، ایران، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، انہیں اپنے علاقوں کی حدود کا بھی پتہ تھا اور ان کے ذہنوں میں وطن کا تصور بھی بہت مضبوط تھا، پھر انہوں نے خود ہی اپنے گرد لکیریں کھینچ لیں اور کہنے لگے، کہ لو اب ہمیں ہمارا وطن مل گیا ہے، اب ہم اس کے دفاع پر اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔ تاریخ کا ایک معمولی سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی تقسیم قطعاً رنگ، نسل، زبان اور علاقے کے بنیاد پر بھی نہیں کی گئی بلکہ اس کا مقصد سیاسی اور معاشی کنٹرول تھا۔ وہ لوگ جنہیں اللہ کی بتائی ہوئی دو قومی تقسیم حزب اللہ اور حزب الشیاطین بالکل پسند نہیں، انہیں بھی اس بات کا ادراک ہے کہ تیونس سے لے کر عراق تک یہ سارے کا سارا خطہ عربی زبان، عربی تہذیب و ثقافت اور عرب روایات کا کئی صدیوں سے امین رہا ہے۔ یہ پورا خطہ سوائے لبنان اور اردن کو چھوڑ کر سب کا سب قبائلی روایات کا بھی امین ہے۔ اگر قبائل پر ہی تقسیم شروع کر دی جائے تو بھی اس خطے میں ہزاروں ملک بنانے پڑیں گے۔ یہ پورے کا پورا خطہ مدتوں ایک خلافت کی مرکزیت پر قائم رہا۔ مصر کی فاطمی حکومت ضرور قائم رہی، بغداد میں آل بویہ بھی برسراقتدار رہے، ہلاکو بھی آتا رہا اور چنگیز خان بھی۔ لیکن کچھ عرصے کے ان طوفانوں کے بعد مسلمان پھر کسی نہ کسی طور مرکزیت پر جمع ہو جاتے تھے جسے وہ خلافت کہتے تھے۔ اجتماعیت اور مرکزیت ہی دین کا مدعا ہے۔ آخری مرکزیت خلافت عثمانیہ تھی جسے پہلی جنگ عظیم کے بعد پارہ پارہ کر دیا گیا۔ لیکن وہ اتحادی ممالک جنہوں نے اس اتحاد کو پارہ پارہ کیا تھا، یہ نہیں چاہتے تھے کہ اب مسلمان دوبارہ کسی مرکزیت کی طرف لوٹیں۔ کیونکہ ایک کمزور سی مرکزیت بھی مسلمانوں کو جسد واحد ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ اسی لئے جدید قومی سیکولر ریاستوں کے تصور کے ساتھ قابض اتحادی افواج نے پورے خطے کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم کا عمل بھی کئی سالوں میں جا کر مکمل ہوا۔ پہلے دو تین ممالک کو خود مختاری دے کر ان پر اپنی مرضی کا حکمران مسلط کیا جاتا۔ انہیں بتایا جاتا کہ ان ملکوں کا جغرافیہ اور سرحدیں اب تمہاری غیرت و حمیت ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں اس وطن کا شعور جھنڈوں، قومی ترانوں اور مرتب کردہ آئینوں کے ذریعے راسخ کروایا جاتا اور پھر کسی دوسرے ملک کو آزاد کر کے وہی تجربہ دہرایا جاتا۔ لبنان کی مثال کمال کی ہے۔ پہلے آئین تحریر کیا گیا۔ جس میں لازمی قرار دیا گیا کہ عیسائی صدر ہو گا، سنی وزیر اعظم اور شیعہ اسمبلی کا سپیکر، پھر سرحدیں کھینچی گئیں، ترانہ اور جھنڈا وجود میں لایا گیا۔ شریف مکہ کے تین بیٹوں میں تین ملکوں کو تقسیم کر دیا گیا، عراق، شام اور اردن۔ ایک اور چیز ان قومی ریاستوں کو بنانے اور مستحکم کرنے کے لیے اختیار کی گئی اور وہ تھی کرنسی، یعنی کاغذ کے نوٹ۔ ہر ملک میں اک سنٹرل بینک قائم ہوا۔ اس سے پہلے سونے اور چاندی کے سکے چلتے تھے، جن پر حکمران اپنی مہر اس لیے ثبت کرتے تھے تاکہ ان کے اصل ہونے کا یقین ہو جائے۔ ورنہ ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں قابل قبول ہوتا تھا کیونکہ سونے اور چاندی کا وزن برابر ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی عرب دنیا کا اپنا کوئی سکہ وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ رومی اور ایرانی سکے ہی بازار میں مستعمل تھے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد پورا عرب علاقہ تقسیم کر دیا گیا، اور وہ در جن سے زیادہ عرب ممالک وجود میں آگئے۔ اب اگر کوئی شخص اس تقسیم کے بعد یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ سب تو نسل، رنگ اور علاقے کے ساتھ وابستہ جذبات تھے جنہوں نے ملک تقسیم کر دیئے اور ان کی حرمت کو مقدم کر دیا تو اس شخص کے استدلال پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔

عرب و عجم کی تقسیم البتہ صدیوں پرانی تھی اور مدتوں انسان اسی لسانی اور نسلی تقسیم پر ایک دوسرے کا خون بہاتا رہا۔ اسلام کا بنیادی مقصد اور منشاء ہی اس تقسیم پر ضرب لگانا تھا۔ اسی لئے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجتہ الوداع میں واضح اعلان فرمایا "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت حاصل نہیں۔" پھر کسی قدر اطمینان سے کہا کہ "تمہاری جاہلیت کے تعصبات کے بت میرے پاؤں تلے کرچی ہو گئے"۔ اس کے باوجود بھی اگر کسی ذہن میں یہ تصور جاگتا ہے کہ اسلام دنیا کو دو دھڑوں حزب اللہ اور حزب الشیاطین میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد موجود دور کی سعودی، عراقی، شامی، یمنی اور لبنانی ریاستیں ہیں ریاست کیلئے کیونکہ مذہب نہیں بلکہ دیگر تعصبات کا تڑکا ضروری ہے، تو ایسے افراد کے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ وہ عرب اور عجم کی جنگ جو اسلام سے پہلے بھی خونریزی اور قتل و غارت کا باعث تھی، آج ایک بار پھر اپنے خونی پنجے گاڑ رہی ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس جنگ میں عجم یعنی ایران کی سرزمین پر آگ نہیں لگی ہوئی۔ بلکہ کمال ہوشیاری سے اس جنگ کو مسلک کا تڑکا لگا کر عرب دنیا تک محدود کر دیا گیا ہے۔ عراق، شام، بحرین، یمن، سب جگہ عرب مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے اور اس گروہی اختلاف کو دو قوتیں آگ دکھا رہی ہیں۔ ایک وہ عرب حکمران جو قومی اور علاقائی ریاستوں پر مسلط ہیں اور اپنے اقتدار کا دفاع کر رہے ہیں اور دوسرا ایران جو سعودی عرب کے ساتھ ایک سرد جنگ کا شکار ہے جس کی بنیاد عرب و عجم جھگڑا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ عرب جو ایرانی بالادستی اور ایرانی افکار و خیالات تسلیم کر لیتے وہ ان کے دوست ہوتے باقی دشمن۔ یہی رویہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ایران سے پہلے تک تھا اور یہی آج دوبارہ ایران میں لوٹ آیا ہے۔ یہ دونوں قوتیں جس جنگ کو ہوا دے رہی ہیں، اس کا نتیجہ صرف اور صرف یہ نکل رہا ہے کہ ایسے تمام گروہ شدت سے قوت پکڑ رہے ہیں جو ایران اور سعودی عرب دونوں سے نفرت کرتے ہیں۔ عراق اور شام میں جنم لینے والی صورت حال نے وہاں آئی ایس کو جنم دیا جس نے سو سال پرانی قومی ریاستوں کی سرحدوں کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔ ایسے تمام گروہ جو القاعدہ کے نام پر وہاں کام کر رہے تھے، آئی ایس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ یمن کی صورتِ حال اس سے مختلف نہیں۔ شمال میں حوثی قبائل ہیں جو زیدیہ عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ جنوب میں القاعدہ کا سب سے منظم مرکز موجود ہے جسے تباہ کرنے کے لیے امریکہ ڈورن حملوں کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ موجود صورت حال میں حوثی قبائلی کو ایران نے مدد کی تو وہ اسلحہ اور سرمائے سے مسلح ہو کر صنعاء پر قابض ہو گئے۔ فوج چونکہ قبائل میں تقسیم تھی اس لئے درمیان کے علاقے میں اپنا کنٹرول واپس لینے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس جنگ نے القاعدہ کو جنوب سے مغرب اور شمالی کی جانب اپنے کنٹرول کو وسعت دینے کا راستہ دے دیا، ایسے حالات میں سعودی بمباری ایک اور انسانی المیے کو جنم دے گی۔ یہ بمباری سعودی عرب میں موجودہ شیعہ آبادی کو اپنے ساتھ ملانے اور سعودی عرب کو غیر مستحکم کرنے سے تو شاید روک پائے لیکن اس کے نتیجے میں القاعدہ کا عروج ایک لازمی نتیجہ ہے، اور پھر القاعدہ آخر کار اسلامی ریاست یا داعش میں ڈھل جاتی ہے جو پھر بھی سعودی عرب کے لیے خطرہ بنے گی۔ یہ سب یمن کا سیاسی، عسکری اور علاقائی تجزیہ ہے۔ لیکن وہ لوگ جو قرآن حکیم کی حکمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں حالات کو پرکھتے ہیں انہیں اس بات پر ذرا برابر بھی شک نہیں کہ یہ دورِ فتن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے بارے میں فرمایا "ایک ایسا فتنہ عرب کو گھیر لے گا جو بہرا، گونگا، اندھا ہو گا۔ جو کوئی اسے جھانک کر دیکھے گا وہ اسے اچک لے گا، اس فتنے میں زبان کو بے مہار چھوڑ دینا تلوار کے وار کی طرح ہو گا۔ (سنن ابن داؤد)۔ بہرا، گونگا اور اندھا فتنہ وہ ہوتا ہے جس میں حق واضح نہ ہو۔ آج کے دور کی اس لڑائی میں یوں ہی لگتا ہے کہ حق واضح نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ گروہوں کی لڑائی کو اللہ نے اپنا عذاب بتایا ہے۔ سورہ الانعام کی 65ویں آیت میں جہاں اللہ فرماتا ہے کہ میں قادر ہوں کہ تم پر آسمانوں سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب نازل کروں، وہیں تیسری جگہ فرماتا ہے "ی ل بس کم ش ی ع ا" یعنی تمہیں گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑا کر طاقت کا مزا چکھائیں"۔ یہ خانہ جنگی فتنہ بھی ہے اور عذاب بھی۔ لیکن یمن میں خیر کا ایک پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے یمن میں دو خزانے رکھے ہیں، ایک کو یرموک کے دن ظاہر کر دیا تھا جب قبیلہ "ازد" والے لوگوں کا تہائی تھے اور دوسرا خزانہ بڑی جنگ عظیم (جو آخری زمانے میں ہو گی) میں ظاہر فرمائیں گے، ستر ہزار فوجیوں کی تلواروں سے جن کا پٹہ سونے کا ہو گا (کتاب الفتن نعیم بن حماد) اس فتنے سے خیر نے برآمد ہونا ہے اور حق نے بالآخر غالب آنا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

گٹر ابلنے والے ہیں

بندگانِ الٰہی‘ درویشانِ خدا مست اور صاحبان بصیرت کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ کتنے ہیں جو اس قوم کو جھنجھوڑتے‘ ڈراتے‘ وعید سناتے ہوئے اپنے رب کے پاس جا پہنچے‘ لیکن نہ اس قوم کے رویوں میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی اس کی اکثریت نے اپنے اعمال پر نظر ڈالتے ہوئے اللہ کے حضور گڑ گڑا کر معافی طلب کی۔ ہر کوئی اپنی انا کے بت میں قید رہا۔ کسی نے اپنے عقیدے‘ مسلک اور نظریے کا بت خانہ سجایا اور اس کی سرمستی میں بے حال ہو کر دوسروں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ کسی کو دولت کا خمار چڑھا تو اسے پرواہ تک نہ رہی کہ روز کتنے لوگ بھوک سے خودکشی کرتے تھے یا غربت و بیماری سے لقمہ اجل بن جاتے تھے۔ اقتدار کی طاقت میں بدمست لوگوں کے دلوں سے خوف خدا تو رخصت ہوا ہی تھا‘ خوفِ فسادِ خلق بھی جاتا رہا۔ گولیوں سے بھون دو‘ بستیاں اجاڑ دو‘ گھرانے برباد کر دو اور پھر مسکراتے ہوئے اسے ریاست کی بالادستی کا نام دے دو۔ دھن‘ دھونس اور دھاندلی سے الیکشن جیتو اور اسے عوام کی رائے قرار دے دو۔ فوج کی طاقت سے آؤ تو انہی رہنماؤں کو ساتھ ملا کر اپنا چہرہ جمہوری بنانے کی کوشش کرو اور اگر جمہوری طور پر برسراقتدار آؤ تو آمریت کی تمام صفات اپنانے کے باوجود خود کو متحمل مزاج اور نرم خو کہلواؤ۔ اس ملک پر مر مٹنے کی قسمیں کھاؤ اور اسی ملک کو لوٹ کر اپنی جنت دوسرے ملکوں میں بساؤ۔ رنگ‘ نسل‘ زبان اور علاقے کے نام پر آنکھیں سرخ کرو‘ جتھے بناؤ‘ قتل کرو‘ بھتہ لو‘ اغوا برائے تاوان حاصل کرو۔

کفر کی بھی اخلاقیات ہوتی ہیں وہ ایک نظریے اور ارادے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے‘ لیکن جس ملک میں منافقت کا راج ہو جائے وہاں سے نظریہ‘ انصاف‘ سچ اور عہد کی پاسبانی رخصت ہو جاتی ہے۔ جس معاشرے کے تمام طبقات منافقت کا لبادہ اوڑھ لیں وہاں ریا اور دکھاوے کو زہد و عبادت کہا جانے لگتا ہے‘ ایسے میں کسی فضل الرحمٰن کو کروڑوں لوگوں کے سامنے عورتوں کے بارے میں ذو معنی فحش فقرہ کہہ کر مسکراتے ہوئے جھجک نہیں آتی۔ ایسے معاشرے میں ملاوٹ‘ ذخیرہ اندوزی اور جعل سازی سے مال بنانے کو اعلیٰ دماغ کاروباری صلاحیت کا نام دیا جاتا ہے۔ عہد اور وعدے کی حرمت ختم ہو جائے تو کسی آصف زرداری کو یہ فقرہ بولنے پر حیا نہیں آتی ہے کہ یہ عہد ہے کوئی قرآن و حدیث تو نہیں۔ انصاف جتھوں اور گروہوں میں بٹ جائے تو شیعہ کے نزدیک شیعہ‘ سنی کے مطابق سنی‘ وکیل‘ ڈاکٹر یا نرسوں کے گروہ سب اپنوں کو ہی جائز اور دوسروں کو بدترین مخلوق قرار دیں تو پھر ایسے معاشرے اس کائنات کے مالک کی ناراضگی کو آواز دے رہے ہوتے ہیں۔ نسیم انور بیگ مرحوم کہا کرتے تھے کہ کچھ کشتیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ڈوبنا ان کے نصیب میں نہیں ہوتا‘ وہ مستقل طوفان کے تھپیڑوں میں رہتی ہیں۔ ہماری کشتی بھی ایسی ہے۔ بقول غالبؔ "مرتے ہیں آرزو پہ مرنے کی۔

موت آتی ہے پر نہیں آتی"۔

کشتی میں سوار جب سب کے سب منافقت اوڑھ لیں اور پھر اسے ایک طرز زندگی اور سسٹم کا نام دینے لگ جائیں اور پھر جب بھی اسی کشتی میں چند آوازیں ان کے خلاف اٹھیں تو وہ سب کے سب اس سسٹم کو بچانے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس فقرے پر حیرت نہیں ہوئی بلکہ میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا کہ جب پارلیمنٹ کی فضا سے یہ آواز گونجی کہ "دھاندلی تو بہت زیادہ ہوئی ہے لیکن ہم اس پارلیمنٹ کو بچانا چاہتے ہیں" لیکن پھر مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی جب پتہ چلا کہ یہ الفاظ اعتزاز احسن نے کہے تھے۔ میرے شہر کا یہ سیاست دان سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اس لیے نوکری اختیار نہیں کرتا کہ وہاں اصولوں پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ پیپلز پارٹی میں شامل ہوتا ہے۔ 1975ء میں انور سماں ایم پی اے قتل ہو جاتا ہے۔ اعتزاز احسن کو ٹکٹ ملتا ہے اور ڈپٹی کمشنر کو یہ حکم نامہ ملتا ہے کہ خبردار اس کے خلاف کوئی کاغذات نامزدگی جمع نہ کرائے‘ اور اگر کروائے تو اسے بزور واپس لینے پر مجبور کیا جائے۔ گجرات کا بچہ بچہ جو اس دور میں سانس لیتا تھا وہ اس سرکاری دھاندلی اور دھونس سے آگاہ تھا۔ میں زمیندار ڈگری کالج یونین کا سربراہ تھا۔ ہم احتجاجاً ڈپٹی کمشنر سے ملے۔ بزرگوں کی طرح سمجھاتے ہوئے اس نے کہا تم نوکری میں آؤ گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ حکمران ہمیں کس طرح خوفزدہ کر کے غلط کام کرواتے ہیں اور ہماری کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ عظیم لیڈر اعتزاز احسن "بلامقابلہ" انتخاب جیت گیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا پہلا بلامقابلہ انتخاب تھا۔ وہ طریقہ جس نے اس کے زوال کی راہ ہموار کی۔ اعتزاز احسن اس ضلع سے بلامقابلہ جیتا جہاں چوہدری ظہور الٰہی کی صورت مضبوط اپوزیشن موجود تھی۔ یوں اس سیاسی لیڈر کا کیریئر ایک "بلامقابلہ" اور "شفاف" الیکشن سے اٹھا۔ 1970ء میں سول سروس چھوڑ کر میری آنکھوں میں ہیرو بننے والا شخص چکنا چور ہو گیا لیکن صرف دو سال بعد 1977ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو کی انتخابی دھاندلی کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو شاید ایک بار پھر اس کے ضمیر نے اسے آواز دی۔ وہ پیپلز پارٹی کا دوسرا لیڈر تھا جس نے احتجاجاً پارٹی چھوڑی۔ پہلا سردار شوکت حیات اور دوسرا اعتزاز احسن۔ مال روڈ کے جلوسوں میں اس کے حق میں نعرے لگے اور پھر وہ ائر مارشل اصغر خان کی تحریک استقلال میں شامل ہو گیا۔ وہی اصغر خان جس نے فوج کو بھٹو حکومت کے خاتمے کے لئے خط تحریر کیے تھے۔ 16 دسمبر 1985ء تک یہ اسی سیاسی پارٹی سے منسلک رہا۔ اس کے بعد کی کہانیاں سب جانتے ہیں۔ اپنی شعلہ بیانی اور دلیل کی دنیا میں رہتے ہوئے اس نے ایک ایسی دلیل دے دی ہے جسے مان لیا جائے تو اس دنیا میں ہر ظلم اور زیادتی کو سسٹم کے نام پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیا وہ کل کسی عدالت میں یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے زبردستی سسٹم کے منظور شدہ رجسٹرڈ نکاح خواں سے نکاح پڑھوا گیا ہے‘ اس لئے لڑکی کے ماں باپ اب اغوا کرنے والے کو داماد قبول کر لیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ جمہوریت کی اکثریت میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اگر چند ہزار لوگ اکٹھے ہو جائیں تو ہم ان کی بات کیوں مانیں۔ پورا شہر اگر اس لڑکی سے زیادتی کرنے والے کے ساتھ ہو جائے اور صرف اکیلے ماں باپ دہائی دیں تو کیا سچ کی قبر بنا دی جائے۔ سچ بھی وہ کہ جسے آپ خود مانتے ہوں۔ مجھے سراج الحق صاحب پر حیرت نہیں ندامت ہوئی۔ اس لیے کہ میری ایک عمر وہاں گزری ہے۔ کیا اللہ کے ہاں سراج الحق صاحب جواب دیں گے کہ ہم نے کراچی میں الیکشن کا دھاندلی کی بنیاد پر بائیکاٹ کرتے ہوئے سچ بولا تھا مگر آج اس سچ سے منہ پھیر لیا کہ ہم سسٹم اور جمہوریت بچانا چاہتے تھے۔ کیا اللہ ان کی یہ دلیل مان لے گا۔ کیا روز حشر اللہ سچ کے مقابلے میں جمہوریت کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ درویشان خدا مست کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ گٹر دیکھتے جاؤ سب ایک ساتھ ابلیں گے۔ سب کے چہرے بے نقاب ہوں گے۔ یہ ملک اللہ کی غیرت کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ جس جس نے کھلواڑ کیا اس کی سزا تحریر ہو چکی۔ کوئی اپنی فتح پر پھولا نہ سمائے‘ نہ پارلیمنٹ والے اور نہ دھرنے والے۔ یہ میرے آقا کی بشارتوں کی سرزمین ہے۔ یہاں جس نے کانٹے بوئے ہیں اسے اپنی آنکھوں سے چننے ہوں گے۔ کہتے ہیں فساد ہوگا‘ انارکی ہو گی۔ ایسے سسکتے ہوئے منافق معاشروں میں کیا امن کی فصل اگا کرتی ہے؟۔ ریا کے پردے چاک ہوں گے۔ جس نے مسلک‘ عقیدے‘ رنگ نسل اور زبان پر خون بہانے کی دعوت دی وہ خود اس خون کی اذیت کا مزا چکھے گا۔ میں نے درخواست کی رحم کی دعا کیجیے۔ فرمانے لگے جب سزا شروع ہو جائے تو بولا نہیں کرتے اللہ جب سزا دیتا ہے تو اس میں سے یقیناً خیر برآمد ہوتی ہے۔ لوگوں کو ایک بار پھر سنا دو اللہ کی سزا کے کیا روپ ہیں۔ سورہ الانعام کی 65ویں آیت "کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے‘ یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے‘ یا تمہیں مختلف گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑوائے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا دے۔ دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں واضح کر رہے ہیں تاکہ یہ کچھ سمجھ سے کام لیں"...... بارشیں‘ طوفان‘ سیلاب‘ زلزلے اور آپس میں شدید خونریزی‘ یہ سزا کے موسم کی علامتیں ہیں۔ کہا...... گٹر ابلیں گے گندگی کھل کر سامنے آئے گی‘ بدبو اور تعفن سے تنگ آئی ہوئی خلق خدا ایک دن سب صاف کر دے گی۔ دیکھتے جاؤ۔ سزا شروع ہو جائے تو بولا نہیں کرتے۔

KitaabPoint.blogspot.com

گلیڈی ایٹر

رومی بادشاہت کی ایک علامت وہ بہت بڑا اسٹیڈیم ہے جو آج بھی ایک یادگار کے طور پر اٹلی میں موجود ہے۔ یہ آدھا ٹوٹا ہوا اسٹیڈیم کبھی لاکھوں لوگوں کو اپنے اندر سمو لیتا جو کھیل تماشا دیکھنے کے لئے وہاں جمع ہوتے۔ سب سے دلچسپ مرحلہ اس وقت آتا جب ایک انتہائی وجیہہ، طاقتور اور پرشکوہ شخص میدان میں داخل ہوتا۔ وہ پورے ہجوم کی آنکھ کا تارا ہوتا۔ تالیوں، چیخوں سیٹیوں اور نعروں کی گونج میں اس شخص کو ایک خوفناک معرکے کا سامنا ہوتا۔ میدان کے ایک جانب پنجرے سے کوئی بھوکا شیر، بھیڑیا یا کوئی اور خونی جانور چھوڑ دیا جاتا۔ اس شخص کا میدان میں اترنے کا مقصد اس بھوکے خونخوار جانور سے لڑنا ہوتا۔ اس شخص کو گلیڈی ایٹر کہا جاتا تھا۔ پہلے پہل یہ لوگ جنگی قیدی ہوتے۔ ان میں سے جس کی صحت اچھی ہوتی اسے کسی تیاری کے بغیر میدان میں اتارا جاتا۔ اچانک شیر یا بھیڑیا کھول دیا جاتا اور وہ شخص جان بچانے کی جدوجہد کرنے لگتا۔ یہ سب کچھ بادشاہ، وزرا اور عوام کے لئے دلچسپ کھیل ہوتا۔ آہستہ آہستہ روم کی بادشاہت کے رنگارنگ کھیلوں کا یہ سب سے اہم حصہ بن گیا۔ اسے نہ صرف سرکاری سرپرستی حاصل تھی بلکہ عوام بھی اس خونخوار کھیل کے دیوانے بنتے گئے۔ پورے روم میں گلیڈی ایٹرز کو پالنے پوسنے، تربیت دینے اور درندوں سے جنگ کرنے کے گر سکھانے کے مرکز بن گئے۔ بڑے بڑے رئیس اور سرمایہ دار اپنے لئے ایک یا ایک سے زیادہ گلیڈی ایٹر مخصوص کرتے، اس کے لئے باقاعدہ گائیڈ رکھے جاتے، اسے معاشرے سے کاٹ کر ایک مخصوص ماحول میں رکھا جاتا۔ اس کی خوراک، ورزش اور دوسری مہارتوں کا پورا اہتمام کیا جاتا۔ جب سالانہ کھیلوں کا وقت آتا تو آجکل کی طرح انہیں سجا سنوار کر بازاروں میں سے گزارا جاتا۔ لوگ ان کی خوبصورتی اور دلکش جسمانی تشکیل کی تحسین کرتے۔ عورتیں ان پر فریفتہ ہو جاتیں۔ کھیلوں سے کئی دن پہلے روزانہ یہ عمل دہرایا جاتا۔ یوں یہ کھیل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کھیل کی تعریف وستائش اس حد تک بڑھی کہ عام لوگ بھی گلیڈی ایٹر بننے کے لئے خود کو پیش کرنے لگے۔

معاشرہ جب کسی درندگی اور بربریت کو مقبولیت کا درجہ دے دے، اس کا مقام بلند کر دے تو پھر لوگوں کو اس میں ظلم یا درندگی کی بُو نہیں آتی۔ روم پر ایسا وقت بھی آیا کہ سٹیڈیم میں یہ مقابلہ صرف امرا و شرفا تک محدود کر دیا گیا اور غریب لوگ میدانوں میں اس طرح کے شو منعقد کرواتے جیسے ہمارے ہاں ریچھ اور کتے کی لڑائی ہوتی ہے۔ جو گلیڈی ایٹر لڑائی کے دوران ثابت قدم رہتا، اس پر خوف کے آثار نمایاں نہ ہوتے تو اسے روم کا عظیم سپوت تصور کیا جاتا اور اس کی موت کو ایک یادگار موت قرار دیا جاتا۔ 66 قبل مسیح میں بادشاہ نیرو نے آرمینیا کے بادشاہ ٹراوٹیس کو خوش کرنے کے لئے حبشہ سے لائی گئی عورتوں کو اسی طرح درندوں کے سامنے ڈالا اور انہیں کہا گیا کہ وہ ان سے لڑیں اور ان کو قابو کرنے کی کوشش کریں۔ یوں یہ سلسلہ صرف مردوں تک محدود نہ رہا۔

گلیڈی ایٹر کا زمانہ بیتے صدیاں ہو گئیں۔ کل کا مقبول عام کھیل آج کی درندگی ہے۔ لیکن آج بھی ہم موت اور بربریت کے اس کھیل کو کسی نہ کسی شکل میں عزت و تکریم دے کر مقبولیت کے درجے پر پہنچا رہے ہیں۔ خودکش حملہ آوروں کو مخصوص گروہوں میں عزت و توقیر دی جانے لگی ہے۔ اس کے پیچھے ایک لالچ ہوتا ہے، آخرت کا لالچ۔ اس کی بنیاد میں نفرت اور انتقام بھی ہوتا ہے۔ کسی کا گھر اجڑا ہوتا ہے، کسی کا بیٹا مارا گیا ہوتا ہے لیکن نفرت اور انتقام کے ساتھ جب اگلے جہان میں اعلیٰ مقام کا حصول یقینی ہو جائے تو اس دو آتشہ نسخے سے آپ جو کھیل چاہیں کھیل لیں۔ گلیڈی ایٹر ان محرکات سے نہیں بنتا تھا۔ اسے تو بس ایک منظر کی دلکشی کھینچ لاتی تھی کہ جب فلاں شخص شیر کے ساتھ گھنٹوں لڑنے کے بعد مر گیا تو بادشاہ خود اپنی کرسی سے اٹھا، جھک کر سلام کیا، پورا اسٹیڈیم تعظیم میں جھک گیا۔ اس کی موت کو عظیم لمحہ بنا دیا گیا اور اسے ایک لازوال ہیرو کا درجہ مل گیا!

گزشتہ چند دنوں سے میں عالم حیرت میں ہوں۔ مجھے اس بچی کی معصومیت اور مظلومیت پر ویسے ہی رونا آ رہا ہے جیسے مجھے روم کے گلیڈی ایٹرز کے تذکرے پڑھ کر آتا تھا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک بچی کو لاشعوری طور پر ایک ایسے میدان جنگ میں اتارا جاتا ہے جس کا اسے علم تک نہیں۔ اسے نہ اس کے ہیرو کا پتہ ہے اور نہ ولن کا۔ میدان میں اترتے ہی اسے ویسی پذیرائی ملتی ہے جیسے روم کے میدان میں گلیڈی ایٹر کو۔ بچی کو معلوم تک نہ تھا کہ پنجروں سے خوفناک شیر اس کی طرف لپکنے والے ہیں۔ ایک زمانے میں گلیڈی ایٹر کی تعریف و توصیف روم میں ڈھول کی تھاپ پر کی جاتی تھی۔ اس بچی کو بھی پوری دنیا کے سامنے ایسا جنگجو بنا کر پیش کیا گیا جسے بڑے بڑے سورماؤں کو شکست سے دوچار کرنا ہے۔ میڈیا کی چکا چوند بچی کے لہجے اور چہرے میں اعتماد لے کر آتا ہے۔ دنیا بھر کی پذیرائی اسے اس سجے سجائے میدان جنگ میں اور پرعزم بنا دیتی ہے۔ وہ جسے گلیڈی ایٹر کی طرح کل تک معلوم ہی نہ تھا کہ اسے کیوں تیار کیا جا رہا ہے، اس قدر شہرت کی بلندی پر اسے اپنی فتح تصور کرتی ہے۔

گلیڈی ایٹرز زندہ رکھنے کے لئے نہیں ہوتے' ان کی موت کو ایک عظیم واقعہ کے طور پر زندہ رکھنا ہوتا ہے! آپ حیران ہوں گے کہ وہ امریکہ جس کے لاس اینجلس کے بیورلے ہلز میں شاید کسی کو یہ علم تک نہ ہو کہ پاکستان کس بلا کا نام ہے اور پاکستانی کون ہوتے ہیں' وہاں میڈونا اپنی کمر پر اس کا نام لکھ کر اس معصوم گلیڈی ایٹر کو امر کرتی ہے۔ دنیا کا کوئی اہم شخص ایسا نہیں جس نے روم کے بادشاہ کی طرح جھک کر اسے سلام نہ کیا ہو۔ امریکہ کا صدر اوباما اور اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل بانکی مون ایسا کریں گے تو پوری دنیا جو ایک سٹیڈیم بن چکی ہے، وہاں کیا عالم ہو گا؟ وہ سٹیڈیم جہاں روزانہ کوئی نہ کوئی اپنا گلیڈی ایٹر لے کر آتا ہے اور اسے درندوں کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ کوئی مذہب کے نام پر، کوئی نسل، رنگ اور علاقے کے نام پر۔ روز ہزاروں گلیڈی ایٹر مر رہے ہیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے پرستار ہیں، ہر ایک کی موت پر اپنے اپنے خراج عقیدت پیش کرنے والے ہیں۔ اس تعریف و توصیف سے متاثر ہو کر اگلے دن اور گلیڈی ایٹر میدان میں کودتے ہیں کہ موت کے بعد اتنا خراج عقیدت ہمارا مقدر کیوں نہ ہو۔ مجھے خوف آتا ہے کہ جہاں پوری دنیا ایسی موت کی تعریف و توصیف اور قصیدہ گوئی میں مصروف ہو جائے وہاں کل موت کے اس کھیل کا دائرہ کتنا وسیع ہو جائے گا؟ زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑی اس بچی کو شاید علم تک نہ ہو کہ اس کی اذیت سے کسی اولمپک کھیل کی مشعل روشن کی جا رہی ہے۔ میدان میں کھڑے کروڑوں معصوم لوگوں کو علم تک نہ ہو گا کہ اچانک پنجرے کھلیں گے اور بھوکے درندے ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ کچھ دن بازار سجے گا' کھیل تماشا ہو گا' پورا اسٹیڈیم لاشوں سے پٹ جائے گا' بچے کھچے لوگ ملبے کے ڈھیر سے دوبارہ شہر آباد کریں گے، امن و سکون کی خواہش کریں گے اور مرنے والوں کی یادگاریں تعمیر کی جائیں گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

خاندانِ بنو عباس کا سورج بام عروج پر تھا۔ یہی زمانہ تھا جب مسلمانوں نے دنیا بھر کے علوم کو عربی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ ایک بہت محنت طلب اور صبر آزما کام تھا، لیکن لگن کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے کسی کونے میں بھی کوئی کتاب میسر آتی مسلمان اسے حاصل کرنے جا پہنچتے۔ لوگوں کو اس جنون کا علم ہوا تو انہوں نے کتب کو سونے کے بھاؤ ان کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کر دیا اور یہ بلا تامل خرید لیتے۔ سرکاری سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ مامون الرشید کے زمانے میں ایک مترجم کی ماہانہ تنخواہ تیس ہزار دینار (یعنی سونے کے سکے) تھی۔ ترجمے کی اس تحریک کا آغاز عباسی خلیفہ المنصور (754-775ء) کے زمانے میں ہوا۔ پہلی دو کتب جن کا ترجمہ کیا گیا وہ سنسکرت میں تھیں جنہیں ہندوستان سے منگوایا گیا تھا۔ ایک فلکیات پر کتاب تھی اور دوسری برہم گپت کی سوریا سدھانتا تھی۔ اس کا ترجمہ ابراہیم الفرازی نے زیج السند ہند الکبیر کے نام سے کیا۔ بیت الحکمت قائم کیا گیا جو نہ صرف ایک یونیورسٹی تھی بلکہ دار ترجمہ، لائبریری اور لیبارٹری کی وسعت بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ یہیں قرآن، حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ یہ تمام جدید علوم پڑھائے جاتے تھے۔ یونانی فلسفہ تھوڑا بہت سریانی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا، اسے عربی میں منتقل کیا گیا اور پھر اصل یونانی ماخذ کو بھی ترجمہ کر کے دنیا کو اس قدیم علم سے آشنا کیا گیا۔ یونانی فلسفے نے اس دور کے مسلمانوں میں عقلیت پسندی کا ایک دروازہ کھول دیا۔ ایسی علمی بحثوں کا آغاز ہوا جو آج تک ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ فلسفہ کے بنیادی سوالوں نے ان عقلیت پسندوں کو ایک کسوٹی عطا کر دی جس پر وہ قرآن و سنت کے احکامات کو پرکھنے لگے۔ جو عقل کی اس کسوٹی پر پورا اترتا اسے تسلیم کرتے اور باقی کو متروک سمجھ کر رد کر دیتے۔ عباسی خلفاء ان عقلیت پسندوں جنہیں معتزلہ کہتے تھے، ان کے زیر اثر تھے۔ اس زمانے میں جس فتنے نے سر اٹھایا وہ خلق قرآن تھا۔ قرآن کو اللہ کی ایک مخلوق ثابت کرنے میں عقلیت پسندوں کی ایک گہری سازش چھپی ہوئی تھی کہ اس طرح وہ اس کی حیثیت ثانوی کر دیں گے اور جس طرح ہر تخلیق میں روز بروز تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسی طرح اس میں بھی ایک راستہ نکل آئے گا۔ ایسے میں اس وقت کے دو جلیل القدر فرزندوں نے ثابت قدم رہ کر اپنی قربانی سے اس فتنے کا راستہ روکا۔ ایک امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے شیخ نعیم بن حمادؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ تو مسلسل چلا آیا ہے کہ ان کے نام سے ایک مسلک کی بنیاد ہے، لیکن شیخ نعیم بن حمادؒ کا تذکرہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔

سیدنا عمرؓ کے زمانے میں احنف بن قیسؓ نے جب خراسان فتح کیا تو اس معرکے میں عرب کے قبیلے الخزاعی نے شجاعت کے جوہر دکھائے۔ خراسان یزدگرد کی آخری پناہ گاہ تھی۔ وہ اس کے شہر مرو شاہجان میں چھپا بیٹھا تھا۔ خراسان فتح ہوا تو الخزاعی قبیلے کو یہاں آباد ہونے کیلئے کہا گیا جن کی موجودگی سے آج پورے افغانستان، ترکستان اور بقیہ خراسان میں اسلام کی مشعل روشن ہوئی۔ اسی قبیلے کے ایک گھر میں دوسری صدی ہجری میں نعیم بن حماد پیدا ہوئے۔ علم کی طلب انہیں بغداد لے آئی جہاں امام عبداللہ بن مبارک ان کے ابتدائی اساتذہ میں سے تھے۔ آپ نے امام ابو حنیفہ کے تلامذہ سے براہ راست علم حاصل کیا، لیکن حدیث کے بارے میں ان کے بہت بڑے کام کی ایک وجہ بنی۔ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے تھے "تم وہی ہو نہ جو ہماری احادیث کو نظر انداز کر دیتے ہو۔" نعیم بن حماد نے گھبرا کر کہا یا رسول اللہؐ! آپ مجھے مختلف ابواب میں احادیث عطا کر دیجئے تاکہ میں آپؐ کے ارشادات سے ہر بات اخذ کر لیا کروں۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعیم بن حماد کو سینے سے لگایا اور اس کی برکت دیکھئے کہ احادیث کا مجموعہ یعنی المسند تصنیف کرنیوالے پہلے شخص تاریخ میں نعیم بن حمادؒ ہی ہوئے۔ باقی تمام مسندات ان کے بعد تصنیف ہوئیں۔ احادیث کو رجال کی کسوٹی پر پرکھنے اور احادیث کی درجہ بندی کا کام ان کے بعد شروع ہوا جس عمل کے امام دراصل امام بخاری تھے۔ اسی لئے نعیم بن حمادؒ کی مسند میں معلق، مرسل، منقطع، صحیح، حسن، مدلس، مرسل، موضوع، متروک اور منکر سب طرح کی احادیث جمع ہیں۔ بغداد میں معتزلہ کا عروج ہوا تو نعیم بن حماد مصر چلے گئے۔ مامون الرشید کے بعد معتصم خلیفہ بنا تو علماء کو خلق قرآن کا قائل کرنے کے لئے تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اس فتنے کے ڈر سے علماء کی اکثریت خاموش ہو گئی لیکن امام احمد بن حنبلؒ اور شیخ نعیم بن حماد کی استقامت بلا کی تھی۔ نعیم بن حماد کو مصر سے امام شافعی کے مشہور شاگرد یوسف بن یحییٰ البویطی کے ساتھ بیڑیوں میں جکڑ کر بغداد لایا گیا۔ خلق قرآن کے حق میں بیان نہ دینے پر نعیم بن حمادؒ کو سامرا کے قید خانے میں قید کر دیا گیا جہاں وہ سات سال قید رہے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے وصیت کی کہ مجھے بیڑیوں سمیت دفن کیا جائے کہ میں اپنے مخالفین کی اللہ کے حضور اسی حالت میں مخاصمت کرنا چاہتا ہوں۔ جیل حکام نے انہیں اسی طرح بیڑیوں کے ساتھ گڑھے میں ڈال دیا۔ نہ کفن دیا گیا اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

نعیم بن حماد کو امام العلامات کہا جاتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو ایک جگہ جمع کیا ہے جو آخری زمانے یعنی قیامت سے پہلے کے زمانے کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمائیں۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حذیفہ بن یمانؓ ایسے صحابی تھے جنہوں نے دور فتن کے بارے میں رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ علم حاصل کیا۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ فرماتے ہیں "لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں سوال کرتے اور میں شر کے بارے میں سوال کرتا۔ اس خوف سے کہ کہیں شر مجھے پکڑ نہ لے (بخاری و مسلم) یہی کیفیت محدثین میں نعیم بن حمادؒ کی ہے۔ آپ نے وہ تمام روایات ایک کتاب میں جمع کر دی ہیں جو آخر الزمان یا دور فتن کے بارے میں ہے۔ اس حدیثوں کے مجموعے کو "کتاب الفتن" کا نام دیا گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ تمام احادیث کی کتب کے تراجم ہوئے لیکن کتاب الفتن صرف عربی میں شائع ہوتی رہی اور اب تو عربی میں بھی ناپید ہو گئی۔ آخری دفعہ مصر سے پچاس سال قبل شائع ہوئی۔ العلم ٹرسٹ نے آج سے دو سال قبل اس کے ترجمے کے کام کا آغاز کیا۔ احادیث کے ترجمے میں احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے ماہر علماء کی جانچ پرکھ سے گزارا گیا اور اب نعیم بن حمادؒ کی کتاب الفتن ترجمے کے ساتھ چھپ کر مارکیٹ میں آگئی ہے جسے علم و عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور نے بڑی محنت سے طبع کیا ہے اور اس کی تمام آمدنی کو العلم ٹرسٹ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ آج کے دور فتن میں احادیث کی اس کتاب کی جس قدر ضرورت تھی وہ علماء اور اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کتاب کو طباعت کے مرحلے سے گزارنے کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ اسماء الرجال کے ماہر اساتذہ اس کی احادیث کو رجال کی کسوٹی پر پرکھ کر ترتیب دیں اور دوسرا کتاب الفتن میں درج حضرت حذیفہ بن یمانؓ کی حدیث کہ آخری دور میں یہ فتنے ایسے لمبے ہو جائیں جیسے گائے کی زبان لمبی ہوتی ہے۔ ان فتنوں میں اکثر لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ البتہ وہ رہیں گے جو پہلے سے ان فتنوں کو پہچانتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس دور فتن میں فتنوں کو پہنچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ کتاب الفتن کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا العلم ٹرسٹ کا یہی مقصد اور مدعا ہے۔ بقول اقبال

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

KitaabPoint.blogspot.com

حکومت، علمائے کرام، سول سوسائٹی، میڈیا اور عدم برداشت

صرف مغرب کے سنجیدہ لکھنے والے ہی نہیں بلکہ وہ لوگ جو ایک روشن خیال، مرنجان مرنج اور موجودہ مغربی تہذیب سے متاثر اسلام کو مسلمانوں کے لیے ترقی کا راستہ تصور کرتے ہیں، اس بات پر حیران ہیں موجودہ دور میں بہت سے مفکرین کی محبوب "اسلامی جمہوریت" کے ماڈل ترکی سے ایک ہزار کے قریب افراد جہاد کرنے کے لیے شام میں نئی قائم شدہ خلافت کے پاس جا پہنچے ہیں۔ یہ تمام کے تمام مرد ہیں اور ان میں وکیل، تاجر، یونیورسٹیوں کے طلبہ، اور سرکاری محکموں اور نجی کمپنیوں کے ملازمین شامل ہیں۔ ان میں سے اکثریت شادی شدہ افراد کی ہے۔ ان کی اوسط تعلیم عام ترکی کے عوام سے کہیں زیادہ ہے، جبکہ ان کی اوسط عمر 27 سال ہے۔ ترکی جس میں جمہوری نظام کا تسلسل 1951 سے چلا آرہا ہے اور یہ سمجھا جا رہا تھا اب یہاں شدت پسندی کا خاتمہ ہو چکا، کیونکہ دنیا میں ماہرین نے یہ تاثر عام کیا ہے کہ جہاں جمہوریت یا پھر "اسلام جمہوریت" ہو وہاں شدت پسندی نہیں پنپ سکتی۔ گذشتہ پندرہ سالوں سے جاری دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ترکی کے عوام میں سے کسی گروہ نے القاعدہ یا کسی جہادی گروہ کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کے بارے ایک یہ بھی دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ وہاں 2002 سے ایک روشن خیال اسلام کی نمائندہ پارٹی برسرِ اقتدار ہے، جو اپنے بیانات اور عالمی سطح پر اپنے موقف کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والے غم و غصہ کو کم کر دیتی ہے۔ برما کے مسلمان ہوں یا اسرائیل جارحیت، ترکی کا موقف ایسا ہوتا ہے کہ ترکی کے مسلمان مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہاں سے کوئی شدت پسندی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اس سب کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تصور کی جاتی ہے کہ ترکی میں ایک مضبوط سول سوسائٹی موجود ہے۔ یہ سول سوسائٹی بھی ایک عجیب مخلوق ہے۔ یہ جن مسلمان ملکوں میں موجود ہے وہاں اس کو ایک خاص ایجنڈے کے ساتھ منظم کیا گیا ہے۔ دنیا بھر کے ممالک انہیں مختلف پراجیکٹس کے نام پر رقوم فراہم کرتے ہیں۔ اس سول سائٹی کا اصل کام ان موضوعات پر آواز اٹھانا ہوتا ہے جن سے اسلام یا مسلمانوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو اور ان سیکولر قوم پرست تنظیموں کی جماعت سڑکوں پر نکلنا ہوتا ہے جو معاشرے میں انتشار پیدا کر کے لوگوں کو اسلام نہیں بلکہ قومیت کے نام پر اکٹھا کریں۔ ترکی جیسی حکومت کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سول سوسائٹی کے لیے بھی قابلِ قبول ہوتی ہیں کہ وہ اس مغربی جمہوریت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو ان کو قبول ہے لیکن انہیں ووٹ ایسے لوگوں نے دیئے ہوتے ہیں جو اسلام کی اصل روح یعنی خلافت راشدہ کے آئیڈیل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے جب ترکی کی حکومت کسی طور پر بھی جہادی گروہوں کے خلاف کارروائی نہیں کرتی، عالمی سطح پر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیتی یا پھر ایسے قوانین منظور کرنے کی کوشش کرتی ہے جو مغربی طرزِ زندگی کے خلاف ہیں تو یہ سول سوسائٹی سڑکوں پر نکل آتی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال اس وقت سامنے آئی جب داعش نے شام کے شہر کوبانی پر حملہ کیا تو ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ہنگامے پھوٹ پڑے اور پچاس کے قریب لوگ مارے گئے۔ مطالبہ یہ تھا کہ ترکی کی حکومت شام میں داعش کے خلاف کردوں کی حمایت کرے۔ حکومت مجبور ہو کر کردوں کو امداد بھی دینے لگی اور ٹریننگ بھی۔ لیکن کبھی بھی ترکی کی اس سول سوسائٹی نے ترکی کی حکومت کو نہیں کہا کہ افغانستان اور عراق میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف وہاں کے عوام کا ساتھ دے۔ بلکہ ترکی کی یہ "اسلامی جمہوریت" جو آجکل ہمارے بہت سے اقامتِ دین کے اسلامی رہنماؤں کی آئیڈیل ہے اس کی افواج نیٹو کے ساتھ مل کر افغانستان میں موجود رہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ میں برابر شریک بھی رہیں۔

دنیا کے سنجیدہ تجزیہ نگار اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور دنیا بھر کا پریس ان تجزیات سے بھرا پڑا ہے کہ ترکی کی سول سوسائٹی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جب ایک ایسا رویہ اختیار کرتی ہے جس کے نتیجے میں حکومت کمزور پڑ جاتی ہے تو پھر وہاں شدت پسندی کو عروج حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ جنہوں نے اس حکومت کو ووٹ دیئے ہوتے ہیں وہ اسلام کی ایک ایسی تصویر چاہتے ہیں جو دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کی آواز بھی ہو اور ملک میں بھی معذرت خواہانہ رویہ نہ رکھے۔ یہی مایوسی انہیں شدت پسند بھی بناتی ہے اور جہادی بھی۔ کسی بھی ملک میں ایسا رویہ پوری قوم کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طرف سول سوسائٹی اور این جی اوز ہوتی ہیں جو ہر اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دیتیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو اور دوسری جانب وہ شدت پسند لوگ ہوتے ہیں جو مذہبی گروہوں کے بدترین ظلم پر بھی مذہبی لوگوں کا دفاع کرتے پھرتے ہیں۔

پاکستان مکمل طور پر اس طرح کے دو گروہوں پر تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک طرف سول سوسائٹی اور این جی اوز ہیں جو بلوچستان کے لیے تو آواز اٹھاتی ہیں، کسی خاتون پر تشدد کے خلاف باہر نکل آتی ہیں، کسی مدرسے میں ہونے والے واقعے پر احتجاج کرتی ہیں لیکن جہاں کہیں عام مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور بربریت ہوتی ہے ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ یہ عراق اور افغانستان میں امریکہ نواز حکومت کے ظلم پر بھی خاموش رہتی ہیں اور کشمیر میں ایک لاکھ شہدا کے قتل پر بھی لیکن دوسری جانب اگر ایک شدت پسند گروہ کوڑے بھی لگا دے تو مہینوں احتجاج جاری رہتا ہے۔ میڈیا ان کے فنانسرز، کارپوریٹ سرمائے سے چلتا ہے اس لیے ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ان کے دباؤ میں حکومت خاموش رہتی ہے اور جواب میں وہ شدت پسند گروہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو کوٹ رادھا کشن جیسے بہیمانہ اور ظالمانہ واقعہ کا بھی دفاع کرنے لگتے ہیں یا پھر اس پر بدترین خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ پسند کی شادی کرنے پر قتل ہونے والے جوڑے پر سول سوسائٹی شور مچاتی ہے اور دوسرا گروہ خاموش اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب کہ ایسی ہزاروں مثالیں موجود میں جن میں پسند کی شادی کے بعد لڑکوں نے لڑکیوں کو بازارِ حسن میں بیچ دیا یا ان سے دھندا کروایا۔ اس ظلم پر سول سوسائٹی چپ سادھ لیتی ہے اور دوسرے گروہ کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ دونوں گروہ اس حد تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں کہ ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ اور دوسرے کا سچ پہلے کا جھوٹ ثابت کرنے میں ساری توانائیاں صرف کرنے میں مصروف ہیں اور تماشہ وہ مظلوم عوام ہیں جو ان دونوں کے لیے بزکشی کے کھیل میں درمیان میں پڑی ہوئی بکری کی طرح ہیں جس کو ہر کوئی اپنے ایجنڈے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

کوٹ رادھا کشن میں عیسائی جوڑے کا دل دہلا دینے والا واقعہ اگر بڑے مدرسوں کے مہتمم علماء کو دہلا نہیں سکا، ان کی نیندوں کو اس نے حرام نہیں کیا تو یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس لیے کہ اس واقعہ میں ان کے تیار کردہ مساجد کے امام کا بھی کردار تھا جو لاؤڈ سپیکر پر خلقِ خدا کو اکٹھا کرتے رہے۔ کیا اس رویے کے بعد ایک عام شخص اسلام کی حقانیت کے لیے ان کے دروازے پر دستک دے گا؟ ان علماء کرام کو سب سے پہلے اس جوڑے کے حق میں سڑکوں میں نکلنا چاہیے تھا کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمانوں کے درمیان بسنے والے غیر مسلموں کا میں ضامن ہوں"۔ یہ علمائے کرام نکل پڑتے تو کسی سول سوسائٹی کو بات کرنے کی راہ نہ رہتی۔

دوسری جانب انہی دنوں میں ایک معروف نجی یونیورسٹی کے ایک استاد جو مقبول سیاسی والدین کے فرزند ہیں، ان پر اپنی ایک طالبہ کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگا تو سول سوسائٹی اور تجزیہ نگار جنسی طور پر ہراساں کرنے کی تعریف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ انہیں اس طالبہ سے کوئی دلچسپی نہ رہی بلکہ اس بات پر بحث کرتے رہے کہ یہ جنسی تشدد بنتا ہے یا نہیں۔ جس پر وفاقی محتسب نے اسے نوکری سے نکالنے کے لیے کہا گیا، جبکہ یونیورسٹی کی انتظامیہ کی انکوائری کہتی ہے کہ یہ ایک استاد کے مقام سے گری ہوئی بات ہے اس لیے کہ تم اپنی شاگرد سے معافی مانگ لو۔ ایسا کوئی واقعہ کسی مدرسے میں ہوا ہوتا تو ایک ماہ تک ٹی وی ٹاک شو چلتے رہتے۔ یہ ہے ہمارا المیہ اور یہ ہے ہمارے درمیان تقسیم۔ آج اگر یہ چاروں گروہ، علمائے کرام، میڈیا، سول سوسائٹی اور حکومت ساتھ مل کر سامنے نہ آئے تو یاد رکھیں ابھی صرف داعش کے پوسٹر لگے ہیں۔ کل کیا ہوگا، اس کا منظر صاف نظر آرہا ہے۔ وہ ترکی جس میں خوشحالی بھی ہے اور جمہوریت بھی وہاں سے لوگ جہاد کا علم لے کر اٹھ سکتے ہیں تو ہمارے ہاں زمین تو بہت ہموار ہے، غربت، افلاس، بیماری، بھوک، ننگ اور بے روزگاری۔

KitaabPoint.blogspot.com

ہر کوئی سانحے کے انتظار میں ہے

برصغیر پاک و ہند میں انگریز نے جب اقتدار کو طول دینے کے لئے ایک نام نہاد جمہوری نظام تخلیق کیا تو اس نے مراعات' سرکاری عہدوں اور علاقائی اختیارات دے کر اپنے ایسے وفادار گھرانے' گروہ اور قبیلے پیدا کیے اور پھر ان کے ہاتھ میں تاج برطانیہ کے وفادار جمہوری نظام کی باگ ڈور دے دی گئی۔ یہ گھرانے صرف سیاسی اقتدار میں شریک نہ تھے بلکہ اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں اور مقتدر فوجی جرنیلوں تک انہی گھرانوں کے لوگوں کو نوازا گیا۔ افواج میں کمیشن سے لے کر آنریری مجسٹریٹ تک ہر جگہ انگریز سرکار سے وفادار خاندانی حسب نسب اور خون کو اہمیت دی جاتی تھی۔ انہی مراعات یافتہ طبقات کو انگریز حکمرانی کے گر سکھانے اور انگریزی طرز زندگی کے رنگ میں رنگنے کے لئے چیف کالج جیسے ادارے قائم ہوئے' جہاں نسل در نسل ان خاندانوں کی اولادیں تربیت حاصل کرتیں۔ کچھ سیاست کے میدان کے شہسوار بن جاتے تو کوئی اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج چلے جاتے اور واپسی پر سول سروس کے امتحان کا دروازہ انہیں بیوروکریسی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیتا۔ عام آدمی کی واجبی تعلیم اسے اس دروازے پر دستک تک دینے سے بھی روکتی رہتی۔ فوجی بھرتی بھی انہی علاقوں سے کی جاتی جہاں ان وفادار گھرانوں کا اثر و رسوخ مستحکم ہوتا اور ان کے افراد اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز ہو چکے ہوتے۔ نسلی اور پیشہ ورانہ امتیاز کا یہ عالم تھا کہ سکول میں داخلے تک کے فارم میں کاشتکار اور غیر کاشتکار کے خانے رکھے گئے تھے جو پاکستان میں 70ء کی دہائی تک قائم رہے تاکہ اس بات کا ادراک رہے کہ زمین کا مالک کون ہے اور جولاہے' موچی' ترکھان جیسے کمی کمین کون۔ ان سب مقتدر گھرانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ آج بھی ملکی سیاست پر نگاہ دوڑائیں تو آپ کو پنجاب کے ال پیال' پراچے' ٹوانے' چٹھے' چیمے' جنجوعے' دریشک' دولتانے' روکڑی' ڈاہا' کھوسے' قریشی' گیلانی' گردیزی' لغاری' مزاری' موکل' کھرل' قصوری' نون' وٹو' وریو' سندھ کے ارباب' انڑ' بجارانی' بھٹو' تالپور' جام' جاموٹ' جتوئی' جونیجو' چانڈیو' زرداری' سومرو' قاضی' کھوڑو' گبول' وسان' مہر' مخدوم' سید' خیبر پختونخوا کے ترین' تنولی' جدون' خٹک' گنڈا پور' بلور' ارباب' ہوتی' یوسف زئی' اور بلوچستان کے بزنجو' بگٹی' مری' مینگل' اچکزئی' جمالی' جام' جوگیزئی' رئیسانی' زہری' مگسی' کھوسے اور کیتھران نظر آئیں گے۔ یہ چند ایک گھرانے ہیں اور اگر ان کی پوری تعداد بھی لکھی جائے تو اس کالم کے ایک چوتھائی حصے میں پوری آجائے گی۔ یہ وہ قابضین ہیں جو اس ملک میں ایک ایسا آئین تخلیق کرتے ہیں جس میں ہر طرح سے اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے بعد یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر اس کو چھیڑا گیا تو ملک ٹوٹ جائے گا۔ لیکن جب انہوں نے ملک توڑنا تھا تو انہیں کسی آئین کو توڑنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یہ قابضین فوج' بیوروکریسی اور سیاسی اشرافیہ کی صورت میں متحد ہو گئے بنگالیوں کی ایک ایسی عوامی یلغار کے سامنے جو پہلے فاطمہ جناح کو ووٹ دے کر ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر 1970ء میں اس نے ان سب کو مسترد کر کے رکھ دیا۔ ان سب نے مل کر ان بنگالیوں سے نجات حاصل کر لی جو ان کی سیاسی جاگیر کے لئے خطرہ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی حکومت اور اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے ایک دستوری دستاویز تیار کی اور پوری قوم کو اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ اگر تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو یہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ یہ دستاویز چار اکائیوں نے مل کر تحریر کی ہے۔ وہ چار اکائیاں جن پر یہ قابض رہنا چاہتے ہیں۔ کیا زمینی سطح پر اور حقائق کی دنیا میں واقعی یہ چار اکائیاں وجود رکھتی ہیں۔ قابضین کے نعروں اور دعوؤں کو ایک طرف رکھ دیں تو کیا کراچی' حیدر آباد اور باقی سندھ ایک اکائی ہے' بلوچستان کے پشتون علاقے' مکرانی بلوچ اور براہوی ساراوان اور جھالاوان ایک اکائی ہے۔ پنجاب کے سرائیکی اور پنجابی اور سرحد کے ہزارہ اور پشتون ایک ہیں۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ ان سب نے ایک دوسرے کی اتنی لاشیں گرائی ہیں کہ اب نفرت دلوں میں پیوست ہو چکی ہے۔ کراچی کی خون آشام زندگی اور 1988ء میں کوئٹہ میں لگنے والا پشتون بلوچ تنازعے پر ایک ماہ کا طویل کرفیو ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن قابض قوتیں اپنے اپنے مرکز اقتدار' لاہور' پشاور' کراچی اور کوئٹہ کا قبضہ نہیں چھوڑنا چاہتیں' خواہ اس کی قیمت ہزاروں جانوں کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ تیس سال کی جدوجہد کے بعد اٹھارویں ترمیم سے صوبائی خود مختاری حاصل کی۔ تعلیم صوبوں کے پاس گئی۔ لوگوں نے اپنے رویے سے ان کا تصور ان کے منہ پر دے مارا۔ گوادر سے گلگت تک تمام انگلش میڈیم سکولوں کے ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہیں' ایک نصاب تعلیم اور ایک اساتذہ کی ٹریننگ' مکمل مرکزیت' ہاں وہ غریب اور مفلوک الحال لوگ باقی رہ گئے جنہیں سرکاری سکولوں میں داخلے کے سوا اور وسائل ہی میسر نہ تھے۔ صوبائی خود مختاری کے ان دعویداروں اور دستور تحریر کرنے والوں کے بچے صوبائی خود مختاری کے منافی اس مرکزی نظام کے تحت قائم انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ اس سے بڑی منافقت کیا ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف آئین بلکہ دستوری ڈھانچہ ایسا مرتب کیا ہے کہ جس کے ذریعے صرف یہی گھرانے برسر اقتدار آسکیں۔ حلقہ بندیاں ایسی ہیں' کہیں برادری' خاندان' قبیلے اور زبان کی بنیاد پر اور کہیں اثر و رسوخ کی بنیاد پر۔ پارلیمانی نظام کو قرآن کی مقدس آیت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پورے حلقے سے 15 فیصد ووٹ لینے والا اسمبلی کا ممبر بنتا ہے اور باقی 85 فیصد گروہوں میں بٹے ہوئے لوگ اس نظام میں غیر نمائندہ۔ اس نظام کے تحت 1954ء سے الیکشن ہوتے آ رہے ہیں اور خواہ وہ آمریت کے تحت ہوں یا جمہوری حکومت کے زیر سایہ یہی لوگ اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ کس قدر شاندار بندوبست ہے اور پھر سوال کرتے ہیں کہ کوئی متبادل بتاؤ۔ جمہوری نظام کو پٹڑی سے اکھاڑا تو فوج آجائے گی۔ فوج آتی ہے تو کون آتا ہے۔ یہی لوگ آتے ہیں۔ یہی اقتدار پر قابض ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس کے ہزاروں متبادل ہیں لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں۔ وفاق ٹوٹ جائے گا' فوج آجائے گی' ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان قابضین میں اب وہ مذہبی گروہ بھی شامل ہو چکے ہیں جنہیں اقتدار میں مسلسل حصہ ملنا شروع ہو چکا ہے۔ ان کا قبضہ گروپ مسلک کے تعصب کی خوفناکی سے بھرا ہوا ہے۔ نوابزادہ نصراللہ کی نشست پر سرفراز جماعت اسلامی کے سراج الحق کو اگر مصر میں اخوان المسلمین کی جمہوری اور آئینی جدوجہد کے نتیجے میں اقتدار اور پھر ہزاروں شہدا کی لاشیں نظر نہیں آتیں تو یہ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ نوابزادہ نصراللہ کی پارٹی چند افراد کی جماعت تھی لیکن جماعت اسلامی مولانا مودودی کے علمی ورثے اور اسلامی انقلاب کی داعی تھی۔ اس عظیم ورثے کو قابضین کی جھولی میں ڈال کر آپ کا قد تو شاید بلند ہو جائے لیکن وہ لوگ جو حق کو کھرا' سچا اور اس نظام سے علیحدہ تصور کرتے ہیں ان کی مایوسی دیدنی ہو گی۔

ایک ہنگامہ برپا ہے۔ علامہ طاہر القادری کی شخصیت اور اس کے کردار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کیا کوئی نکتہ ایسا ہے جس پر اختلاف کیا جا سکے۔ عمران خان کے لہجے اور انتقامی رویے پر انگلی اٹھائی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ جو لوگ ہیں' کیا انہیں 1954ء سے نافذ قبضہ گروپ کے اس الیکشن نظام نے مایوس نہیں کیا۔ یہ مایوسی اگلے سو سال تک قائم رہے گی۔ اس نظام میں اگر کوئی بھولا بسرا عام آدمی آ بھی جائے تو چند سالوں بعد وہ اور اس کا خاندان بھی قبضہ گروپ کا حصہ بن جائے گا۔ کیا ان دونوں دھرنے والوں کے مطالبات اور نعرے یہ تمام سیاسی جماعتیں اختیار نہیں کر سکتی۔ یہ نہیں کریں گی کیونکہ یہ سب کے سب ایک انتظار میں ہیں۔ یہ انتظار سو سالہ قابضین کا انتظار ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر لوگ تھک ہار کر چلے جائیں گے' بیمار پڑ جائیں گے' ان میں پھوٹ پڑ جائے' ان کے خلاف مختلف سیاسی گروہوں کی ریلیاں نکلیں گی اور یہ آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ فتویٰ بازی کا سلسلہ شروع ہے' بریلوی اور شیعہ مسلک کے نمائندے انقلاب مارچ میں ہیں' ان کے مقابلے میں مولانا فضل الرحمٰن کے سرفروش دوسرے مدرسوں سے نکلیں گے۔ انتظار یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے خود بہ خود لڑ پڑیں۔ لیکن ان قابضین کو اندازہ نہیں کہ اسی دن کا انتظار تو عالمی طاقتیں بھی کر رہی ہیں جو بیج بحرین' سعودی عرب' شام اور عراق میں بویا گیا اور جس کی تلخی عراق اور شام میں قتل و غارت کی صورت میں نظر آئی' وہی خار دار پودا یہاں بھی سر اٹھا سکتا ہے۔ صرف چند لاشیں اور پورا ملک خون میں لتھڑا ہوا۔ ایسے میں عالمی برادری کو مطمئن کرنا کتنا آسان ہو گا کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے کسی بھی وقت کسی اور کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ ایک انتظار ان کا بھی ہے جس کو یہ قابضین تیسری طاقت کہتے ہیں' لیکن ہر دفعہ یہ قوت کے آمرانہ اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس قوت کا انتظار وقت کی سولی پر لٹکا ہوا ہے۔ ان کے سامنے ایک سوال ہے۔ لاشیں گرنے سے پہلے یا لاشیں گرنے کے بعد۔ پہلے حرکت میں آئیں تو سب لعن طعن کریں گے کہ جمہوریت کی بساط الٹ دی' بعد میں آئیں تو حالات سنبھالنا مشکل۔ ہر کوئی سانحے کے انتظار میں ہے' ہر کوئی سانحے کا منتظر ہے۔ لیکن شاید انہیں اندازہ نہیں کہ اگر سانحہ ہو گیا تو پھر شاید خون کا دریا عبور کر کے بھی امن کی منزل حاصل نہ ہو سکے۔ پتہ نہیں کتنی خون آشام راتیں اور قتل و غارت سے بھری صبحیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

مسلم امہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں دینی مدرسے کا تصور سب سے پہلے برصغیر میں انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1781ء میں کلکتہ مدرسہ کھول کر پیدا کیا۔ اس سے قبل بغداد کے دارالحکومت سے شروع ہونے والی مدارس کی تحریک جو 1100ء سے 1500ء تک طلیطلہ کے تراجم کی انتھک کوششوں سے ہم آہنگ ہو کر دنیا بھر کے علوم کی قائد بنی' اس کے زیر اثر قائم ہونے والے تمام مدارس علم میں کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سید الانبیاء ﷺ کی حدیث کے مصداق علم مومن کا گمشدہ مال تھا۔ اس امت کے تمام مدارس میں قرآن و سنت اور فقہ کے علاوہ جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں علم طب' علم الادویہ' علم ریاضی' علم طبیعات' علم فلکیات' فلکیاتی جدول' امراض عین' علم المناظر' علم کیمیا' علم فلسفہ' علم تاریخ' علم موسیقی اور دیگر کئی علوم شامل تھے۔ اس تصور کو برصغیر کے مسلم مدارس نے بھی انگریز کی آمد تک قائم رکھا۔ مدرسہ رحیمیہ اور مدرسہ فرنگی محل کے نصاب انہی علوم پر مبنی تھے۔ یہی تعلیمی ادارے تھے جس سے علم حاصل کر کے لوگ طبیب بنتے تھے اور گاؤں گاؤں جا کر حکمت اور طب کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ آج بھی ان گھرانوں میں علم طب اور علم الادویہ کی کتابوں کے وہ نسخے مل جائیں گے جو ان مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ انہی تعلیمی اداروں سے استاد پیدا ہوتے اور ہر گاؤں میں اتالیق مقرر ہوتے تھے۔ ایک ایسا غیر رسمی تعلیمی نظام پورے برصغیر پر رائج تھا جس کے نتیجے میں اس خطے میں شرح خواندگی 95 فیصد سے زیادہ تھی۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل G.W.Leitner جی ڈبلیو لائٹنر کی کتاب IndiginousEducationinPunjab اس بات کی گواہی ہے کہ مغلیہ دور میں ہر گاؤں کی سطح تک بنیادی تعلیم کا تصور کس قدر مستحکم تھا۔ شرح خواندگی یہ نہیں تھی کہ اپنا نام لکھ اور پڑھ سکتا ہو بلکہ ہر پڑھے لکھے شخص کو فارسی پڑھنا' لکھنا آتی تھی' حساب کتاب پر دسترس تھی اور اسے قرآن یا وید پڑھنا آتی تھی۔ یہ سب اساتذہ جو گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے تھے انہی مدارس سے پڑھ کر نکلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 1906ء کے تمام اضلاع کے گزیٹر اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ضلعوں میں عمومی شرح خواندگی 90 فیصد کے لگ بھگ نظر آئے گی۔ یہی حال 1911ء کی مردم شماری کی رپورٹ کا ہے۔ یہ تعلیم اور خواندگی کا جال انہی مدارس سے فارغ التحصیل افراد نے پھیلایا تھا۔ پورے برصغیر میں جو سول سروس تھی جس میں مالیہ وصول کرنے والے' زمین کی پیمائش کرنے والے جریب کش' کوتوال' عدالتوں کے قاضی' خزانے کے متولی' عمارتیں تعمیر کرنے والے انجینئر جنہوں نے تاج محل اور شالیمار جیسے شاہکار تخلیق کئے' یہ سب کے سب انہی مدارس سے علم حاصل کر کے ان عہدوں تک پہنچتے تھے۔ ایک مربوط تعلیمی نظام کے بغیر یہ لوگ آسمان سے نازل نہیں ہوتے تھے۔ اس دور میں برصغیر میں آنے والے ہر سیاح نے صرف اور صرف ایک چیز کی بے حد تعریف کی ہے اور وہ تھی اس خطے میں عام آدمی کی زندگی میں علم اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور سیاسی امور کی اہمیت۔ 1643ء میں جو کتاب یورپ میں چھپ کر عام ہوئی وہ سر تھامس رو کا سفر نامہ تھا۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب آرکائیوز میں موجود ہے جس کی ورق گردانی آپ کو بتا دے گی کہ پورے ہندوستان میں ان تعلیمی اداروں کا کیسا جال بچھا ہوا تھا۔ صرف ٹھٹھہ جیسے دور دراز علاقے میں چار سو کالج قائم تھے۔ البتہ فرق ایک تھا اور وہ یہ کہ آج کے دور کی طرح امتحانات کے ذریعے پاس کرنے اور ڈگری دینے کا رواج نہ تھا۔ وہاں استاد اپنے شاگردوں کو روز پرکھتا تھا اور پھر ایک دن اعلان فرما دیتا تھا کہ اب میرا یہ شاگرد علم میں طاق ہو گیا ہے۔ چند بڑے بڑے سوالات یاد کر کے امتحان دے کر ڈگری حاصل نہیں کی جاتی تھی۔

1781ء میں کلکتہ مدرسہ قائم کرنے سے پہلے انگریز نے اس علاقے میں 1757ء سے مسلمانوں کے تمام تعلیمی اداروں پر پابندی لگا دی۔ اب وارن ہیسٹنگز نے اس "دینی مدرسے" کی بنیاد رکھی جسے صرف اور صرف دینی تعلیم کے لئے مختص کیا گیا۔ اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ کو اسی طرح کی ذمہ داریوں کا درس دیا گیا جیسا یورپ میں تحریک احیائے علوم کے بعد چرچ کے پادریوں کو دیا جاتا ہے یعنی پیدا ہونے پر بپتسمادے دو' شادی پر جوڑے کو قانونی حیثیت دے دو' مرنے کے بعد رسومات ادا کر دو اور اتوار کی عبادت کی قیادت کر لو۔ یہ چار ذمہ داریاں بالکل اسی نوعیت کے حساب سے برصغیر کے علماء کو سونپ دی گئیں اور مسلمانوں کے قدیم مدارس کی طرز پر عیسائی مشنری سکول کھولے گئے۔ 1810ء میں کلکتہ میں پہلا مشنری سکول کھلا جس کے نصاب میں بائبل کی اخلاقیات "BiblicalEthics" اور عیسائی تعلیم کے ساتھ تمام دنیاوی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور تمام سرکاری نوکریوں کے لئے انگریزی لازم قرار دے دی گئی۔ پورے ملک کے تمام تعلیمی اداروں سے قرآن و سنت خارج کر دیا گیا اور اسے اسلامیات کے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی کہ جو کوئی اس کو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ تعلیم صرف سکول اور کالج تک محدود ہو گئی اور اس کے بعد کے نوے سالوں میں وہ زوال آیا کہ 1947ء میں انگریز جب برصغیر کو چھوڑ کر گیا تو شرح خواندگی 14 فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ اس دور زوال میں مسلمان مدارس نے وہ ذمہ داری بخوشی قبول کر لی جو انگریز نے دی تھی اور ایک ایسی کھیپ تیار کرنا شروع کر دی جو کم از کم قرآن و سنت کے علم کو محفوظ رکھیں اور اسے کونے کونے تک پہنچائیں۔ مغربی تعلیم کی یلغار اور انگریز حکومت کے مقابلے میں اپنے دینی علم کا تحفظ ان مدارس کا بنیادی مقصد بن گیا اور جس لگن اور ایمانداری سے انہوں نے یہ فریضہ نبھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔

بلوچستان کے قمر دین کاریز یا ب سیمہ جیسے دور افتادہ گاؤں ہوں' سندھ میں مٹھی اور ڈیپلو کے ریگستان ہوں' پنجاب میں بھکر' راجن پور یا میانوالی کا بے سروسامان قصبہ ہو یا سرحد کی بلند چوٹی پر آباد کوئی بستی۔ پانی' بجلی' سیوریج' تعلیم' صحت اور دیگر سہولیات سے بے نیاز ان مدارس کا پڑھا ہوا ایک شخص صبح منہ اندھیرے مسجد کا دروازہ کھولتا ہے' صفیں درست کرتا ہے' چبوترے پر اذان دیتا ہے اور ان میں پانچ وقت نماز پڑھاتا ہے۔ اکثر جگہ اس کی گزر بسر صرف اور صرف لوگوں کے گھروں سے کھانا یا شادی اور موت کی رسومات پر نذرانے کے سوا کسی اور چیز پر منحصر نہیں ہوتی۔ پورے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ لوگ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کو زندہ رہنے کی واحد علامت ہیں۔ یہ اگر موجود نہ ہوں تو لوگ اذان دینے اور نماز پڑھانے والے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ ذمہ داری گزشتہ دو سو سال سے اس طرح نبھائی ہے کہ آج تک کسی مسجد کے دروازے پر تالہ نہیں لگا کہ مولوی ہڑتال پر ہے۔ کبھی کوئی نماز لیٹ نہیں ہوئی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اس ملک کے کوچے کوچے اور قریے قریے میں موجود ہیں۔ جہاں سرکار کا نام و نشان نہیں وہاں بھی موجود ہیں۔ کسی گاؤں میں چلے جائیں آپ کو سرکار کا ہسپتال ویران نظر آئے گا' وہاں کا سکول بے آباد ہو گا' نہ ڈاکٹر کا کہیں پتہ چلے گا اور نہ ہی استاد کا لیکن وہاں ایک ہی آباد اور روشن مقام ہو گا اور وہ اللہ کا گھر جس کی رکھوالی ایک مفلوک الحال درویش مولوی کر رہا ہوتا ہے۔ اس مولوی سے دشمنی کی اور کوئی وجہ نہیں' بس صرف ایک ہے کہ یہ اللہ کے نام کا دانستہ یا نادانستہ طور پر نمائندہ بن چکا ہے اور اپنا فرض نبھا رہا ہے۔ لیکن جب بھی میرے ملک کے "عظیم" دانشوروں کو موقع ہاتھ آتا ہے وہ ان مدارس کو سرکاری کنٹرول میں کرنے کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا ہے اس کے بعد کیا ہو گا۔ وہی جو تمام اداروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مولویوں کی تنخواہیں بڑھانے کے لئے اور دیگر مراعات کے لئے احتجاج شروع ہو گا' دھرنے' مساجد پر تالے اور درس و تدریس کا خاتمہ۔ وہی حال جو ہم نے اپنے باقی تمام محکموں کا کیا ہے۔ مجھے اپنے ان عظیم دانشوروں کی یہ منطق اچھی لگتی ہے کہ تمام مدارس کو سائنسی اور جدید علوم پڑھانے چاہئیں تاکہ روحانی اور مادی ترقی ساتھ ساتھ ہو لیکن کیا یہ منطق کالجوں یونیورسٹیوں اور اے لیول وغیرہ پر لاگو نہیں ہوتی کہ انہیں بھی قرآن و حدیث پڑھایا جائے تاکہ معاشرہ میں ایک ہی طرح کا نظام تعلیم اور ایک طرح کے انسان جنم لیں۔ ان اداروں میں تو جو تھوڑا بہت اسلام موجود ہے' یہ لوگ اس کو بھی نکالنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اصل مقصد صرف یہ ہے کہ تعلیم سے اللہ اور اس کے رسول کو دیس نکالا دے دو۔ اسے امن کی شرط کہا جا رہا ہے۔ یورپ نے 1900ء تک دین کو تعلیم سے نکال دیا تھا۔ کیا وہاں امن آ گیا؟ اس کے بعد اس نے دو عالمی جنگیں لڑیں اور کروڑوں انسانوں کا خون بہایا۔ شاید تاریخ کسی کو یاد نہیں یا وہ یاد کرنا نہیں چاہتا۔

KitaabPoint.blogspot.com

اقامتِ دین، جمہوریت اور مذہبی جماعتوں کا المیہ (1)

نظام کے تسلسل، جمہوریت کی بقاء اور انسانی آزادی کے تحفظ کی جتنی آوازیں آج پاکستان کی مذہبی جماعتوں کی جانب سے اٹھ رہی ہیں اس کا شاید ہی اندازہ آج سے بیس پچیس سال پہلے کسی نے کیا ہو۔ یہاں تک کہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی اس ہراول دستے کی سرخیل ہے۔ مولانا مودودی موجودہ دور میں مسلم امہ کی وہ آواز تھے جنہوں نے اپنے اردگرد موجود جدید تہذیبی نظام کو ایک جہل مرکب جانتے ہوئے اسلام کے انقلابی پیغام کی جانب لوگوں کو بلایا تھا۔ سیکولر اخلاقیات اور جدید مغربی اصطلاحات پر قائم شدہ ریاست کے مقابلے میں ایک اسلامی ریاست کا خاکہ دیا تھا۔ اپنے اس سارے کام اور جماعت اسلامی کی جدوجہد کو اقامت دین کا نام دیا تھا۔ اس آواز نے دنیا بھر میں لوگوں کو متاثر کیا اور ہر جگہ اسلامی تحریکوں نے ایک نئی شکل میں ترتیب پانا شروع کیا۔ جماعت اسلامی سے قبل برصغیر میں سیاسی منظر نامے پر جمعیت العلمائے ہند، مجلس احرار اور خاکسار جیسی سیاسی مذہبی پارٹیاں اپنے مخصوص مسلکی تصور کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں شریک تھیں۔ انگریز کے بنائے گئے جمہوری نظام حکومت، بقول اقبال ”الیکشن، ممبری، کونسل، وزارت“ میں حصہ لیتی تھیں اور اکثر ناکام ہو کر زمانے کے تنزل کا گلہ کرتی تھیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ دین کے معاملے میں اپنے مدرسے یا دارالعلوم کا مہتمم مقرر کرنے کے لئے تو کبھی مدرسے میں موجود طلبہ اساتذہ سے رائے نہیں لی جاتی تھی، کوئی سیکرٹ بیلٹ باکس رکھ کر یہ نہیں پوچھا جاتا تھا کہ کون اس ادارے کو بہتر طور پر چلا سکتا ہے جبکہ انتخاب کے ایسے میدان میں ایک نیک پارسا اور متقی شخص کو اتار دیا جاتا تھا جہاں ایک شریف، ایماندار اور نیک شخص کا ووٹ اور ایک سمگلر، ڈاکو، شراب خانہ، جواء خانہ اور ناچ گھر چلانے والے کا ووٹ برابر ہوتا ہے۔ دونوں صاحب الرائے ہیں۔ دونوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست چلانے کے اہم ترین کام میں برابر کی رائے دے۔ مذہبی جماعتوں نے اس ”شاندار“ اور ”مساوات انسانی“ پر مبنی نظام کو وقتی مصلحتوں کے تحت اپنے اوپر جائز قرار دیا اور آج تک اس بات کا ماتم کرتی ہیں کہ چونکہ لوگوں کی اکثریت نہیں چاہتی اس لئے یہاں اللہ کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ جماعت اسلامی نے بھی اسی راستے کو وقتی مصلحت کے تحت اختیار کیا اور 1970ء کے پہلے عام انتخابات میں بدترین شکست کا سامنا کیا۔ ایسا ہی کچھ حال دیگر مذہبی جماعتوں کا تھا جن کے مسلکی پیروکار انہیں مسجد میں نماز، نکاح پر خطبہ اور موت پر دعائے مغفرت تک تو اپنا قائد تسلیم کرتے تھے لیکن انہوں نے جب خود کو ”اہل الرائے“ کی منصب پر سرفراز دیکھا تو فیصلہ دے دیا کہ ہمیں نظام کار حکومت چلانے کے لئے کسی متقی، پرہیزگار یا ایماندار شخص کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک ایسا عوامی فیصلہ تھا جس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی بھی غیر ملکی فرد، حکمران یا وفد آئے ہمارے تخت حکومت پر بیٹھے لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ پاکستان تو ایک روشن خیال ملک ہے جس کے عوام کی اکثریت نے ہر بار مذہبی جماعتوں کو مسترد کیا ہے۔ یہ ہے وہ انجام جواب تک کی جمہوری جدوجہد کے پھل کے طور پر ملا ہے اور اس نظام کے تسلسل میں اگلے سو سال بھی اسی بدترین انجم کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

اقامت دین یعنی دین کو قائم کرنے کا دعویٰ لیکر اٹھنے والی جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ کو اس بات کا ادراک ہو گیا تھا اور ان کی بصیرت افروز نگاہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس جمہوری نظام اور انتخابی تسلسل سے دین کے غلبے کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ 1976ء کی ایک شام، عصر کی محفل میں کہا ”اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے انتخابات ہی واحد راستہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جاسکتا ہے“ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر کہا ”آبادی کی کثیر تعداد آپ کی ہم خیال ہو تو اسلامی نظام کا راستہ روکنا ممکن نہیں رہے گا۔ حکمران رکاوٹ بنیں تو ان پر موثر دباؤ ڈال کر جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ ماضی قریب میں انگریز کو عوامی رابطے MassContact کے ذریعے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا صرف انتخابات پر انحصار نہیں کیا گیا“ یہ انہوں نے ایک دفعہ نہیں بار بار کہا“ (ہفت روزہ زندگی 5 اپریل 1976ء)۔ یہ تھا ایک ایسا لمحہ جو ہر صاحب علم پر کسی ایسے موقع پر آتا ہے جب اسے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ بس میں موجود تمام مسافروں کے دلوں میں منزل بھی ایک ہے لیکن بس غلط راستے پر ڈال دی گئی ہے۔ ایسے میں وہ فوراً غلطی کا احساس کرتے ہوئے بس کا رخ موڑنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر بس کا سٹیرنگ اس کے ہاتھ میں نہ ہو تو آواز ضرور بلند کرتا ہے۔ سید مودودی نے آواز بلند کی لیکن جماعت اسلامی کی بس اسی راستے پر گامزن فراٹے بھرتی رہی۔ یہی حال باقی مذہبی جماعتوں کا بھی رہا۔ اسمبلی میں چند سیٹیں اور کبھی کبھار چند وزارتیں لیکن اس مختصر سی کامیابی کی جو قیمت ان سب نے چکائی وہ کسی المیے سے کم نہیں۔ آج اس ملک میں مذہبی، سیاسی جمہوری پارٹی تو آپ کو مل جائے گی لیکن اقامت دین کی جدوجہد والا گروہ ملنا ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں صرف اور صرف اللہ کا خوف ہونا چاہیے تھا۔ تعجب ہے کہ وہ اس بات کے ڈر سے اس نظام کی مخالفت نہیں کرتے کہ کوئی طالع آزمانہ آجائے۔ جو عمر بھر سٹیٹس کو (Statusquo) کی مخالفت کرتے رہے آج اسی کے سب سے بڑے وکیل بن بیٹھے۔ وہ دل جہاں اللہ کا خوف ہونا چاہیے تھا وہاں ”طالع آزما“ کا خوف بیٹھا ہے۔ جمہوریت اور جمہوری نظام کی بنیاد انسانی آزادی کے خمیر سے اٹھی ہے۔ لفظ انسانی آزادی اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس لفظ العبد، یعنی بندے کے مقابل تخلیق کیا گیا۔ انسانی آزادی کے تصور کے تحت ہر شخص اپنے تمام فیصلے کرنے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہے جبکہ لفظ العبد“ یعنی بندہ اسے اللہ کی غلامی میں قید ایک فرد کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں اگر اپنی سب سے بڑی کامیابی 1973ء کے متفقہ آئین کو ہی تصور کر لیں تو اللہ کا کوئی بھی قانون اس وقت تک قابل نفاذ نہیں ہو سکتا جب تک پارلیمنٹ کی اکثریت اسے منظور نہیں کرتی۔ یہی وہ اکثریت ہے جو انسان کو اللہ کے برابر بلکہ اس سے برتر مقام پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ جب آپ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اصل طاقت عوام کے پاس ہے تو پھر آپ کی تمام سرگرمیوں کا مرکز رضائے الٰہی کا حصول نہیں بلکہ ووٹ کا حصول بن جاتا ہے۔ ایسے میں آپ وہ نیکیاں جو لوگ اللہ کو خوش کرنے کے لئے خاموشی سے کرتے ہیں تاکہ آخرت میں اس کا اجر پائیں، آپ اسے ووٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ خدمت خلق کے کاموں میں بھی اس لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں کہ آئندہ آنے والے الیکشنوں میں آپ کی پوزیشن مستحکم ہو گی۔ ووٹ حاصل کرنے کی اس دوڑ میں آپ ووٹنگ کو شورائیت کے ہم پلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ کیا اسلامی تاریخ، خلفائے راشدین کے سنہری دور یا کسی بھی اسلامی مفکر کے خیالات کے مطابق ایک عابد وزاہد، یا عالم و باقر کی رائے ایک سمگلر، چور، ڈاکو، زانی اور قاتل کے برابر ہو سکتی ہے۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ ووٹنگ کا نظام جس میں ووٹ دینے کے لئے کم از کم ایک پابندی ضرور ہے کہ کم سے کم عمر 18 سال ہونی چاہیے۔ جب سب کی رائے برابر ہے تو پھر 15 سال کے ذہین بچے کے ووٹ پر کیوں پابندی ہے اور کیا 90 سال کا ایک فاتر العقل شخص اس قابل ہوتا ہے کہ مستند رائے دے سکے۔ کیا کسی نے یہ آواز بلند کی کہ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر 18 سال کی عمر کی پابندی ہو سکتی ہے ووٹ یا رائے دینے کے لئے تو پھر تعلیم، کردار اور اخلاق کی اسلام پابندیاں عائد کرتا ہے۔ کسی نے آواز اٹھائی کہ ووٹ بنائے، یا رائے دینے کے حق کے لئے صرف بلوغت شرط نہیں ہونا چاہیے اور بھی شرطیں رکھی جاسکتی ہیں۔

(جاری ہے)

KitaabPoint.blogspot.com

اقامتِ دین، جمہوریت اور مذہبی جماعتوں کا المیہ (2)

اقامتِ دین، اسلامی نظام کا قیام، شریعت کا نفاذ یا نظام مصطفےٰ ﷺ ایسے تمام نعرے مذہبی جماعتیں، اپنی الیکشن کی مہم، رکنیت سازی یا عمومی گفتگو میں لگاتی ہیں۔ یہ سب گزشتہ چھ دہائیوں سے انتخابی سیاست کر رہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں وزارتوں کے قلمدان بھی رہے اور صوبائی حکومتیں بھی۔ اس پورے عرصے میں کبھی ان تمام جماعتوں نے نفع و نقصان کا گوشوارہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہوتی تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ لادینیت اور سیکولرزم کے اس طوفان میں نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد اسلام کی جانب بھی راغب ہو رہی ہے۔ آج سے چالیس سال قبل یونیورسٹیوں کے مخلوط ماحول میں شاید ہی کوئی لڑکی حجاب پہنے نظر آتی تھی لیکن اب آپ کو جابجا ایسی لڑکیاں نظر آئیں گی بلکہ ایک اندازے کے مطابق سرکاری یونیورسٹیوں میں تیس فیصد لڑکیاں حجاب پہنتی ہیں۔ ایک زمانے میں تعلیمی اداروں میں اکا دکا داڑھی والے نوجوان نظر آتے تھے اور ان کی داڑھی بھی مختصر سی ہوتی لیکن اب ایسے نوجوانوں کی بھی کثیر تعداد ان اداروں میں موجود ہے جو عمامہ، شلوار قمیض اور لمبی داڑھی سمیت اس مخلوط تعلیم میں اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ان نوجوانوں کی اکثریت نے دین کے ساتھ یہ تعلق اپنے تجسس اور کوشش سے استوار کیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے ہنگام میں جس پڑھی لکھی نسل نے مغرب کا کریہہ چہرہ اپنی انٹرنیٹ تک رسائی سے دیکھا، وہ اسلام کو سیکھنے کی جستجو میں لگ گئی۔ ان کے پاس ان مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کا کوئی علمی کام مشعل راہ کے طور موجود نہ تھا۔ جماعت اسلامی ان میں سے ایک مختلف حیثیت رکھتی ہے کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا علمی ورثہ آج بھی ان کے کام آرہا ہے۔ جبکہ دیگر مذہبی جماعتیں اپنے مسلکی اور فقہی علماء کے ذخیرۂ علم پر بھروسہ کرتی ہیں۔ یہ تمام کام بھی تقریباً چالیس سال پرانے ہیں اور موجودہ دور میں جو علمی کام میسر ہے وہ ذاتی نوعیت کا ہے۔ اجتماعی سطح پر دین کے کام سے جتنی یہ مذہبی جماعتیں آج دور ہیں اس کی مثال گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ جہاں علمی کام میں تنزل آیا وہیں ان کی قیادتوں کے معیار اور علمی حیثیت بھی اس قابل نہ رہی کہ ان کی جانب ایک علم دین کے ماہر یا عالم کی حیثیت سے رجوع کیا جا سکے۔ سب کے سب سیاسی رہنما بن گئے۔ مولانا فضل الرحمٰن ہوں یا سراج الحق، انس نورانی ہوں، صاحبزادہ حامد رضا یا علامہ ناصر عباس، کسی کے کھاتے میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں جو موجودہ مسائل کے تناظر اور اسلام کے حوالے سے لکھی گئی ہو۔ انہیں آئین کی دفعات یاد ہوتی ہیں، جمہوریت کی تاریخ ازبر ہوتی ہے، آمریت کے شب خون اور اس کے اثرات پر ان کے پاس دلائل موجود ہوتے ہیں لیکن نہ یونیورسٹی میں پڑھنے والے کسی نوجوان کے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب ان کے پاس ہوتا ہے اور نہ ہی مدرسہ کے فارغ التحصیل، درسِ نظامی پڑھے ہوئے شخص کو یہ قائل کر سکتے ہیں کہ اسلام کا آفاقی نظام موجودہ دور کی ضروریات کیسے پوری کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کی تمام تحریکیں عملاً اس صورت میں ڈھل چکی ہیں جس میں دینی قیادت اور ہے اور سیاسی قیادت اور۔ وہی جنگ جو یہ جماعتیں صدیوں سے لڑتی چلی آئی ہیں کہ جو دینی معلامات میں رہنما ہے وہی سیاسی معاملات میں بھی قائد ہو گا۔ لیکن اب خود ان کے سیاسی قائد اور ہیں اور دینی قائد اور۔ یہ ہے اس انتخابی عمل کا بھیانک نتیجہ جس نے ان مذہبی جماعتوں کو ٹھیک اسی رنگ سے رنگ دیا ہے جو جمہوری نظام کی عین منشا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ان کے قائدین چہرے مہرے سے شرعی وضع قطع رکھتے ہیں، عبادات میں پہل کرنے والے ہیں اور ذاتی کردار میں بہتر ہیں۔ لیکن کیا اس جمہوری نظام کی گندگی اور غلاظت، الزامات کی صورت میں ان کے وزیروں اور مشیروں کے سر پر نہیں تھوپی گئی۔ کیا ان کا رویّہ خالصتاً ان تمام وزیروں کا جیسا نہیں تھا جو اپنے حلقے کی سکیموں، وہاں کے افراد کی خوشنودی اور ان کے لیے نئی نئی ملازمتوں کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا اس سارے عمل میں اقامتِ دین کا کام پسِ پشت نہیں چلا گیا۔ کیا اقامتِ دین کی آواز بلند کرنے والا کوئی شخص کوئی ایسا عہدہ قبول کر سکتا ہے جس میں اسے ایک ایسا بجٹ بنانا پڑے جس میں سود ایک جزو لاینفق ہو۔ لیکن یہ بلوچستان میں بھی ہوا اور خیبر پختونخوا میں بھی۔ یہ تو جان بوجھ کر گلے میں ڈالا گیا طوق تھا، دین کی کوئی تعبیر اسے مصلحت یا مجبوری کا نام نہیں دے سکتی۔ بلوچستان کی اسمبلی میں 1988ء سے لے کر آج تک جمعیت العلماء پاکستان کئی دفعہ واحد اکثریتی پارٹی کے طور پر انتخاب جیتتی رہی ہے لیکن سیاسی مصلحت اور عوامی مفاد اسے سیکولر، قوم پرست اور بعض دفعہ دین سے متنفر افراد کے ساتھ اتحاد کر کے اقتدار کو بحال رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس اقتدار کے بعد وہ سارے کام انہوں نے کیے جو انتخابی سیاست میں جیتنے والے دیگر وزیر بھی کرتے تھے۔ لیکن کیا یہ سب کرنے کے بعد سیاست میں کامیابی ان کے ہاتھ آئی۔ روز بروز ان کے ووٹروں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ 1970ء سے لے کر آج تک اپنے ہم خیال ووٹروں کا جائزہ لے لیں اور ان ووٹروں کو نکال دیں جو وہ وقتاً فوقتاً سیاسی مصلحت کے طور پر برادری والے یا قبیلے والے امیدوار کھڑا کر کے حاصل کرتے ہیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کسی مقام پر کھڑے ہیں۔ آپ نے صرف کھویا ہی کھویا ہے۔

جمہوریت کی جس ٹرین پر یہ مذہبی جماعتیں سوار ہیں اس کا ایندھن کارپوریٹ سرمایہ ہے۔ سیاسی پارٹیاں اسی لیے بنائی جاتی ہیں، تاکہ ان میں انوسٹمنٹ کی جا سکے۔ اوباما کو اگر 6.8 ارب ڈالر نہ ملتے تو اس کی پارٹی الیکشن جیتنے کا تصور بھی نہیں کرتی، یہی حال تمام ممالک کی سیاسی پارٹیوں کا ہے۔ اسی لیے جمہوری نظام میں غیر جماعتی انتخابات گالی بنا دیے گئے ہیں کیونکہ اس طرح پارٹی فنڈنگ کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس سرمائے سے جو راستہ جیت کی طرف جاتا ہے وہ میڈیا کا ہے۔ اس وقت دنیا کا 97 فیصد میڈیا تین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہے جن کی کوئی محبت ان مذہبی سیاسی پارٹیوں سے نہیں ہے۔ جب تک آپ اس نظام کا پرچم اٹھا کر جمہوری انتخابی راستے پر گامزن ہیں وہ آپ کو برداشت کریں گے ورنہ حزب التحریر جیسی تنظیم جو ریاست کے قیام سے پہلے ہتھیار اٹھانا حرام سمجھتی ہے اس کو دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کر کے اکثر مسلم ممالک میں پابندی لگوا دی گئی۔ کیونکہ نہ تو وہ اس جمہوری نظام کا حصہ ہے اور نہ ہی انتخابی سیاست کی حمایتی۔ لوگ سوال کرتے ہیں کہ پھر کیا یہ مذہبی جماعتیں بھی وہی راستہ اختیار کریں اور خود پر پابندی لگوا کر بیٹھ جائیں اور جو تھوڑا بہت دین کا کام ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔

کیا ان سب جماعتوں کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے؟ کیا یہ سب اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت کے اعلیٰ مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں؟ کیا ان کے نزدیک انتخابی جمہوریت صرف ایک مصلحتی راستہ ہے اور ہرگز منزل نہیں؟ تو پھر ان تمام جماعتوں کو ایک دفعہ پھر غور کرنا چاہیے کہ کہیں ان کی منزل کھوٹی تو نہیں ہو رہی۔ ان کی سیاسی قیادتیں نہ خالصتاً مذہبی اور فقہی سوالات کا تسلی بخش جواب دینے کے قابل ہے اور نہ مغرب کی یلغار اور سیکولرازم کے طوفان سے اٹھنے والی تشکیک کو حل کرنے کے لیے کوئی تسلی بخش گفتگو کر سکتی ہیں۔ جہالت کا ایسا راج ہو تو پھر پیپلز پارٹی، نون لیگ یا تحریکِ انصاف کے لیڈروں سے کیا گلا کہ انہیں سیاست بازی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ کیا ان جماعتوں کے پاس بھی صرف کھوکھلی نعرہ بازی کے سوا کچھ رہ گیا ہے۔ جو افراد اس دینی اور فقہی سوالوں کا جواب چاہتے ہیں وہ شدت پسند مسلکوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں اور جو سیکولر یلغار کا سامنا کرنا چاہتے ہیں وہ معذرت خواہ اور مغرب سے متاثر علماء کی گود میں جا بیٹھتے ہیں۔ اس لیے کہ ان جماعتوں کے رہنماؤں کے پاس علم رہ گیا اور نہ تزکیہ، برداشت رہ گئی نہ حسن خلق۔ بس سیاست کی جادو نگری میں ایک رقص ہے جس میں سب رقصاں ہیں اور کسی کو اندازہ تک نہیں کہ وہ کتنے بڑے علمی ورثے سے جنم لینے والی تحریکوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ ایسا تصور کر لیا گیا ہے کہ کہ اگر ہماری جماعت ختم ہو گئی تو ملک میں کوئی اسلامی انقلاب کا نعرہ لگانے والا باقی نہ رہے گا۔ کیا اللہ نے انقلاب لانے کی ذمہ داری آپ کو سونپ دی ہے۔ اس نے تو یہ ذمہ داری پیغمبروں کو بھی نہیں سونپی تھی۔ انہیں بھی یہی کہا تھا کہ جو ہے کھول کھول کر بیان کر دو، ہدایت دینا ہمارا کام۔ جو سچ ہے کھول کر بیان کرو، خواہ اس میں جان چلی جائے یا آپ کی تنظیم۔۔۔ اصل سرخروئی تو آخرت میں ہو گی، ورنہ پارلیمنٹ کی سیٹیں، وزارتیں اور حکمرانی جیسے لالچ تو آپ کی منزل پہلے ہی کھوٹی کر چکے ہیں۔۔۔۔ ختم شد

نوٹ: اس موضوع پر یہ سب انتہائی دردمندی سے لکھا تھا۔ میں غلط بھی ہو سکتا ہوں، لیکن جس شدت سے مجھے جماعت اسلامی کے تیار کردہ سیاسی کارکنان نے سوشل میڈیا پر ملعون قرار دیا۔ اس کا مجھے بالکل دکھ نہیں۔ میرے ذہن میں جو آیا کھول کر بتا دیا۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس سناٹے سے بچو

ریاستی طاقت کا متعصبانہ استعمال کس قدر افسوسناک ہوتا ہے، اس کا اندازہ حکومتوں کی مسند پر بیٹھے افراد کو اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے نتیجے میں جو جہنم پیدا ہوتا ہے اس کی آگ میں صرف اور صرف عوام جلتے ہیں۔ تاریخ کا یہ صدیوں پرانا ہو گا لیکن اس کی بدترین مثالیں تو ہم جیتے جاگتے اپنے اردگرد دیکھ رہے ہیں۔ لیکن شاید ہمیں سبق ریاستی طاقت کا نشہ اندھا کر دیتا ہے اور ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ نشہ اس وقت مزید خطرناک ہو جاتا ہے جب اس میں نسل، عقیدے، مسلک، زبان، علاقے یا گروہ کا تعصب شامل ہو جاتا ہے۔ اس ریاستی طاقت کے اندھے استعمال سے ایک ایسا انتقام جنم لیتا ہے جو انتہائی خوفناک ہوتا ہے۔ جو لوگ اس انتقام کے دوزخ کا الاؤ روشن کرتے ہیں وہ اسے کسی اعلیٰ مقصد کا لبادہ ضرور پہناتے ہیں۔ کوئی قومی آزادی کا نعرہ لگاتا ہے تو کوئی نسلی برتری کا۔ کوئی عقیدے کا پرچم تھامے نکلتا ہے تو کوئی ملک کی بقا کا جھنڈا۔ ریاستی طاقت کے اس بے مہابہ استعمال کے نتیجے میں ایسے لوگ بھی خونخوار بھیڑیے جیسے منتقم مزاج ہو جاتے ہیں کہ جن کی زندگی امن و محبت کے گیت گاتے ہوئے گزری ہوتی ہے۔

کس کو یقین تھا کہ ایک ایسے خاندان کا فرد جس کی شہرت صوفیانہ مسلک کی وجہ سے ہو اور جسے پورے علاقے میں محبت اور امن کا سفیر سمجھا جاتا ہو۔ آل رسول اور سیدنا امام حسینؓ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا احترام کیا جائے اور لوگ ان کی نیکی اور صلح جوئی کی وجہ سے انہیں عزت و توقیر دیں۔ اس گھرانے کا ایک فرد جو کسی مدرسے کا نہیں بلکہ ماڈرن یونیورسٹی کا طالب علم ہو۔ جس نے بغداد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہو، وہ ایک دن پورے علاقے میں خوف اور دہشت کی علامت بن جائے گا۔ یہ شخص ابراہیم بن عواد بن علی بن محمد جسے آج دنیا ابو بکر البغدادی، الحسینی، الرضوی، الھاشمی، القریشی کے نام سے جانتی ہے۔ حسینی سادات کے قبیلے بدرین سے تعلق رکھنے والا یہ شخص 1971ء میں سمارا میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا حاجی ابراہیم ایک صوفی بزرگ تھا جبکہ اس کی دادی کی شہرت ایک انتہائی برگزیدہ خاتون کی حیثیت سے پورے بدری قبیلے میں عام تھی۔ ایسے گھرانے سے شناخت رکھنے والا ابو بکر البغدادی ان سب سے اتنا مختلف کیوں ہے۔ شام اور عراق کے وسیع علاقے میں امارتِ اسلامی قائم کرنے والا یہ شخص ایک پروفیسر تھا۔ جس نے 2003ء میں عراق پر امریکی حملے کے بعد جماعت جیش اہل سنہ والجماعہ کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اپنی علمی صلاحیت کی وجہ سے اسے اس کی شریعہ کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ اس گروہ نے خود کو مجاہدین شوریٰ کونسل میں ضم کیا اور اپنا نام 2006ء میں اسلامک سٹیٹ آف عراق (ISI) رکھا۔ بغدادی کو اس گروہ نے بھی شریعہ کمیٹی کا سپروائزر مقرر کیا۔ اس کا عملی طور پر جہاد اور جنگجو سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن پھر ایک دن اسے مقامی اور امریکی افواج پکڑ کر لے گئیں۔ جہاں وہ بک ّہ جیل میں 2009ء تک قید رہا اور اسے ایک غیر جنگجو فرد تصور کرتے ہوئے چھوڑ دیا گیا۔ بک ّہ جیل کا انچارج کرنل KemKing کہتا ہے کہ جیل میں وہ ایک پرامن قیدی کے طور پر رہا لیکن وہ اکثر یہ نعرہ ضرور بولتا "میں اب آپ لوگوں سے نیویارک میں ملوں گا" جسے ہم ہنسی میں ٹال دیتے۔

یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ کوئی جہادی گروہ کسی ملک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اسے عوام کی واضح اکثریت کی خاموش حمایت اور ہمدردی حاصل نہ ہو۔ ابو مصعب زرقاوی کی ہلاکت 2006ء میں ہوئی اور ابو بکر البغدادی کا عروج 2013ء میں۔ اس کے درمیان سات سال ایسے ہیں جن میں امریکی پشت پناہی سے قائم ہونے والی نوری المالکی کی حکومت نے مسلکی اقلیت کو القاعدہ کا نام دے کر خوفزدہ اور قتل کرنا شروع کیا۔ میں فسادِ خلق کے خوف سے وہ کہانیاں بیان نہیں کرنا چاہتا جو عراق سے بھاگنے والے لوگوں سے میں نے خود لبنان اور لندن میں سنیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان سات سالوں میں جو شہر اجاڑے گئے وہ سب القاعدہ کے مسکن تھے، جو قتل کیے گئے وہ دہشت گرد تھے اور جو مسجدیں اور مدرسے مسمار کیے گئے سب کے سب ٹریننگ کیمپ تھے۔ یہ تھا عالمی اور عراقی میڈیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ سب مسلکی اقلیت کے علاقے تھے۔ اس دوران 2010ء کے اپریل میں امریکہ نے عراق سے نکلنے کا پروگرام بنایا تو القاعدہ کے نام سے تمام گروہوں کے خلاف کریک ڈاؤن کا آغاز کیا۔ اس آپریشن کی قیادت نور المالکی کی افواج کر رہی تھیں۔ تکریت میں دو اہم رہنما مار دیے گئے۔ اس کے صرف ایک ماہ بعد جس نئی قیادت کا اعلان ہوا اس میں ابو بکر البغدادی کی حیثیت بہت اہم تھی۔ عراق کے صوبوں انبار اور نینویٰ میں جو قبائل آباد ہیں۔ ان کے نسلی اور خونی رشتے مشرقی شام کے قبائل سے ہیں۔ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے پشتون قبائل نسلی اور قومی اعتبار سے افغانستان سے منسلک ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں سرحد کی کوئی اہمیت نہیں ویسے ہی وہاں بھی سرحد کی کوئی اہمیت نہیں۔ شام میں جب دیگر عرب ممالک کی طرح ہنگامے شروع ہوئے تو بشار الاسد کی اقلیتی علوی حکومت کا خوف ریاست کی طاقت کے استعمال میں ظاہر ہوا۔ قبائل پناہ لینے کے لیے بھاگنے لگے۔ دس فیصد اقلیت کی علوی حکومت اور اسی فیصد سے زیادہ سنی آبادی۔ دونوں جانب سے مسلکی ٹھیکیدار ممالک ایران اور سعودی عرب کود پڑے۔ عراق میں لڑنے والوں کو ایک اور محاذ مل گیا۔ یوں ISI الاسلامک سٹیٹ آف عراق سے ISIS اسلامک سٹیٹ عراق اینڈ شام وجود میں آ گئی۔ سرحدیں بے معنی تو امریکہ نے کر دی تھیں، پھر ایران اور سعودی عرب نے کر دیں۔ اب ان کے خلاف لڑنے والوں نے بھی اسے ختم کر کے رکھ دیا۔ وہ ریاستی طاقت اور سرحد جس پر فخر کیا جاتا تھا 29 جون 2014ء کو ایک نئی اکائی میں تبدیل ہو گئی۔ ایک ایسا گروہ سامنے آ گیا جس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے تھے اور گزشتہ 9 سال سے القاعدہ کے نام پر ظلم، دہشت اور بربریت سہتی ہوئی اقلیت کی ہمدردیاں۔ ریاستیں کمزور پڑتی ہیں تو سازشی تھیوریاں اور میڈیا کا سہارا لیتی ہیں۔ کوئی مسائل کی جڑ تک نہیں پہنچنا چاہتا، اس لیے کہ ان کا طاقت کا نشہ اور اندر کا تعصب انہیں یہ نہیں کرنے دیتا۔ امریکی سازش ہے، یہودی ایجنٹ ہے، ایرانی مدد ہے، سعودی پیسہ ہے، بیرونی ہاتھ ہے، یہ سب کہنے سے زمینی صورت حال نہیں بدلتی۔ اس لیے کہ ایسی طاقتوں کی حمایت مسلکی اور نظریاتی ہوتی ہے اور پھر یہ حمایت ایک خون کا دریا عبور کر کے پیدا ہوئی ہے۔

پاکستان گزشتہ آٹھ سالوں سے ویسے ہی حالات کا شکار رہا ہے۔ افغانستان پر حملے کے بعد یوں تو امریکہ کا ساتھ دینے پر پوری قوم میں غم و غصہ تھا اور کوئی اختلاف موجود نہ تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ پرچم ایک مسلک کے لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ 2007ء میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے آپریشن نے اس میں خودکش حملوں اور تحریک طالبان کا اضافہ کیا۔ اس مسلک کے لوگوں کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ تھیں اور ملک میں جہاں بھی آپریشن ہوا اس کا رخ اسی جانب تھا۔ ایسے میں دوسرے تمام گروہ امریکی حمایت میں دیوانے سیکولرز کے محبوب تھے۔ ڈاکٹر طاہر القادری کا مشہور فتویٰ ہر جگہ حوالے کے طور پر دیا جاتا' سنی اتحاد کونسل طالبان پر گرجتی برستی اور مجلس وحدت المسلمین دہشتگردی کے خلاف جنگ میں ان کی اتحادی بنی رہی۔ ایک ایسی صورت حال جو سالوں قائم رہی۔ امریکہ نے افغانستان سے جانے کا قصد کیا تو تکریت کی طرح یہاں بھی آپریشن شروع ہو گئے۔ لیکن اب جس خوفناک منظر نامے کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں وہ ریاستی طاقت کا استعمال ہے۔ جو طاہر القادری' سنی اتحاد کونسل اور مجلس وحدت المسلمین کے خلاف استعمال سے پیدا ہو گا۔ کوئی بھی سانحہ ان گروہوں کو عراق کی طرح چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ ابھی تو صرف گیارہ لاشیں گری ہیں' یہ تعداد بڑھی تو پھر لوگ رہنماؤں کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ انتقام ان کی آنکھوں میں خون بھر دیتا ہے۔ ایک جانب پورے ملک میں طالبان اور ان کے ہم مسلک وہ لوگ ہوں گے جو آپریشن کے زخم خوردہ ہیں اور دوسری جانب دوسرے مسلک کے موجودہ صورت میں لاشیں اٹھائے گروہ۔ جب گروہ چھوٹے ہو جائیں اور پورے ملک میں پھیل جاتے ہیں اور اگر ان میں مسلک کا اختلاف اور ظلم کے خلاف غصہ بھی ہو تو ان تک اسلحہ بہت آسانی سے پہنچ سکتا ہے' اگر پاکستانی ریاست کو اس کا علم نہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہ رہی ہے۔ پورے ملک میں پولیس' رینجرز اور دیگر اداروں کے افراد کی تعداد چار لاکھ کے قریب ہے۔ اس تعداد کو پورے ملک پر پھیلا دیں اور پھر سوچیں کہ ہم کس بھیانک منظر نامے کا بیج بونے جا رہے ہیں۔ کسی نے کبھی سوچا تھا کہ ایک صوفی گھرانے کا مرنجان مرنج پروفیسر ابو بکر البغدادی بھی بن سکتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اصطلاحات کا خوف

کیا عجب ملاپ ہے، گٹھ جوڑ ہے، مقصد کی ہم آہنگی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کی تخلیق کردہ قومی ریاستوں کی انجمن ،اقوام متحدہ میں بھی اس کی گونج سنائی دی ہے۔ پہلے بان کی مون گرجے کہ دنیا کو اسلامی شدت پسندوں سے خطرہ ہے ،انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد دنیا پر خود کو بلا شرکت غیرے حکمران تصور کرنے والے امریکہ کا صدر اوبامہ اس شدت پسندی پر دنیا کو متحد ہو کر مقابلہ کرنے کے لیے آواز دیتا دکھائی دیا۔ لیکن اپنی اس تقریر سے صرف ایک دن پہلے، خطے کے چھ عرب ممالک کے ساتھ مل کر، اس نے اس گروہ کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا تھا جس نے جدید مغربی تہذیب کے تصورِ قومی ریاست و حکومت کے برعکس اسلامی ریاست اور خلافت کے لفظ استعمال کئے تھے۔ کیسا گٹھ جوڑ ہے کہ تمام عرب ریاستیں اور امریکہ جو شام کی بشار الاسد کی حکومت کو ظالم قرار دیتے تھے، ابھی اسی کے باغیوں کے ٹھکانوں پر بم برسا رہے ہیں۔ وہ ایران جو ان عرب ریاستوں کے خلاف نبرد آزما تھا، وہ بھی اس گروہ کے خلاف کارروائی کرنے میں شریک ہے، اور اس کا قلع قمع چاہتا ہے۔ آخر اس لفظ خلافت کے ادا ہوتے ہی ایسا طوفان کیوں کھڑا ہو جاتا ہے۔ مغربی سانچے میں ڈھلا ہوا کوئی بھی نظام حکومت بنا لو اور اسکا نام اسلامی جمہوریہ رکھ لو، دنیا کے کسی خطے میں خوف کی لہر نہیں دوڑتی۔ انقلاب ایران بھی نظام حکومت پر مغربی اصلاحات کی چھاپ کی وجہ سے آج تک قابلِ قبول ہے۔ صدر، پارلیمنٹ، سپیکر، الیکشن، یہ سب کیا ہے۔ کیا خلیفہ المسلمین یا امیر المومنین کا لفظ استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے، پسماندگی کا احساس ہوتا ہے، دقیانوسی کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ نہیں اس لیے کہ لوگوں کے ذہن میں پرکھنے کے معیار بدل جاتے ہیں۔ جب حکمران کو صدر یا وزیر اعظم کہا جاتا ہے تو معیار چرچل، نکسن یا ڈیگال ذہنوں میں گونجتے ہیں۔ لیکن اگر خلیفہ یا امیر کہا جائے تو ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کی طرزِ حکومت اور دورِ خلافت معیار بن جاتا ہے۔ پھر لوگ اسی معیار پر حکمرانوں کو تولنے لگتے ہیں۔ برداشت تو جمہوری طور پر منتخب صدر مرسی بھی نہیں ہوتا اور کہاں لفظ خلیفہ استعمال کرنے والا ابو بکر البغدادی۔ دنیا بھر میں گزشتہ ایک صدی سے سینکڑوں ایسی تنظیمیں بنیں جو مسلح تھیں، جو اپنے خطوں کو آزاد کروانے کے لیے مسلح جنگ لڑتی رہیں۔ وہ بے تحاشا قتل بھی کرتے تھے، اغوا برائے تاوان سے پیسے بھی کماتے تھے، بستیوں کو آگ بھی لگاتے تھے، ایک خاص علاقے پر کنٹرول حاصل کر کے حکومت کا اعلان بھی کرتے تھے۔ لیکن کبھی اقوام متحدہ کے ایوانوں میں ایسی صدا نہیں گونجی کہ سب مل کر ان کو نیست و نابود کر دو۔ ان قوم پرست مسلح تنظیموں کے تو ہیڈ کوارٹر برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں قائم ہوتے رہے ہیں۔ ان کے وہ لیڈر جن کے حکم پر ان کے علاقوں میں قتل و غارت برپا ہوتی تھی، وہ مزے سے لندن، پیرس اور نیویارک سے بیٹھ کر احکامات جاری کرتے تھے آئرلینڈ کی مسلح جدوجہد کا سب سے زیادہ چندہ امریکہ سے اکٹھا ہوتا تھا۔ کیا کسی کو سوویت یونین انقلاب کی ریڈ آرمی کے ہاتھوں یوکرین کے ان پچاس ہزار شہریوں کا قتل عام یاد نہیں جنہیں ہاتھ باندھ کر گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور کیا ان ظالمانہ کارروائیوں کا سربراہ یقیناً مغرب کے ممالک میں پناہ کے نام پر عیش کی زندگی نہیں گزارتا رہا۔ لیکن اس سب کو آزادی کی جدوجہد اور انقلاب کے لوازمات کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ابو بکر البغدادی جب عراق اور شام کے وسیع علاقے میں برطانیہ سے بھی رقبے میں بڑی حکومت قائم کر کے اسے خلافت کا نام دیتا ہے تو جہاں مغرب اس سے خوفزدہ ہو کر متحد ہو جاتا ہے وہیں مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے ہاں بھی اسے پرکھنے کا معیار بدل جاتا ہے۔ وہ اسے خلفائے راشدین کے معیار پر پرکھنے لگتے ہیں۔ وہ اس سے رحمدلی اور اقلیتوں کے تحفظ کی توقع کرتے ہیں، وہ اسے انتقام سے بالاتر حکومت کا سربراہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے صرف ایک اصطلاح (Terminolgy) کو بدلنے یا استعمال کرنے کا فرق۔ اس فرق کو مغرب والے ہم سے بہت بہتر جانتے ہیں جنہوں نے آج سے نوے سال قبل اس خلافت کو توڑ کر قومی ریاستیں قائم کی تھیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ لفظ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت ہے ۔ایک ایسی طاقتور مرکزیت، جو دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی ہے اور اس مرکزیت کا تصور صرف اور صرف روزمرہ زندگی میں اسلام کی اصطلاحات کے نفاذ سے جنم لیتا ہے۔

مسلمانوں کو ان اصطلاحات سے دور کرنے کے لیے گزشتہ تین صدیوں سے محنت کی گئی ہے۔ پوری مسلم امہ تقریباً سو سے زیادہ سالوں تک مغربی قوتوں کی غلام رہی ہے۔ اس دوران پوری دنیا سے عیسائی مشنریاں یہاں مختلف داؤ پیچ کے ساتھ تبلیغ کے کاموں میں سرگرم رہیں۔ رفاہ عامہ کے کام، مریضوں کے ہسپتال اور تعلیمی ادارے کھولے گئے لیکن پوری مسلم دنیا میں اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد چند سو سے بھی کم تھی۔ ایسے میں ایک اور وار کیا گیا کہ مسلمانوں میں ان کے اندر سے دشمن پیدا کیے جائیں جو ان کو ترقی، تہذیب اور معاشرت کے نام پر پرانی اسلامی تصورات سے علیحدہ کر دیں۔ علم سیاسیات، معاشرت، معاشیات اور بشریات کی کتب تحریر کی گئیں اور ان میں قومیت، نسلی برتری، تہذیبی اور جمہوری نظام کی اصطلاحات اور نظریات کو ترویج دی گئی۔ اس کی ایک مثال عالمی انسانی حقوق ہیں جبکہ اس تصور سے پہلے پوری مسلم دنیا حقوق العباد کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ عالمی انسانی حقوق کے تصور کے تحت اگر کسی ملک میں پانچ لاکھ بوڑھے شاندار اولڈ ایج ہوم میں بہترین سہولیات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں تو وہ ملک عالمی انسانی حقوق کے معیار کی بہترین سطح پر ہے۔ لیکن اسلام کے تصورِ حقوق العباد میں ایسے پانچ لاکھ گھرانے قابلِ ملامت ہیں اور اللہ کے نزدیک عذاب کے مستحق۔

یہی وہ اصطلاح کا فرق ہے جو ایک مسلمان معاشرے کو جدید مغربی، تہذیب کے معاشرے سے علیحدہ کر دیتا ہے۔

ان تمام اصطلاحات کا منبع اور مرکز لفظ خلافت یا امارت ہے جسے اسلامی اصطلاح میں خلافت علیٰ منہاج ال بنوہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے جو گروہ بھی اس اصطلاح کا استعمال کرے گا وہ واجب القتل ہے۔ دہشت گرد ہے۔ پوری دنیا میں استعمال ہونے والی مغربی اصطلاحات میں صدر، وزیر اعظم پارلیمنٹ یا دیگر خواہ بدترین آمر بھی استعمال کریں، سوہارتو کی طرح انڈونیشیا میں چھ لاکھ لوگوں کو قتل کر دیں لیکن انہیں تیس سالوں تک برداشت کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی نشستوں پر انہیں جگہ دی جاتی ہے۔ وہ قاتل، ظالم، اور بدترین حاکم ہونے کے باوجود اس پوری مغربی دنیا کو اس لیے قابل قبول ہوتے ہیں وہ ایسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو مسلم امہ کی مرکزیت کی علمبردار نہیں ہوتیں اور صرف مغرب ہی یہ جانتا ہے کہ یہ سب تقسیم انہوں نے خود بے نام اور جعلی لکیریں کھینچ کر پیدا کی ہے۔ ہر جگہ اقتدار کے بھوکوں کو تخت پر بٹھایا ہے اور اسلحے کی ترسیل اور فوجی مدد سے مستحکم کیا ہے۔ انہیں علم ہے کہ یہ دنیا کی وہ واحد امت ہے جو آج بھی یمن، مصر، سعودی عرب اور دیگر ممالک سے گھربار چھوڑ کر بوسینا، چیچنیا، عراق، افغانستان اور کشمیر میں لڑتی ہے، جان دیتی ہے۔ اگر یہ حکمران بیچ میں سے نکل جائیں تو انہیں متحد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کی مرکزیت قائم ہو گئی تو یورپی یونین سے بڑا اتحاد بن سکتا ہے جو تیل کی دولت اور معدنیات کے خزانوں سے مالامال ہو گا۔ اسی لیے دسمبر 2004ء میں امریکہ کی نیشنل انٹیلی جنس کونسل (NIC) نے ایک رپورٹ صدر کو پیش کی جس کا نام (MappingGlobalFuture) تھا۔ اس میں پوری دنیا کو جس خطرے سے آگاہ کیا گیا تھا وہ ایک نئی خلافت کا قیام تھا۔ اسی بنیاد پر اکتوبر 2005ء میں جارج بش نے خبردار کرتے ہوئے کہا تھا۔

".establish a radical Islamicempirethatspansfrom Spainto Indonesia

enablingthemtooverthrowallmoderategovernmentsintheregion,and

,Theybelievethatcontrollingonecountrywillrallythe Muslimmasses"

"وہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک ملک پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ اردگرد کی تمام ماڈریٹ حکومتوں کا تختہ الٹ کر ایسی حکومت قائم کر دیں گے جو سپین سے انڈونیشیا تک ہو"۔ ایسے میں خوف القاعدہ کا نہیں کہ وہ تو حملے کر کے ایک سمت ہو جاتی ہے۔ خوف ملا محمد عمر تھا جس نے امیر المومنین کی اصطلاح استعمال کی اور اس کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ خوف شام اور عراق کی امارات اسلامی کا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں امارات کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں امریکہ، عرب ریاستیں اور ایران سب کا گٹھ جوڑ ہے۔ سب پر خوف سوار ہے۔ سب کسقدر خوفزدہ ہیں۔ سب صرف ایک اصطلاح کے استعمال سے ڈرتے ہیں، جانتے ہیں کہ اس کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے دلوں میں کونسے معیارات زندہ ہو جاتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

اسلام اور قومیت

بحیثیت مسلمان آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں رہتے ہوئے آپ کسی بھی قسم کا مذہبی' خاندانی' معاشرتی اور فلاحی کام کر رہے ہوں' آپ نے اس کام کے فروغ کے لئے انجمن بنائی ہو' آپ پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ آپ پانچ وقت جوق در جوق نماز پڑھیں حتیٰ کہ جمعہ کے روز صفیں مسجد کے باہر بھی بچھا لیں' آپ میلاد کانفرنس کرائیں یا توحید کانفرنس' آپ دس دن محرم کی مجالس منعقد کروائیں اور ربیع الاول کا پورا مہینہ نعت خوانی کی مجالس کا اہتمام کریں' رمضان کی تراویح ہو یا عید کی نمازیں' آپ کے تمام اعمال ایک مذہبی رسم کے طور پر مغرب کے ہر گلی کوچے میں قابل قبول ہیں۔ اس لئے کہ جدید مغربی تہذیب' مذہبی عبادات کو بھی صدیوں سے اختیار کردہ ثقافتی رسوم کے طور پر سمجھتی ہے' اسی لئے مسلمانوں کی مساجد' سکھوں کے گوردوارے' ہندوؤں کے مندر اور یہودیوں کے سانیگوگ وہاں کی اکثریت یعنی عیسائیوں کے گرجوں کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تمام ممالک سب کچھ اس وقت برداشت کرتے ہیں یا اس کی اجازت دیتے ہیں جب آپ خود کو ان کی قومیت میں ضم کر لیں۔ آپ جرمن' برٹش' فرنچ یا نارویجن مسلمان کہلانے لگیں۔ آپ کا اس سرزمین' ان کے سیاسی نظام' ان کے معاشی و معاشرتی اصولوں اور ان کے پاسپورٹ سے تعلق اور احترام کا رشتہ قائم ہو جائے۔ اس کے بعد تو حجاج کرام کے قافلے وہاں سے چلتے ہیں' ان ممالک کے سفارت خانے اپنے مسلم ہم وطنوں کیلئے سہولیات بہم پہنچاتے ہیں۔ بڑے بڑے ٹور آپریٹر وہاں اپنا قانونی کاروبار کرتے ہیں اور لوگوں کو حج اور عمرہ کیلئے بھیجتے ہیں۔ آپ کسی بھی قسم کی رفاہی تنظیم بنا لیں' وہاں سے فنڈ اکٹھا کریں' سیلاب زدگان' زلزلہ زدگان' یتیموں اور بیواؤں کی مدد کے لئے پیسے اکٹھا کر کے مسلمان ملکوں کو بھیجیں' آپ پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ لیکن اس سارے کرم اور مہربانی کے باوجود یہ دو الفاظ دنیا کے کسی بھی ''مہذب'' ملک اور مغربی معاشرت سے برداشت نہیں ہوتے' ایک خلافت اور دوسرا جہاد ہے۔ یہ دونوں الفاظ کس راستے کی نشاندہی کرتے ہیں اور کس تصور قومیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سول سروسز اکیڈمی کے میرے جبراً استاد مکرم نے انہی دونوں تصورات کی نفی ایک بار پھر زور و شور کے ساتھ کی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ان کی اس منطق پر حیرت ہوتی ہے۔ آپ دین کی اصطلاحات کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے اور مغرب کی تراشیدہ اصطلاحات سے بھی آپ کو رغبت ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں اخوت کا رشتہ تو ہے قومیت کا نہیں۔ یعنی مسلمان آپس میں بھائی تو ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ اپنی رنگ نسل' زبان علیحدہ ہونے کے باوجود ایک قوم بھی بن جائیں اور ان کا سب کا ایک خلیفہ بھی ہو۔

جناب علامہ صاحب' کہ جوانی میں انہیں اسی نام سے پکارا جاتا تھا' کاش آپ اس مسلم امہ کے ایک ہونے کے تصور کے اس تاریخ معجزے کا غور سے مطالعہ کر لیتے۔ مغرب کے تمام علوم اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا میں سب سے طاقتور چیز ثقافت یا طرز معاشرت ہے۔ آدمی صدیاں لگا دیتا ہے لیکن اپنی ثقافت کو نہیں بھولتا' اس ثقافت میں سب سے اہم چیز مادری زبان ہوتی ہے۔ پنجاب کا سکھ ہو یا بنگال کا بنگالی' کئی نسلیں یورپ میں گزارنے کے باوجود اپنی مادری زبان سے آشنا رہتا ہے۔ کبھی اسلامی تاریخ کے اس معجزے پر انہوں نے غور کیا ہے کہ اسلامی ریاست میں آنے سے قبل' شام' عراق' لبنان' مصر' لیبیا' سوڈان' مراکش' اردن' تیونس میں نہ لوگوں کی مادری زبان عربی تھی اور نہ ہی کاروباری اور علاقائی زبان۔ یہاں امریکیوں کی طرح کسی نے نسل کشی بھی نہیں کی تھی جیسے انہوں نے وہاں کے مقامی ریڈ انڈین کو مار مار کر ناپید کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جدید ذرائع ابلاغ بھی نہیں ایجاد ہوئے تھے کہ لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر زبان اختیار کر لیتے۔ تعلیمی نظام کی جڑیں بھی اس طرح گہری نہیں تھیں کہ طرز تعلیم انگریزی میں کر دو تو یہ لوگوں کی مجبوری بن جائے۔ تاریخ رعایا پر مسلمان خلفاء کے جبر کی بھی کوئی گواہی نہیں دیتی۔ متعصب ترین مورخ بھی خلفائے راشدین اور بعد کے حکمرانوں پر یہ تہمت نہیں لگاتے کہ انہوں نے زبردستی اپنا دین نافذ کیا' اپنی زبان لاگو کی ہو یا اپنا کلچر کسی پر تھوپا ہو۔ لیکن یہ سب کے سب ملک آج عرب ورلڈ کا حصہ ہیں۔ ان کو یاد تک نہیں کہ ان کے آباؤاجداد کی مادری زبانیں کونسی تھیں۔ یہ ان لوگوں کا کمال تھا جو خالصتاً سید الانبیاء ﷺ کی تربیت سے بہرہ مند ہوئے تھے۔ اخوۃ کا یہ رشتہ ایسا تھا جس نے ''الکفر ملۃ واحدہ'' کو تحلیل کر کے رکھ دیا۔ ایران میں بھی صفوی حکمران اگر ایک خاص مقصد کے لئے فارسی زبان کو زبردستی قائم نہ کرتے اور بقول ایرانی مفکرین اگر فردوسی کا شاہنامہ نہ لکھا جاتا تو فارسی آج ختم ہو چکی ہوتی۔ برصغیر میں بھی اسلام خلجیوں' غوریوں' غزنویوں اور مغلوں کی وجہ سے آیا جو اپنی بادشاہت کی سرفرازی کا مقصد لے کر آئے تھے اس لیے یہاں بھی وہی قومی ریاست بن سکی' اسلامی ریاست وجود میں نہ آئی۔ لیکن جہاں آپ ﷺ کے ساتھی پہنچے اور انہوں نے وہاں حکومت قائم کی وہاں کا رنگ' ڈھنگ اور بول چال تک سب اس زبان میں ڈھل گئی جسے وہ قرآن کی زبان قرار دیتے تھے۔ یہ ہے تاریخ کی وہ گواہی۔ قومیں جغرافیے کی لکیریں کھینچنے سے صرف آج کے دور میں بنا کرتی ہیں جنہیں قومی افواج سرحد کی حفاظت کا تصور دے کر ایسے قائم رکھتی ہیں جیسے چڑیا گھر میں جانور۔ اگر یہ قومیں اتنی ہی موثر ہوتیں تو قومی افواج کا تصور نہ ہوتا بارڈر پر پہرے داران ان قومیتوں کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ وہ اسلامی اخوت ہے جو قوموں کے نسلی' علاقائی اور زبانی امتیازات تک ختم کر دیتی ہے۔ اسی اخوت کی کوکھ سے مسلمانوں کی مرکزیت یعنی خلافت نے جنم لیا۔ حیرت کی بات ہے کہ دین کی تشریح سیدنا ابو بکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک کے خلفائے راشدین کو معلوم نہ تھی اور میرے جبراً استاد کو اب سمجھ آئی کہ خلافت کی مرکزیت دین کا منشاء نہیں ہے۔ ایران جیسی عظیم سلطنت کو اتنی دور سے سنبھالنا اور وہ بھی ذرائع آمد و رفت کے اس دور میں اتنا آسان نہ تھا' مصر بھی ہزاروں سال علیحدہ بادشاہت کے طور پر رہا تھا۔ حضرت عمرؓ ان دونوں خطوں کو قومی ریاستیں کہہ کر علیحدہ کر دیتے اور کہہ دیتے تم تو اصل میں بھائی بھائی ہو لیکن تمہارے ملک چونکہ صدیوں سے علیحدہ رہے ہیں اس لیے تمہاری ریاست' حکومت اور خلافت بھی علیحدہ کر دیتا ہوں' تم جانو اور تمہارا ملک۔ شاید وہاں کوئی ''اعوارد'' رسالہ نہیں نکالتا تھا ورنہ ضرور یہ اعتراض اٹھاتا۔ حیرت ہے چودہ سو سال گزرنے کے بعد یہ اعتراض اٹھایا جا رہا ہے کہ خلافت کی مرکزیت دین کا منشاء نہیں تھی۔ گویا موصوف تمام خلفائے راشدین سے زیادہ دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔ شاید ان سے زیادہ اس دین کو جارج بش اور ٹونی بلیئر سمجھتے ہیں جو مسلمانوں میں ذرا سی بھی اخوت کی جھلک دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں TheywantKhilfaBack (یہ تو دوبارہ خلافت نافذ کرنا چاہتے ہیں)۔ ایسے میں سب مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی دو احادیث پوری دنیا کو دو اقوام میں تقسیم کرتی ہیں۔ ایک ''الکفر ملۃ واحدہ'' پورا کفر ایک قوم ہے'' اور دوسرا آپ ﷺ نے مسلمانوں کے بارے میں ایک لفظ استعمال کیا ''جسد واحد'' یعنی ایک جسم۔ ایک جسم میں تمام نظام مربوط ہوتے ہیں' ایک اعصابی نظام' ایک انہضام' ایک دل' ایک دماغ۔ اس جسد واحد یا ایک جسم کے دو دماغ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب دو خلیفوں میں بیعت ہو جائے تو دوسرے والے کو قتل کر دو''۔ اسی تصور کی نفی کرنے اور اسی جسد واحد کو توڑنے کے لئے ہی تو قومی ریاستیں وجود میں لائی گئیں تھیں۔ لیکن مسلمان دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو ان ریاستوں کی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کے لئے نکلتی ہے۔ اسی تصور جہاد کو ختم کرنے کے لئے ہی توامت کے تصور کی نفی کی جاتی ہے۔ کیا میرے موصوف استاد نے سورہ انساء کی 75 آیت نہیں پڑھی۔ ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو' جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے''۔ کیا یہ آیت کافی نہیں کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کی حالت زار اور مسلم امہ کی ذمہ داری بیان کرنے کے لئے۔ یہاں مسلم اخوۃ بھی شاید نہ روک سکے لیکن جدید قومی ریاست ضرور آڑے آئے گی۔ اسی لئے یہ تصور مغرب کو بھی بہت پیارا ہے اور میرے استاد کو بھی۔

KitaabPoint.blogspot.com

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اسلام کا المیہ یہ ہے کہ جس کسی نے اس پر انگلی اٹھائی‘ اس میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی‘ فرقہ بندی اور گروہی اختلافات کا آغاز کیا‘ اس نے کبھی اسلام کے عقائد پر طعن زنی نہیں کی‘ کبھی قرآن وسنت کے اصولوں پر بحث کو نہیں چھیڑا بلکہ اسلام کو رسوا کرنے کے لئے ہمیشہ تاریخ کا سہارا لیا۔ اس امت کے سب سے بڑے اختلاف شیعہ سنی مسالک کو لے لیجئے‘ اس کی بنیاد عقائد نہیں‘ تاریخ ہے۔ آج بھی اسلام کو بدنام کرنا ہو تو مسلمانوں کی تاریخ اور کردار پر انگلی اٹھائی جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کی اکثریت اگر ناکام اور بددیانت ہو تو کوئی میڈیسن کے علم کو بے کار نہیں کہتا‘ یہاں تک کہ جمہوریت کی کوکھ سے بدترین آمر اور بددیانت وزراء بھی جنم لے لیں پھر بھی کوئی جمہوری نظام کو برا نہیں کہتا بلکہ افراد پر الزام رکھتا ہے۔ لیکن یہ سلوک صرف اسلام کے ساتھ ہے کہ کوئی مسلمان اگر ناپسندیدہ عمل کر دے تو بڑے سے بڑا دانشور بھی پکار اٹھتا ہے، ”یہ ہے ان کا اسلام“۔ مغرب نے جہاں دین کو پرکھنے کے لئے ہمیں بددیانت اور متعصب تاریخ دانوں کی تاریخ پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈالی ہے‘ وہیں انہوں نے ہمیں اپنی اصطلاحات سے دور کر کے اپنے جدید مغربی سیکولر تہذیب کے اداروں‘ قومی ریاست‘ سیکولر جمہوریت اور عالمی اداروں یعنی اقوام متحدہ جیسے تصورات کو اسلام کے ماضی سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس کے لئے صرف اور صرف تاریخ کا سہارا لیا ہے۔

ایسی ہی ایک تازہ ترین کوشش ایک ایسے صاحب علم کی جانب سے کی گئی جن کا مجھے ایک سال کے لئے جبراً شاگرد ہونا پڑا۔ میں نے ”جبراً“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ جب اکتوبر 1984ء میں سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ٹریننگ کے لئے سول سروس اکیڈمی میں آیا تو یہ صاحب ہمیں اسلامیات، جسے انگریزی میں اسلامک سٹڈیز کہتے ہیں، پڑھاتے تھے۔ ان کی جوانی ادھیڑ عمر میں داخل ہو رہی تھی اور میں عنفوان شباب میں تھا۔ ان صاحب نے اپنے تازہ مضمون ”اسلام اور ریاست ایک جوابی بیانیہ“ میں قرآن وسنت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ سے قومی ریاست کے موجودہ تصور کو اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور مغربی جمہوریت کی اساس‘ عالمی اقوام متحدہ جیسی اسلامی اقوام متحدہ کا تصور پیش کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں ”جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے‘ وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں“، پھر کہتے ہیں ”نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا حکم ہے“ اور آخر میں تاریخ کا سہارا لیتے ہوئے دین کی تشریح یوں پیش کی ہے ”پہلی صدی ہجری کے بعد ہی جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاان کے درمیان موجود تھے‘ ان کی دو سلطنتیں‘ دولت عباسیہ اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں‘ اور کئی صدیاں قائم رہیں‘ مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا“۔

ان صاحب نے جس طرح پوری امت مسلمہ کی تاریخ کو اپنے اس فقرے میں سمو کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسلی جانشینی کے ساتھ قائم ہونے والی ملوکیت جو بعد میں عباسی اور اموی‘ ان کے علم کے مصداق ”قومی ریاستوں“ کی صورت وجود میں آگئی تھیں وہ شرعی تھیں۔ لیکن اپنے اس تصور کے ساتھ ہی انہوں نے چودہ سو سال کے مسلم فقہا کو بھی شریک کر لیا ہے۔ انہیں تاریخ کی کتابوں سے سیدنا امام حسینؓ کی کربلا سے لے کر امام احمد بن حنبل تک کی قربانیوں‘ زید بن علی، امام نفس ذکیہ کی شہادتوں کو اپنے اس فقرے سے رد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کاش وہ فقہ کی وہ کتابیں اٹھا کر دیکھ لیتے تو انہیں سنیوں میں خلافت اور شیعوں کی امامت کی مرکزیت ضرور نظر آتی۔ ان تمام فقہی کتابوں کا ماخذ دونوں مسالک نے قرآن وسنت سے لیا ہے۔ مسلمانوں نے چودہ سو سال میں ایک دن کے لئے بھی ”سلطان م تغلب“ یعنی جو طاقت کے زور سے حکمران بن جائے‘ اس کو جائز قرار نہیں دیا۔ اس کے خلاف اٹھتے رہے‘ آواز بلند کرتے رہے۔ پوری مسلم تاریخ ہے ان قربانیوں کی ایک لازوال داستان ہے۔ فقہ تو میرے ”استاد مکرم“ ان صاحب کا میدان ہے لیکن میں جسارت کر رہا ہوں انہیں چند اشارے دینے کی جو ہمارے فقہا ایک امارت‘ ایک خلافت اور ایک مسلم امت کے حق میں شرعی حیثیت میں آغاز سے ہی دیتے چلے آئے ہیں۔ میں جناب حامد کمال الدین مدیر ایقاظ کا ممنون ہوں‘ جنہوں نے اس سلسلے میں میری رہنمائی کی۔ سیاست شرعیہ پر سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں الماوردی نے قلم اٹھایا جو اپنے وقت کے قاضی القضاۃ تھے۔ وہ کہتے ہیں ”جمہور کا مذہب رہا ہے کہ ایک زمانے میں دو اماموں کو مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا“ جب دو امیروں کی بیعت ہو جائے تو ان میں ایک کو قتل کر دو (ادب الدنیا والدین) ماوردی آگے چل کر تفصیل سے لکھتے ہیں ”اگر دو مختلف ملکوں میں دو امیروں کو امامت سونپی جائے تو ان دونوں کی امامت منعقد نہ ہو گی کیونکہ ایک وقت میں امت کے دو امام جائز نہیں (احکام السلطانیہ)۔ ذرا اس تصور خلافت کے ماخذ یعنی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو دیکھئے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل کے معاملات سیاست انبیاء چلاتے تھے‘ جیسے ہی کوئی نبی دنیا سے جاتا اس کا جانشین نبی ہوتا۔ اب ”یقیناً میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے‘ ہاں خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے“۔ امام نووی نے اس کی شرح میں اجماع امت کا مذہب بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ ”علماء کا اتفاق ہے کہ ایک زمانے میں دو خلیفے نہیں ہو سکتے خواہ دار الاسلام کا رقبہ بہت زیادہ وسیع ہو یا نہ ہو (شرح مسلم)۔ ابن حزم پانچویں صدی ہجری کے فقیہہ ہیں۔ ان کے نزدیک ”مسلمانوں پر ایک وقت میں پوری دنیا کے اندر دو امام ناجائز ہیں‘ خواہ وہ امام اکٹھے ہوں یا متفرق۔ یہ نہ دو الگ الگ جگہوں پر جائز ہیں اور نہ ایک جگہ میں“ (مراتب الاجماع۔ ابن حزم)۔ حنفی‘ مالکی‘ شافعی اور حنبلی تمام مستند فقہی کتابوں میں ایک امت‘ ایک امیر اور ایک خلیفہ پر ہی اتفاق ہے۔ حنفی فقہ کی کتب (الاشباہ والنظائر لابن نجیم) اور (غمز عیون البصائر‘ لل حموی) کے مطابق امام ایک زمانے میں متعدد ہونا جائز نہیں جبکہ قاضی متعدد ہونا جائز ہے۔ مالکی فقہ کی کتاب (حاشیۃ الدسوقی) کے مطابق امام کا متعدد ہونا منع ہے“۔ شافعی مسلک کی کتاب (اسنی المطالب فی شرح روض الطالب) نے تو بات اور واضح کر دی ”دو یا دو سے زیادہ اماموں کی امارت کا انعقاد جائز نہیں‘ چاہے خطے میں الگ کیوں نہ ہوں‘ چاہے خطے دور دور کیوں نہ ہوں۔ حنبلی مسلک کی کتاب (مطالب اولی ال نھی) کے مطابق ”متعدد امام ہونا جائز نہیں“۔ یہ تمام کتب ان مسالک کی بنیادی کتب ہیں اور چودہ سو سالہ فقہی اجماع پر بنیاد رکھتی ہیں۔ لیکن کیا کریں وحدت ملت اسلامی نہ دنیا بھر کے کفر کو اچھی لگتی ہے اور نہ ہی ان مسلمانوں کو جو اس امت کو ایک دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ قومی ریاستیں جو جنگ عظیم اول کے بعد عالمی طاقتوں نے بزور بنائیں‘ پھر لیگ آف نیشنز کا انہیں ممبر بنا کر 1920ء میں پاسپورٹ کے ڈیزائن کو منظور کیا۔ 1924ء میں ویزا ریگولیشن بنائے اور پوری دنیا خصوصاً مسلم امہ کو رنگ نسل وزبان اور علاقے میں تقسیم کر دیا‘ اس امت کو اگر کوئی متحد دیکھنے کا خواب دیکھتا ہے تو جارج بش اور ٹونی بلیئر جیسے پکار اٹھتے ہیں یہ تو خلافت واپس لانا چاہتے ہیں (ThewantkhalafaBack) یہ تھے وہ الفاظ جو دونوں نے اپنی پارلیمنٹ یا کانگریس میں ادا کئے۔ ملت کفر کو احساس ہے کہ مسلمانوں کو صرف خلافت متحد کر سکتی ہے لیکن میرے ”استاد مکرم“ کے نزدیک نہ یہ اسلامی اصطلاح ہے اور نہ مسلمانوں کی تاریخی علامت۔ شاید مسلمان علماء فقہا اور ظالم بادشاہوں کے سامنے کلمہ حق کہنے والے مسلم امہ کے شہیدوں کی تاریخ سے اسقدر لاعلمی کسی اور نے برتی ہو گی۔ صاحب بصیرت اقبال یاد آتے ہیں‘ جب یہ قومی ریاستیں بن رہی تھیں تو اقبال پکار اٹھے تھے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

(نوٹ: دفتری اور قانونی انگریزی زبان کے متبادل پر بحث 17 فروری بروز منگل اڑھائی بجے دوپہر پنجابی انسٹیٹیوٹ آف لینگویج قذافی سٹیڈیم میں منعقد ہو گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

جدید سیکولر نظامِ تعلیم کی تاریکیاں

جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے تحت پوری دنیا میں اس وقت جتنے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں، اگر ان کی تعداد کا شمار کیا جائے تو یوں لگے گا جیسے آج کا دور صرف اور صرف انسانوں کو علم باٹنے کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس علم کی روشنی سے جو انسان بر آمد ہو رہے ہیں انہوں نے اپنے اردگرد ایک چکا چوند انسانی بستی آباد کر لی ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں پُر آسائش گھر ہیں، تیز رفتار گاڑیاں، ٹرینیں اور جہاز ہیں، آسمان کو چھوتی عمارتیں ہیں، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن، غرض آسائش کا ہر سامان میسر ہے۔ بیماری کے علاج کے لیے ہسپتال اور ہمہ وقت مستعد صحت کا عملہ ہے، صاف پانی، بجلی، گیس اور دیگر سہولیات بہم پہنچانے کے لیے ایک شاندار خدماتی نظام کار موجود ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ دن رات مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں اس دھن میں مگن رہتے ہیں کہ نئی سے نئی چیز مارکیٹ میں لائی جائے جس کو لوگ پسند کریں۔ ان تمام تر آسائشوں اور مادی سہولتوں کے باوجود آج کا انسان انسانی تاریخ کا سب سے غیر مطمئن اور ناآسودہ انسان ہے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں اس نے جو بھی علم سیکھا اور اس دنیا میں جو معراج حاصل کی اس نے اس کی مادی زندگی کو تو پُر آسائش بنایا لیکن اس کی روح کو بے منزل، بے راہ رو اور بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بے منزل اور بے سکون انسان کے درد کا مداوا موجودہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے کسی بھی سبق میں موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ نفسیات کا مضمون ہے اور وہ بھی شعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں سے ہوتا ہوا بالآخر چند سکون بخش ادویات یا جسم کی اینٹھن دور کرنے والی ورزشوں پر ختم ہو جوتا ہے۔ کتھارسس، یعنی دل کی بھڑاس نکالنا ہی علاج کا بہترین ذریعہ ہے اور مادی دنیا کی طرف کار آمد طور پر لوٹ جانا دماغی صحت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابوں پر مشتمل جدید سیکولر نظامِ تعلیم میں انسان کی روح کے متعلق مبلغ علم کی یہ کل کائنات ہے۔ اخلاقیات، معاشرت، انسانی رشتے، تہذیبی اقدار اور ذہنی سکون، یہ سب کے اس جدید سیکولر نظامِ تعلیم میں دو اور دو چار کی طرح معاشرے میں ہونے والی کاروباری، معاشی اور سیاسی ترقی یا تبدیلی کے ساتھ منسلک کر دیئے گئے ہیں۔ اسی لیے جدید تعلیمی نظام کا موضوع انسان نہیں بلکہ اس کا موضوع مادی ترقی اور دولت کا حصول ہے۔

جب سے یہ دنیا تخلیق ہوئی ہے، انسانی تاریخ نے تقریباً دو درجن کے قریب مختلف تہذیبیں دیکھی ہیں جو بامِ عروج پر پہنچیں۔ ان تمام تہذیبوں نے ترقی کے اعلیٰ ترین معیار قائم کئے اور ان کے نقوش آج بھی زمین کے سینے پر ثبت ہیں۔ مصر، چین، بابل، یونان ایران، سندھ اور دیگر تہذیبوں نے علم وفن میں جو ترقی حاصل کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان تمام تہذیبوں نے علم سیکھنے اور سکھانے کے لیے ادارے بھی قائم کئے۔ لیکن کسی بھی تہذیب کے تعلیمی اداروں کا بنیادی مقصد موجودہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کی طرح مادہ پرستی اور شکم وشہوت پرستی نہیں تھا۔ ہر تہذیب نے اپنے علمی اداروں میں اعلیٰ ترین اخلاقی معیارات سکھانے اور صرف اور صرف علم حاصل کرنے کے بلند ترین مقصد کو آگے رکھا۔ لیکن جدید سیکولر تعلیمی نظام کا اولین اور بنیادی مقصد روٹی کمانا ہے۔ علم، حقیقت اور کائنات کے رازوں سے آگاہی ہرگز نہیں۔ اسی لیئے موجودہ نظامِ تعلیم ڈگری یا سند کے حصول کے گرد گھومتا ہے اور ہر یونیورسٹی کی ڈگری یا سند کی مارکیٹ میں الگ الگ قیمت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ تصور کرتا ہے کہ پورا نظام علم کی اعلیٰ ترین اقدار اور اس کے حصول پر قائم ہے تو اس سے بڑا مذاق کوئی نہیں۔ اگر دنیا بھر کی حکومتیں یا کارپوریٹ سرمایہ دار یہ اعلان کر دیں کہ ہم یونیورسٹی سے حاصل ہونے والی ڈگریوں یا اسناد پر لوگوں کو ملازمت نہیں دیں گی تو صرف چند ماہ کے اندر یہ تمام تعلیمی ادارے ویران ہو جائیں اور علم کے حصول کے دھوکے میں آباد کی گئی یہ تمام بستیاں تباہ وبرباد ہو جائیں۔

یہ جدید سیکولر نظامِ تعلیم کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور کیوں ہماری ضرورت بنا دیا گیا ہے؟۔ اس تعلیم کو نوکری یا پیسہ کمانے کے ساتھ وابستہ کر کے ہمیں وہ تمام تہذیبی اور ثقافتی اقدار بھی پڑھائی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں ہم بچپن ہی سے مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ دس سال کی عمر تک بچہ اپنے دماغ کی دیوار پر ایک اجنبی ماحول کے نقوش بناتا ہے اور یہ نقوش دائمی ہوتے ہیں۔ اس نظامِ تعلیم میں پڑھنے والا بچہ سنڈریلا، سانتا کلاز، سنو وائٹ اور انگوروں کی فصل پکنے پر شراب کشید کرنے کے گیت اس کے دماغ پر نقش ہوتے ہیں۔ ابتدائی کلاسوں میں پڑھائی جانے والی تمام کتابوں میں جو ثقافت اور تہذیب ان کو ازبر کروائی جاتی ہے اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، چکی کی گھر گھر اور صحراؤں کی بانسری کی آواز سے کوئی رغبت نہیں رہتی بلکہ وہ ان سب کو ایک کمترین اور کمزور درجے کی تہذیب سمجھ کر مسترد کر دیتا ہے۔ اس پورے تعلیمی نظام کا بنیادی مقصد صرف اور صرف ایک "یک رخا" آدمی (Onedimensionalman) پیدا کرنا ہے جو خالصتاً مغربی کارپوریٹ تہذیب کا وفادار ہو۔ وہ اس کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی تنقید یا نقائص ڈھونڈنے کے لیے عقل استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کا دفاع کرتا ہے اور جذباتی طور پر کرتا ہے۔ جبکہ اپنی ساری منطق اور سارا علم دین کی تنقید اور اس میں نقائص ڈھونڈنے میں لگاتا ہے۔

یہ جدید سیکولر تعلیمی نظام جس تہذیب کا اسے غلام بناتا ہے وہ تین چیزوں کی مرکب ہے، سیکولرازم، سرمایہ داری اور جمہوریت۔ ان تینوں تصورات سے جس تہذیب نے جنم لیا ہے وہاں انسانی ترقی کا معیار علم یا سائنس نہیں بلکہ وہ کام، فن یا علم ہے جس سے سرمایہ حاصل کیا جا سکے۔ ایسی تمام محنت جس سے دولت حاصل نہیں ہوتی وہ اس تہذیب میں قابل عزت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں ایک عورت جو گھر میں چوبیس گھنٹے بچوں کو پالتی اور اس گھر کو اپنی محنت سے جنت کا نمونہ بناتی ہے اس کی کوئی عزت یا حقوق نہیں جبکہ بازار میں کھڑے ہو کر جسم بیچنے والی عورت کو عزت کے لفظ "سیکس ورکر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کی فلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اس جدید سیکولر تعلیمی نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی کام کرنے والے، سائنس دان یا دیگر فنون سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے شوق سے یہ کام کرنا چاہیں تو کریں ورنہ معاشرتی طور پر تو عزت اسی علم اور اسی ڈگری کی ہے جسے مارکیٹ میں بیچ کر سرمایہ حاصل کیا جا سکے۔ اس جدید مغربی تہذیب کا کمال یہ ہے کہ سرمایہ اور عزت کمانے کے لیے بعض اوقات نہیں بلکہ اکثر اوقات آپ کو علم، ڈگری اور سند کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس معاشرے میں فٹ بال کا کوچ برکلے یا کسی بھی بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے سوگنا زیادہ کماتا ہے۔ سٹے بازی سے زیادہ سرمایہ کہیں نہیں ہے۔ عریانی وفحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ کما لیتی ہے دنیا کی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی بھی نہیں کما سکتی۔ آج کے دور کی مغربی سیکولر تہذیب کے سب سے بڑے مفکر جان رالز نے اپنی کتاب (Theory of justice) میں اس تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے اور اسے جدید مغربی تہذیب پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے وہ لکھتا ہے کہ انسان کی زندگی کے صرف چار مقاصد ہیں "آمدنی، دولت، قوت اور اقتدار" یہی چار مقاصد ہیں جو جدید سیکولر نظامِ تعلیم کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں راسخ کرائے جاتے ہیں۔ اسی لیئے اقبال نے کہا تھا۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

KitaabPoint.blogspot.com

جہالت کی فصیل میں قید دانشور

لاحاصل بحث میں الجھنا میرا شیوہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس ضمن میں واضح ہدایت دے رکھی ہے کہ جب جاہل تم سے مخاطب ہوں تو انہیں دور ہی سے سلام کر دیا کرو۔ لیکن میڈیا ایسا گورکھ دھندا ہے کہ اگر اس میں جہالت کی بنیاد پر مرتب کی گئی فرد جرم کا جواب نہ دیا جائے تو حق اور علم کی آواز صحراؤں میں گم ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک فرد جرم مجھ پر عین عید کے دن برطانیہ میں مقیم لاہور کے مشہور لبرل اور سیکولر شخص ڈاکٹر حیدر شاہ نے ایک انگریزی اخبار میں عائد کی۔ یہ 16 اکتوبر 2012ء کو چھپنے والے میرے مضمون ''عصرِ رواں کے ابوجہل'' کے حوالے سے تھی۔ انہوں نے یہ فرد جرم مرتب کرنے کے سلسلے میں تحقیق کرنے پر اپنے معاونین ندیم احمد اور احمد وقاص کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر کی تعلیمی حالت کے بارے میں ول ڈیورانٹ کا جو حوالہ دیا' وہ دراصل ہندوؤں کے بارے میں تھا۔ میں انہی کے مضمون میں دیئے گئے ول ڈیورانٹ کے فقرے کا متعلقہ حصہ لکھ رہا ہوں۔ (In Bengal alone, before the coming of the British, there were 80,000 native schools) ''صرف بنگال میں انگریزوں کے آنے سے قبل 80 ہزار مقامی سکول تھے'' جناب شاہ صاحب اگر تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں تو انہیں پتہ چلے گا کہ انگریز کے آنے سے چھ سو سال پہلے بنگال میں ہندوؤں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے سراج الدولہ سے لڑ کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ ول ڈیورانٹ نے یہ بھی لکھا کہ ان مدرسوں کو سرکاری خزانے سے چلایا جاتا تھا۔ کیا سراج الدولہ ایک ''ہندو'' تھا جو مدرسے چلاتا تھا؟ میرے کالم کا موضوع برصغیر میں تعلیمی نظام کی تاریخ بیان کرنا نہیں تھا کہ میں ٹیکسلا میں بدھ یونیورسٹی یا پاٹلی پترا میں اشوک کی تعلیمی اصلاحات کا ذکر کرتا۔ میں نے صرف ول ڈیورانٹ کا ہی نہیں میجر ایم ڈی باسو اور میکس مولر کا بھی حوالہ دیا تھا۔ دونوں وہی بات کرتے ہیں جو ول ڈیورانٹ نے کی۔ شاہ صاحب الیگزینڈر ہملٹن کا سفرنامہ بھی پڑھ لیں جو انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کے ہندوستان کے بارے میں لکھا۔ اس نے لکھا: اس دور میں ٹھٹھہ شہر میں علوم وفنون سکھانے کے چار سو کالج تھے۔ ڈاکٹر حیدر شاہ نے اپنے مضمون میں ول ڈیورانٹ کے حوالے سے مسلمان فاتحین کے ظلم اور جنگ وجدل کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر اس کی ایک بات مانتے ہو تو پھر اس کی باقی باتیں بھی مانو اور لکھو۔ میں ول ڈیورانٹ کی ایک بھی بات نہ مانتا اگر اس کی تصدیق باقی لوگ نہ کر رہے ہوتے۔ اسی لئے میں نے ایک کی بجائے کئی حوالے دیئے۔ میں نے مسلمان مورخین کے حوالے نہیں دیئے ورنہ مقریزی کی کتاب 'الخطط' جو محمد تغلق کے زمانے کے بارے میں ہے' میں لکھا ہے کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے۔ آپ ان ساری تاریخوں کو جھوٹ کہہ لیں لیکن 1911ء میں مردم شماری تو انگریزوں نے کروائی تھی۔ میں آج کل سیکرٹری آرکائیوز کے عہدے پر ہوں جہاں یہ تمام رپورٹیں موجود ہیں۔ اس مردم شماری کے مطابق برصغیر کے علاقوں میں شرح خواندگی 90 فیصد کے قریب تھی۔ 1941ء کی مردم شماری میں شرح خواندگی 15 فیصد سے زیادہ کہیں نظر نہیں آتی جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انگریز نے برصغیر میں تعلیم کا کس قدر بیڑا غرق کیا۔ مجھے مسلمانوں حکمرانوں کے قتل عام کی وکالت کرنے کا کوئی شوق نہیں' نہ ہی میں اشوک کی وکالت کرتا ہوں جو سو بھائیوں کو قتل کر کے حکمران بنا تھا اور جس نے صرف کلنگہ کی جنگ میں دس لاکھ انسانوں کو قتل کر دیا تھا اور جو ول ڈیورانٹ کا پسندیدہ شخص ہے۔ میں اشوک کے انصاف، امن عامہ اور تعلیم کے اقدامات کا مداح ہوں، لیکن یہ سب کچھ اس نے اس وقت کیا جب وہ ذات پات کے غلیظ نظام سے متنفر ہو کر ہندومت کو چھوڑ کر بدھ ہو گیا تھا۔ لیکن شاہ صاحب نے ول ڈیورانٹ کے حوالے سے اشوک کو ہندو ہی کہا ہے۔ اسی تعصب میں اس نے بنگال میں انگریزوں کی آمد سے قبل مدرسوں کو ہندو مدرسوں کا نام دیا ہے۔ حضور! تاریخ حوالے تلاش کرنے کا نہیں وسیع مطالعے کا نام ہے۔

دوسری فرد جرم: میں نے تحریر کیا ہے کہ 1781ء میں پہلا جداگانہ دینی مدرسہ لارڈ کارنوالس نے کلکتہ میں قائم کیا، جبکہ وہ اس وقت امریکہ میں جنگ پر مامور تھا۔ یہاں میں اپنی ایک غلطی تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مدرسہ کارنوالس سے پہلے والے وائسرائے وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا۔ صرف نام کی غلطی کی بنیاد پر شاہ صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جیسے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس مدرسے' جسے کلکتہ مدرسہ کا نام دیا جاتا ہے' کا ذکر آپ کو تھامس میٹکاف اور باربرا میٹکاف کی کتاب A Concise history of modem India میں مل جائے گا۔ ہیسٹنگز نے 1782ء میں اس مدرسے کے لئے لندن کا باقاعدہ فنڈ منظور کروایا تھا۔ اس نے پہلی دفعہ اسی مدرسہ میں درس نظامی کا نصاب صرف مسلمانوں کو پڑھانا شروع کیا اور اس نصاب کو برطانوی طرز تعلیم کی طرح کلاس روم، امتحان اور نتائج وغیرہ کے طرز پر ترتیب دیا۔ درس نظامی کا یہی طریقہ تعلیم آج تک ہمارے دینی مدرسوں میں رائج ہے۔ کلکتہ مدرسے کے پہلے سربراہ مولانا ماجد الدین تھے۔ انہیں یہ فخر حاصل تھا کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ سے براہ راست تعلیم حاصل کی۔ انگریز نے اس ادارے کو دینی مدرسے کا تشخص دیا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب The Indian Muslims میں لکھا کہ برطانیہ کے عیسائی پادریوں نے اس مدرسے پر اعتراض کیا تھا۔ شاید انہیں پس پردہ مقاصد کا علم نہیں تھا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کر کے برصغیر میں دین اور دنیا کی تعلیم کو علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ اس مدرسے سے پہلے برصغیر میں جتنے بھی تعلیمی ادارے تھے' وہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں مروج دنیاوی تعلیم بھی اعلیٰ سطح تک دیتے تھے۔ انہی مدرسوں سے لوگ امور مملکت کے لیے منتخب کئے جاتے تھے۔ انگریز نے یہ ظلم صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیا بلکہ ہندو مسلم تقسیم کو ہوا دینے کے لئے 1791ء میں بنارس سنسکرت کالج قائم کیا جس میں پہلی بار ہندوؤں کو ہندو قانون اور طرز زندگی کی تعلیم دی جانے لگی۔ ہندوستان میں 1206ء میں قطب الدین ایبک نے اسلامی تعزیرات نافذ کی تھیں۔ مسلمان قاضی فیصلے کرتے تھے اس لئے کہ قتل، چوری، ڈاکہ، زنا ہندو یا مسلمان نہیں ہوتے بلکہ یہ جرم ہیں اور اسلام میں ان کی سزا اللہ نے انسانی فطرت کے مطابق مقرر کی ہے۔ اس پورے دور میں امن وامان یا انصاف کا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ تعلیم میں ہندو مسلم کی تقسیم نہیں تھی۔ روبنسن اپنی کتاب فرنگی محل میں لکھتا ہے کہ فارسی زبان میں لکھنے والے ادیبوں میں ہندو مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھے۔ جب ہندوستان میں دونوں مذاہب کی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ بیج بو دیا گیا تو پھر 1813 Charter act آیا جس کے تحت ہندوستان میں عیسائی مشنری سکول کھولنے کی اجازت دی گئی جنہیں حکومت خود اپنے خرچ سے چلانے لگی۔ یہ وہ سکول تھے جو مسلمانوں کے پرانے مدرسوں کی طرز پر تھے یعنی تھوڑی بہت دینی اور باقی دنیاوی تعلیم۔ تمام ملازمتوں کے لئے انگریزی لازمی قرار دے دی گئی۔ برصغیر کا صدیوں پرانا نظام تعلیم تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس المیے کا رونا دنیا کے ہر آزاد مورخ نے رویا۔ تب برصغیر میں دینی اور دنیاوی تعلیم کا جو فرق آیا آج تک ختم نہ ہو سکا۔ ہر کوئی اپنی اپنی سرحدوں میں قید ہے' کسی دوسرے کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جو دین پڑھنے جاتے ہیں وہ دنیا سے ناآشنا اور جو دنیا پڑھنے جاتے ہیں وہ دین کی الف بے سے دور۔ جب کوئی جہالت کی بنیاد پر استوار فصیل میں' جسے وہ علم سمجھتے ہیں، خالص علم کے ہتھیار سے شگاف ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر کوئی سیکولر ہو' لبرل ہو یا کسی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ، اس کا غصہ طالبان کی طرح کا ہوتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

عالمی سطح پر رائج جمہوری نظام اور عوام کی حکمرانی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا مدتوں اس دنیا پر حکمران بادشاہوں اور عوام میں ان کی پذیرائی اور قبولیت میں فرق ہوتا تھا۔ بڑے بڑے فاتحین خواہ وہ سکندر ہو یا چنگیز خان' اپنے گھروں سے بڑی بڑی افواج لے کر نہیں نکلا کرتے تھے۔ آج سے دو سو سال پہلے تک جن پانچ ممالک نے پوری دنیا کو اپنی نو آبادی میں تبدیل کیا ان کا حجم اور افرادی قوت دیکھیں تو ہنسی آتی ہے کہ یہ اتنے مختصر سے ملک اتنے بڑے بڑے علاقوں پر کیسے قابض ہو گئے۔ برطانیہ' فرانس' سپین' ہالینڈ اور پرتگال جن کی کل آبادی ملا کر بھی اس دور کے ہندوستان سے کم تھی، لیکن امریکہ سے لے کر آسٹریلیا تک ہر خطہ ان کے زیر تسلط تھا۔ ان طاقتوں نے بھی علاقے فتح کرنے کا گر قدیم فاتحین سے سیکھا تھا۔ پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کرو کہ کس علاقے کی رعایا اپنے حکمران سے ناراض اور غیر مطمئن ہے' پھر اس رعایا میں اپنے ایسے حمایتی ڈھونڈو جو اقتدار کی خواہش رکھتے ہوں لیکن حکمرانوں کی طاقت کے سامنے ان کا بس نہ چلتا ہو اور ان کے ذہن میں کسی بیرونی طاقت کی مدد سے سازش کے ذریعے اپنے علاقے پر حکمرانی کرنے کی خواہش مچل رہی ہو۔ جب یہ دونوں عوامل جمع ہو جاتے تو حملہ کرنے کا اذن مل جاتا، اور چند دنوں میں وہ علاقہ' شہر یا ریاست فتح کر لی جاتی۔ ابن علقمی اگر عباسی خلفاء کا وزیر نہ ہوتا اور اس حیثیت میں بھی خلیفہ کے خلاف سازشوں میں مصروف نہ ہوتا تو ہلاکو کسی دوسری جانب اپنی فوجوں کا رخ موڑ دیتا۔ سکندر کو راجہ امبی کی صورت میں استقبال کرنے والا نہ ملتا تو وہ شاید وہیں سے پلٹ جاتا۔ اسی طرح میر جعفر اور میر صادق جیسے کردار میسر نہ آتے تو نہ جنگ پلاسی کی جرأت ہوتی اور نہ ہی میسور کے سرنگا پٹم پر حملے کا تصور۔ ان تمام فاتحین اور عظیم بادشاہوں کا ایک طریقہ کار تھا۔ جہاں کوئی ہمدرد یا تعاون کرنے والا مل جاتا اس سے مدد حاصل کرتے' وہ لڑنے کے لئے افراد بھی فراہم کرتا' مالی امداد بھی کرتا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی۔ یوں فوج میں اضافہ ہوتا تو اگلا علاقہ فتح کر کے سلطنت کو وسیع کرتے جاتے۔ وہیں سے لوگوں کو اپنی فوج کے لئے بھرتی کیا جاتا اور مزید علاقے فتح کئے جاتے۔ 1848ء میں جب پنجاب میں سکھوں کی حکومت کے خلاف انگریز نے لڑائی شروع کی تو اس میں برطانیہ سے آئے فوجی نہیں بلکہ بنگال اور مدراس رجمنٹ کے چھوٹے چھوٹے قد کے سپاہی ان گبھرو جوانوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ کوئی اس دور میں سکھوں کی آپس کی چپقلش کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لے کہ کیسے ایک غیر مطمئن رعایا نے اپنی ہی فوج کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسی طرح پنجاب فتح ہونے کے صرف آٹھ سال بعد 1857ء کا معرکۂ آزادی ہوا تو وہ پنجاب جسے ایک غیر ملکی طاقت نے فتح کیا تھا وہیں سے جوق در جوق لشکر انگریزوں کی مدد اور نصرت کے لئے گئے تھے اور لال قلعہ دہلی کو فتح کر کے واپس لوٹے تھے۔ جنگوں میں ساتھ دینے والے راجوں' مہاراجوں' سرداروں' وڈیروں کے لئے انعام واکرام اور نوازشات کے بھی درجات ہوتے تھے۔ کسی کو اقتدار میں شریک کر کے اس علاقے کا حکمران' وزیر یا پھر مرکزی سطح پر اپنا معتمد خاص مقرر کر دیا جاتا تھا۔ کچھ کو جائیدادیں عطا کی جاتی تھیں اور بہت سوں کو شاہی دربار کی سند اور قبولیت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ بادشاہت کرنے کے گروں میں دو گر سب سے زیادہ اہم سمجھے گئے ہیں اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جس حکمران نے یہ دو گُر آزمائے اس کے اقتدار کو طوالت ملتی گئی۔ ایک یہ کہ رعایا خوشحال ہو اور ان کے درمیان انصاف کیا جائے۔ مطمئن اور پرسکون رعایا دنیا کے ہر حکمران کی سب سے مضبوط دفاعی لائن سمجھی جاتی تھی۔ دوسرا گر طرز حکمرانی کا شاطرانہ استعمال ہے۔ اس کی مثال سپارٹا کے حکمران نے یوں سمجھائی جس کے پاس دیگر ریاستوں کے لوگ اپنے بچوں کو حکمرانی کے گر سکھانے بھیجتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے ان کو ایک مکئی کے کھیت میں سے گزارتا جہاں تمام پودے تقریباً ایک سائز ہوتے، لیکن جو چند ایک سر اٹھاتے ہوتے انہیں تلوار سے کاٹ کر برابر کر دیتا۔ جس حکمران کو اپنی رعایا میں اقتدار کے خواہش مند، سر اٹھاتے لوگوں کا علم نہ ہوتا، اس کا زوال یقینی تھا۔

انسانی شعور اپنی منزلیں طے کرتا ہے تو لوگوں پر حکمرانی کی خواہش رکھنے والے بھی نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ پہلے بادشاہ لوگوں کو خوشحال اور مطمئن رکھتے تھے اور وہ ہر دلعزیز حکمران کہلاتے تھے۔ ان کا عتاب صرف چند لوگوں تک محدود ہوتا، جس کی ایک پرسکون رعایا پروا بھی نہ کرتی۔ لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہو تا جا رہا تھا۔ اقتدار میں شرکت کے خواہش مند بڑھتے جا رہے تھے۔ خواہشوں کا طوفان ہر سینے میں امڈ تا تھا۔ عام سپاہی کے بادشاہ بننے یا عام سے شخص کے اپنی بصیرت کے بل بوتے پر وزیر بن جانے کی کہانیوں اور عوام کی حکمرانی کی خواب انگیز داستانوں نے حکمرانوں کے خلاف ہجوم کی صورت میں باہر نکلنے کا رواج ڈالا۔ فرانس کے ورسائی محل کی کھڑکی سے باہر نکل کر جب بادشاہ نے 1774ء میں جھانکا تو حیرت میں گم ہو گیا کہ اتنی مخلوق یہاں کیسے جمع ہو گئی۔ یہ شہر تو بہت چھوٹا سا ہے۔ بادشاہوں کے سر کٹنے لگے تو وہ قوتیں جو صدیوں سے اقتدار پر قابض تھیں انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ یہ سب اپنے اپنے علاقوں کے جاگیردار، وڈیرے، تاجر، قبائلی سردار تھے۔ ان کی طاقت اپنے علاقوں میں مستحکم تھی لیکن اگر بہت سے علاقوں کے پسے ہوئے عوام مل جاتے تو پھر ان کی طاقت کا چراغ گل ہو جاتا۔ اب "ہر دلعزیز" حکمرانی کا ایک نسخہ ایجاد کیا گیا۔ یہ نسخہ تھا جمہوریت۔ بس چند دن کے لیے سہی مگر عوام کو حکمرانی میں شریک کیا جائے۔ وہ دن جب وہ اپنی رائے کا اظہار یا ووٹ دینے آتے ہیں۔ اسے ایک سیاسی عمل کا نام دیا گیا۔ سب سے پہلے عوام کو تقسیم کرنے کیلئے سیاسی پارٹیوں کا نظام وضع کیا گیا۔ پہلے ایک بادشاہ کو افرادی قوت اور سرمائے سے مدد فراہم کی جاتی تھی، اب پارٹی فنڈنگ کا راستہ نکالا اور افرادی قوت کی جگہ پارٹی ورکرز نے لے لی۔ پارٹیوں کو سرمائے کے ذریعے اپنے مقاصد کے لیے خریدنا آسان تھا، اسی لیے غیر جماعتی طریق انتخاب کو گالی بنا دیا گیا۔ یہاں تک کہ یک جماعتی نظام کو بھی آمریت کا روپ قرار دیا گیا۔ امریکہ سے لے کر آسٹریلیا تک کوئی پارٹی ایسی نہیں جسے اربوں ڈالر میسر نہ ہوں اور وہ الیکشن جیت جائے۔ اس کے بعد نسخہ وہی جو بادشاہوں کا تھا کہ عوام کو خوشحال اور مطمئن رکھا جائے تو اقتدار قائم۔ اس کے لیے اپنی لوٹ مار سے ایک تھوڑا سا حصہ عوام پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس نے دنیا میں پچاس ایسے افراد کو جنم دیا ہے جن کے پاس دنیا کی ساٹھ فیصد کے قریب دولت ہے۔ اب اہرام مصر، تاج محل اور سونے کے منقش محل نہیں بنتے بلکہ کاروباری سلطنتیں وجود میں آتی ہیں۔ انہی کاروباری سلطنتوں کی ہوس افریقہ کو پسماندہ، غلام اور قتل و غارت کا گڑھ بنائے ہوئے ہے اور اسی کا نشہ جمہوری حکمرانوں کو ویت نام، عراق اور افغانستان میں لاکھوں لوگوں کو قتل کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ کوئی حکمرانی میں "نام نہاد شریک عوام" سے نہیں پوچھتا کہ ہم تمہارے بچوں کو قتل گاہوں میں بھیج رہے ہیں۔ ان ہزاروں مقتولین کی یادگاریں بنائی جا رہی ہیں، انہیں وطن و قوم کا محسن قرار دیا جا رہا ہے، کسی کو اندازہ تک نہیں ہوتا کہ جنگ عظیم اول سے لے کر آج تک کروڑوں لوگ اسی جمہوریت اور آزادی کے نام پر قتل کیے گئے لیکن صرف اسلحہ ساز فیکٹریوں کے منافع میں اضافہ ہوا۔ جنہوں نے مزید پارٹی فنڈنگ سے اپنے لیے سیاسی رہنما اور جمہوری حکمران خرید لیے اور پھر ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے پارلیمنٹ اور کانگریس جیسے اداروں کو عوام کا نمائندہ کہہ کر ہر وہ کام کیا جس کا تعلق صرف اور صرف اس کارپوریٹ دنیا کے تحفظ کا تھا۔ لیکن یہ اپنی دولت کا مختصر سا حصہ عوام میں بانٹ کر انہیں مطمئن اور خوشحال رکھتے کہ کل کوئی جم غفیر فرانس کے شاہی محل کی طرح ان کے اس فراڈ نظام کی دھجیاں نہ بکھیر دے۔

دنیا میں بادشاہت ہو یا جمہوریت، نظام الٹنے، تہس نہس کرنے کے لیے صرف ایک ہی لازم شرط ہے۔ عوام کا غیر مطمئن، پریشان اور بدحال ہونا۔ رحم دل بادشاہ اور ظالم ترین جمہوری حکمران بھی اس شرط کو ضرور ذہن میں رکھتے اور اپنے اقتدار کو طول دیتے تھے۔ دنیا بھر کے میں بادشاہ ہوں یا جمہوری حکمران، جہاں کہیں تخت الٹے گئے یا تاج اچھالے گئے، وہاں ایسا کام مٹھی بھر بپھرے ہوئے ہجوم نے کیا۔ لیکن ان کا یہ غصہ اور انتقام، کروڑوں غیر مطمئن، پریشان اور بدحال عوام کے دل کی آواز بن چکا ہوتا ہے۔ ایسے میں حکمرانوں کی آوازیں، سسٹم تباہ ہو جائے گا، ترقی کا پہیہ رک جائے گا، دوسرے حکمران ملوث ہیں ہم نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا، سب صدا بصحرا ہو جاتی ہیں۔ لٹے پٹے، مفلوک الحال، پریشان اور غیر مطمئن لوگوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کس کا محل مسمار ہوتا ہے اور کس کا اقتدار رخصت۔ انہیں تو اپنی بدحالی کے موسم میں کسی اور کی خوشحالی اچھی نہیں لگ رہی ہوتی۔

KitaabPoint.blogspot.com

جمہوری نظام کی جبری مشقت

گزشتہ دوسو سالوں سے پوری دنیا میں جس طرز معاشرت کا غلبہ ہے اس کا جنم علم کی ایک مخصوص قسم کی کوکھ سے ہوا ہے جسے سوشل سائنسز کہتے ہیں۔ اپنے آغاز میں علم انسانی تہذیب اور معاشرت کی تاریخ مرتب کرنے تک محدود تھا۔ یہ تاریخ عموماً واقعاتی ہوتی لیکن جب اس کے ساتھ ایک دوسرے علم کا تڑکا لگا تو اس میں سے اتنی شاخیں پھوٹیں کہ گننا مشکل ہوگیا۔ یہ دوسرا علم تھا فلسفہ۔ فلسفہ جس کے پانچ بنیادی سوال' میں کون سے شروع ہوکر یہ کائنات کیا' کیسے' کیوں کب اور کدھر جارہی ہے نے تاریخ کے واقعات کی توجیہات کرنا شروع کیں تو فلسفہ تاریخ نے انسانی تجربات کے عوامل' نتائج اور ان کے خدوخال سے پولیٹیکل سائنس' سوشیالوجی' سائکالوجی انتھروپالوجی اور ایسی کئی سوشل سائنسوں نے جنم دیا۔ ان سب کا بنیادی تصور یہ تھا کہ جس طرح انسان مادی طور پر ارتقاء کی منازل سے گزر رہا ہے' پہاڑوں کی غاروں سے بلند و بالا عمارتوں تک آ پہنچا ہے اسی طرح اس کی اخلاقیات' طرز حکومت اور تصور عبادت بھی ارتقاء کر رہا ہے اور یہ سب کچھ انسان نے حالات سے سیکھ سیکھ کر بہتر بنایا ہے۔ انسان سے بالاتر کوئی ہستی ایسی نہیں جس نے اسے مذہب' اخلاق' خاندانی و معاشرتی زندگی کے اصول بتائے ہوں۔ اللہ' بھگوان' یزدان اور دیگر تصورات سب انسانی ذہن کی تخلیق ہیں۔ ہر معاشرے نے اپنی ضروریات کے مطابق اپنا خدا تخلیق کیا اور اپنے ہی مرتب کیے ہوئے اصولوں کو مذہب کا نام دے کر الہامی بناتے ہوئے معاشرے پر نافذ کر دیا ہے۔ ہزاروں سالہ انسانی تاریخ کی ان توجیہات کی بنیاد پر ان علوم کی کوکھ سے سیکولرزم نے جنم لیا اور پھر اس کے بیج سے جس تناور معاشرتی درخت نے اپنی شاخیں پھیلائیں اسے جدید مغربی تہذیب (ModernWesteranCivilization) کہتے ہیں۔ اس تہذیب کی بنیادی علامتوں میں جدید سیکولر قومی جمہوری ریاستوں کا قیام' سیکولر اخلاقیات کا پھیلاؤ' حقوق نسواں کی تحریکیں اور ''انسان عظیم ہے خدایا'' کا فلک شگاف نعرہ شامل ہے۔ اس تہذیب نے جس سرمائے سے ترقی کی وہ بینکاری نظام کا سود اور کاغذ کے نوٹ کا مصنوعی تصور زر ہے۔ اس مصنوعی دولت کے انباروں نے دنیا بھر کے وسائل اس جدید مغربی تہذیب کے قبضے میں دے دیئے۔ 1694ء میں بنک آف انگلینڈ نے پہلا کاغذ کا نوٹ چھاپا اور پھر سو سال تک انگلینڈ نے صرف اپنی بحری عسکری طاقت میں اضافہ کیا اور اس کے بعد دنیا پر چڑھ دوڑی۔ انہوں نے شروع میں کسی سائنسی ترقی کی طرف توجہ نہ دی بلکہ صرف اور صرف فوجی قوت کو مضبوط بنایا۔ اس کے بعد کے اگلے سو سال اسی مصنوعی کاغذی دولت اور اس سے پیدا کی گئی عسکری طاقت نے دنیا بھر کے وسائل پر قبضہ کر لیا۔ چند لاکھ ڈالروں کی لاگت سے بہترین سیاہی اور کاغذ پر اربوں ڈالر چھاپے جاتے ہیں اور ان سے بزور مسلمان ملکوں کا تیل خرید لیا جاتا ہے۔ آج اگر تیل پاکستانی روپے میں فروخت ہونا شروع ہو جائے تو ایک روپے میں سو ڈالر بکنے لگیں۔ (اسی مصنوعی کاغذی دولت سے دنیا کی پینتالیس ہزار کارپوریشنیں چلتی ہیں جن کو پانچ سو بنیادی (CORE کارپوریشنیں کنٹرول کرتی ہیں اور ان کو صرف بیس بنک سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ ریاستوں سے بھی طاقتور اس سودی نظام نے اپنے تحفظ کیلئے ایک سیاسی نظام بھی وضع کیا۔ جسے سیکولر جمہوریت کہتے ہیں۔ اس نظام کو ترتیب دینے' اس کی نوک پلک سنوارنے کے لئے ان سوشل سائنسز کے علم نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ جمہوری نظام کی اساس اس بنیادی نکتے پر رکھی گئی کہ طاقت اور قوت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ وہی اس زمین کے مالک اور بادشاہ ہیں' انہیں کا کام ہے کہ قانون مرتب کریں اور اپنی سماجی زندگی کی اخلاقیات طے کریں۔ یوں اس بنیادی تصور نے سب سے پہلے جس تصور کا خاتمہ کیا وہ انسان سے بالاتر کسی ہستی کی بادشاہت کا تھا۔ ''الملک'' یعنی حقیقی حکمران جو اللہ کی صفت تھی اب عوام کی عطا کر دی گئی۔ لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنے کے بعد اگلا سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو کنٹرول کیسے کریں' یہ تو ہر ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہاں سے منتخب نمائندوں کا تصور پیدا ہوا' پارلیمنٹ' کانگریس' اسمبلی جیسے ادارے وجود میں آئے۔ لوگوں کو یہ خوبصورت خواب دکھایا گیا کہ تم جو ووٹ دیتے ہو اس کے ذریعے یہ لوگ ان اداروں میں جاتے ہیں اور وہاں اپنے لیے صدر یا وزیراعظم منتخب کرتے ہیں' ان سب کو اصل میں تم منتخب کرتے ہو' یہ سب کچھ تمہارے ووٹوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اصل میں تم حاکم ہو' کوئی رکن اسمبلی' صدر یا وزیراعظم حاکم نہیں۔ عوام کو اس خواب کی لذت میں گم کرنے کے بعد کس قدر آسان تھا کہ ان دو سو یا تین سو اراکین پارلیمنٹ یا کانگریس کو کنٹرول کر لیا جائے تو پھر نظام سیاست و حکومت مٹھی میں آ جائے گا۔

اس نظام سیاست و حکومت کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک بہترین طریقہ نکالا گیا۔ سیاسی پارٹیاں' پارٹی پالیٹکس۔ دنیا میں کوئی جمہوری نظام ایسا نہیں جو سیاسی پارٹیوں کے بغیر چلتا ہو۔ یہ تمام سیاسی پارٹیاں جو دنیا کے ہر ملک میں پائی جاتی ہیں اپنے آپ کو نظریاتی پارٹیاں کہتی ہیں۔ لیکن امریکہ' برطانیہ اور بھارت سے لے کر پاکستان جیسے کسی بھی ملک کی سیاسی پارٹیوں کے منشور اٹھا لیں' سوائے چند ایک شقوں کے ان میں کوئی زیادہ اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ یہ نظریاتی گروہ نہیں ہیں بلکہ سیاسی لیڈروں کے جتھے ہیں جنہیں ایک جگہ اس لیے جمع کیا جاتا ہے کہ انہیں براہ راست یک مشت سرمایہ فراہم کیا جاسکے۔ یہی سرمایہ ہے سیاسی پارٹیوں کے الیکشن' کنونشن' ہڑتالوں' دھرنوں اور جلسوں پر خرچ ہوتا ہے۔ پارٹی لیڈروں کی آمدورفت سے لے کر پارٹی دفاتر کے اخراجات سب اسی سے ادا ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ کا سب سے زیادہ سرمایہ امریکی سینٹ کے گزشتہ مڈٹرم الیکشن پر صرف کیا گیا۔ اس کا تخمینہ تقریباً 5 ارب ڈالر تھا۔ گزشتہ امریکی صدارتی الیکشن میں Duke انرجی' AT&T اور بنک آف امریکہ نے ریپبلکن اور ڈیموکریٹ دونوں پارٹیوں کے کنونشنوں کے لئے 6 کروڑ ڈالر فی پارٹی فراہم کیے۔ دنیا کی ہر سیکولر جمہوریت میں سیاسی پارٹیاں اسی طرح سرمایہ حاصل کرتی ہیں اور حکومت میں آکر سرمایہ فراہم کرنے والے گروہوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں۔ یوں سرمایے سے پوری کی پوری پارٹی مکمل طور پر خرید لی جاتی ہے۔ اسی لیے اگر آپ آج نان پارٹی الیکشن کی بات کریں تو ہر کوئی سانپ کی طرح پھنکارتا ہے کہ یہ آمریت کی طرف ایک قدم ہے۔ لیکن پارٹی آمریت کو دنیا بھر میں پارٹی وفاداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس جمہوری نظام میں سب سے برا شخص وہ سمجھا جاتا ہے جو پارٹیاں بدلتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے اس کا کوئی دین ایمان نہیں۔ اس لئے کہ اس نظام میں پارٹی اراکین کے ''دین ایمان'' کو ایک ساتھ فنڈز فراہم کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ ان سب کی حیثیت بھٹے پر کام کرنے والے ان مزدوروں کی طرح ہے جن سے جبری مشقت لی جاتی ہے۔ بھٹے کا مالک ایک کاغذ پر لکھی تحریر کے بدلے ان کے خاندان کے تمام افراد کو خرید لیتا ہے۔ ان کی ذاتی' سیاسی اور معاشرتی زندگی سب اس کے قابو میں ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ اپنے تمام اراکین کا بلا شرکت غیرے مالک بن جاتا ہے۔ کوئی رکن اس کی سوچ کے خلاف کوئی بات تو کہہ کر دیکھے' اس کے مخالف کی شادی بیاہ میں شریک ہو کر دکھائے' اس کی اولاد اور گھرانے کی تعریف نہ کرے' پھر دیکھو۔ یہ سب کے سب اراکین چابی سے چلنے والے ان کھلونوں کی طرح بنا دیئے جاتے ہیں کہ جس میں جتنی چابی بھرو گے وہ اتنا ہی بولے گا ورنہ لاکھ سوال کرو چپ سادھ لے گا۔ اسی لئے دنیا بھر میں پارٹی چھوڑنے کی سزا سب سے المناک ہے۔ جمہوری نظام کی اس منڈی میں سودے اجتماعی ہوتے ہیں۔ پورے ریوڑ کی بولی لگتی ہے۔ گستاخ بھیڑوں کی کیا مجال کہ اپنی بولی خود لگائیں۔ جنہیں گلی محلوں' علاقوں اور قصبوں میں الیکشن کے دوران ووٹ خریدتے ہوئے شرم دامن گیر نہیں ہوتی' انہیں ایسا ووٹ سینٹ کے الیکشن میں بیچتے کیوں شرم آئے گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

جمہوریت یا شورائیت

دنیا کے تمام ملکوں کے جمہوری نظام صرف اور صرف ایک چیز پر قائم ہیں اور وہ ہے رائے یعنی ووٹ۔ اس نظام کی بنیادی اکائی ایک ووٹر یعنی رائے دینے والا ہے۔ تصور یہ عام کیا گیا ہے کہ اسی کے ووٹ سے حکومت کا نظام کار چلتا ہے۔ برسرِاقتدار آنے والا طبقہ جو اچھائی اور برائی کرے گا اس کا خمیازہ اس ووٹ دینے والے کو ہی بھگتنا ہوگا اور یہ سب کچھ اس لئے خاموشی سے برداشت کرنا ہوگا کہ اسی نے تو رائے یا ووٹ دے کر ان لوگوں کو اقتدار کی کرسی پر بٹھایا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اسلام کا بھی تمام سیاسی اور معاشرتی نظام صرف اور صرف رائے پر قائم ہے۔ پھر دونوں میں فرق کیا ہے۔ کیسے کیسے عظیم سکالرز مدتوں اس بات پر اپنے علم اور دلیل کی محنت صرف کرتے رہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے کہ شورائیت کا جو تصور اسلام نے دیا ہے' اصل میں وہی جمہوریت ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان دونوں کے فرق پر بات کریں ہم رائے کے بارے میں انسانوں کے عمومی مزاج اور احتیاط کو دیکھتے ہیں۔ دنیا میں انسان کسی بھی جگہ یا علاقے میں بستے ہوں انہیں کسی بھی معاملے میں مشورہ یا رائے درکار ہو تو وہ کسی ایسے شخص کی تلاش کرنے نکلتے ہیں جو اس معاملے کی تھوڑی بہت شدھ بدھ ضرور رکھتا ہو' اور اگر کوئی اس کا ماہر مل جائے تو پھر اس کی رائے کو اور اہمیت دی جاتی ہے۔ بیٹی یا بیٹے کی شادی کرنے سے لے کر مکان بنانے' کاروبار شروع کرنے' کنواں کھودنے' سکول بنانے' حتیٰ کہ زندگی کا کوئی بھی کام کرنا ہو' اس کے آغاز میں جو رائے لی جاتی ہے' جو مشورہ طلب کیا جاتا ہے وہ کسی طور پر بھی رائج جمہوری طریق کار کی ووٹنگ سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ اگر جمہوری طریقے سے رائے طلب کرنا ہی بہترین طرز زندگی ہوتا اور اکثریت کی رائے ہی برحق اور صحیح ہوتی تو انسان یقیناً ایسے ہی فیصلے کرتا۔ پورے خاندان میں بچوں کی شادی کے لئے ریفرنڈم کراتا' فیکٹری کا مالک تمام مزدوروں کو جمع کرتا اور فیکٹری کی توسیع کے لئے ووٹ مانگتا اور ان کی رائے پر عمل کرتا۔ یوں دنیا کے ہر کاروبار میں یہی اصول کارفرما ہوتا۔ پل بنانے کے لئے ایک انجینئر' مستری اور عام آدمی کی رائے برابر ہوتی۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ ایسا کرنے والے کو انتہائی بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ناکامی کے بعد صرف ایک ہی فقرہ اسے سننے کو ملتا ہے' کسی جاننے والے سے مشورہ ہی کر لیا ہوتا۔

انسانی معاشرے کی اسی خصوصیت کو اسلام کے نظام شورائیت میں اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کے ہاں وہی کلیہ اہم ہے جو اللہ نے انسانوں کے مزاج اور فطرت میں ودیعت کر دیا ہے یعنی رائے سے پہلے صاحب الرائے کو دیکھو' پرکھو۔ یوں تو یہ پرکھ پرچول انسانی معاشرے میں روزمرہ کی چیز ہے' لیکن موجودہ ماڈرن زندگی میں تو رائے دینے والے کی پرکھ پرچول ایک سائنسی طریق کار بن چکا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے ادارے کا نظام' رائے دینے والے یعنی Consultants کے بغیر نامکمل ہے۔ تمام حکومتوں نے بڑے بڑے تھنک ٹینک قائم کر رکھے ہیں جو ہر معاملے میں اپنی صائم رائے دیتے ہیں لیکن ان تمام افراد کو کسی بھی جمہوری طریق کار یا ووٹنگ کے ذریعے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لئے ان کی علمی استعداد اور تجربے کو دیکھا جاتا ہے لیکن اس پورے جمہوری نظام کی جو جڑ ہے' یعنی حکومت اور صاحبان اقتدار منتخب کرنے کے لئے' رائے دینے یعنی ووٹ دینے والوں کے بارے میں یہ تصور ہے کہ ہر شخص کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے یعنی ہر فرد صاحب الرائے ہے۔ جمہوری نظام کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ دنیا کا ہر جمہوری ملک ووٹر یا رائے دینے کے لئے ایک شرط کم از کم لگاتا ہے اور وہ عمر کی شرط ہے۔ دنیا بھر میں جتنے بھی نظام تعلیم رائج ہیں ان میں ایک سولہ سال کا بچہ میٹرک' اولیول یا دیگر سند حاصل کر کے کافی علم اور سمجھ بوجھ حاصل کر لیتا ہے لیکن وہ ووٹ یا رائے دینے سے محروم ہے جبکہ ایک 80 سال کا بوڑھا' جس کی یادداشت تک کھو چکی ہو' جو فالج زدہ ہو' اسے جمہوری طور پر رائے دینے کا مکمل حق حاصل ہے۔ اسلام کی شورائیت صرف ایک عمر کی شرط عائد نہیں کرتی بلکہ اس کا ایک معیار ہے کہ کون اس قابل ہے کہ رائے دے سکے۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ان معیارات کو کون پرکھے گا۔ یہ سوال بھی انسانی فطرت کے بالکل برعکس ہے۔ کیا کسی گلی' محلے' دفتر یا ادارے میں پرکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ کون ایماندار' نیک' صاحب علم' شریف اور باکردار شخص ہے۔ ہر کسی کی انگلی اسی شخص کی جانب اٹھتی ہے جو ان خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ کسی نے اپنے ذاتی معاملے میں مشورہ کرنا ہو تو وہ صاحب الرائے کو پاتال میں سے بھی ڈھونڈ نکالتا ہے' اسے کسی قسم کی ووٹنگ نہیں کروانا پڑتی۔

لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ سب تو ایک خیالی دنیا کی باتیں ہیں' صدیوں پرانے معاشرے کے قصے ہیں' آج کے دور میں جہاں دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے' بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے ہیں وہاں ایسے صاحب الرائے کیسے تلاش کریں گے' کون تلاش کرے گا۔ اس تیز رفتار ترقی یافتہ دور میں کروڑوں لوگ دنیا کی بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارپوریٹ اداروں میں کام کرتے ہیں' روزانہ کروڑوں نئی ملازمت بھی حاصل کرتے ہیں اور اتنے ہی نکالے بھی جاتے ہیں۔ تعلیم کی شرط تو چھوڑ دیں۔ کیا ایک بنیادی شرط یہ نہیں ہوتی کہ وہ ایماندار ہوں اور ان کا کردار کرپشن اور بددیانتی سے پاک ہو' دنیا میں ایسی کارپوریشن بھی ہیں جو سو کے قریب ممالک میں لاکھوں لوگوں کو ملازم رکھے ہوئیں ہیں اور ان ملازمین کا پہلا معیار ایمانداری اور دیانت ہے۔ کوئی بھی کارپوریشن تعلیم پر سمجھوتہ کر لیتی ہے لیکن دیانت پر نہیں کرتی۔ ان سب نے ایک نظام وضع کیا ہے کہ دیانت اور ایمانداری کو کیسے پرکھا جاتا ہے۔ ہر ادارے میں نظام ایک تجربے کے بعد آیا' لوگوں نے اپنے اداروں کو بے ایمانی سے پاک کرنے کیلئے مربوط نظام بنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اٹھارہ کروڑ لوگوں پر پھیلے ہوئے ملک میں یہ کیسے شروع کیا جائے۔ عمر کی شرط لگا کر پچاس فیصد افراد کو تو آپ نے پہلے ہی فارغ کر دیا ہے۔ آپ کو ایک شرط نہیں بلکہ ووٹ یا رائے دینے کیلئے بہت سی شرائط عائد کرنا ہونگی' جن میں سب سے بنیادی شرط تعلیم جسے کم از کم میٹرک رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ رائے کے قابل فرد کو پرکھنے کے لئے ایک امتحان بھی رکھ سکتے ہیں جس کے بعد اس ملک میں رائے دینے والوں کو ایک ووٹنگ کارڈ جاری کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم صرف ایک بنیادی شرط ہے جس سے آغاز ہو' اس کے بعد دیگر شرائط کے لئے ایک طریق کار وضع کیا جائے اور ایسے ادارے ترتیب دیئے جائیں جو صاحب الرائے یا ووٹر کے کردار' اخلاق' دیانت اور علم کی جانچ پڑتال کریں اور ان کی رپورٹ اگلے مرحلے میں ووٹنگ کارڈ کی ضمانت ہو۔ ہو سکتا ہے ایک وقت ایسا جائے کہ اس ملک کی اکثریت ہی اہل الرائے کے منصب کے قابل ہو۔ مغربی جمہوری نظام کی دوسری اہم ترین شرط سیاسی پارٹیاں ہیں۔ یہ سیاسی پارٹیاں اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ ان کے ذریعے کارپوریٹ سرمایہ دار آسانی کے ساتھ پارٹی فنڈنگ کر سکتے ہیں۔ پورا جمہوری نظام اس سرمائے سے چلتا ہے۔ اسلام میں معاشرے کو اس طرح کے طبقات میں تقسیم کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں اہل الرائے جب کسی شخص کو خلیفہ بنا دیتے ہیں تو پھر ہر خاص و عام کو اس کی بیعت کرنا ہوتی ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر سخت ہدایت ہے کہ "اگر دو خلیفوں کی لوگوں میں بیعت ہو جائے تو بعد والے کو قتل کر دو"۔ یعنی اسلام اس طرح کی پارٹی بازی، گروہ بندی اور تفریق کو پسند نہیں کرتا۔ پارٹی سیاست کا وجود ہی اقرباپروری' کرپشن اور بددیانتی کی جڑ ہے۔ پارٹی سیاست نہ ہو تو لوگ خالصتاً صلاحیت اور دیانت کو دیکھ کر رائے دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ رائے دینے والوں کا معیار صحیح مقرر کر لیں۔ آرٹیکل 62 اور 63 کی شرط اسمبلی کے اراکین نہیں ووٹر کے لئے ہونا چاہیے۔ بنیاد غلط ہو گی تو اوپر بھی یہ سوال اٹھتا رہے گا کہ کون ثابت کرے کہ صادق اور امین کون ہے۔ اپنے گھر' فیکٹری یا دفتر میں ملازم رکھنے کے لئے کیا کبھی کسی کو یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ کون ثابت کرے کہ صادق اور امین کون ہے' اس وقت تو وہ بڑی تسلیاں اور تحقیق کر رہا ہوتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جھوٹ کا پول کھولتی ایک کتاب

اس ملک میں گزشتہ ساٹھ سال سے کچھ لوگ بڑے منظم انداز میں جھوٹ بولتے چلے آ رہے ہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر ملک بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس قوم کی وہ نسلیں جنہوں نے پاکستان کی تحریک کو صرف کتابوں کی حد تک پڑھا اور پھر مدتوں سوچتی رہی کہ جس ملک کی تخلیق کے لیے پنجابی بولنے والے راجپوتوں، جاٹوں اور گوجروں نے اپنے ہم نسل بھائیوں اور اپنی زمینوں کو چھوڑا۔ سندھی، گبولوں، انہڑوں اور چانڈوؤں نے ایک زبان بولنے اور ایک جیسی اجرک پہننے والوں سے علیحدگی اختیار کی۔ پشتونوں کے ہاں سے ان کے ہم زبان ہجرت کر گئے اور بلوچوں نے کسی دوسرے ملک کے بجائے اس ملک کو اختیار کیا۔ کیا وہ اس لیے نہیں تھا کہ یہ لوگ کلمۂ طیبہ پڑھتے تھے۔ دوسرے ان کے ہم نسل ہونے کے باوجود اس کلمے سے انکار کرتے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی۔ دس لاکھ انسان شہید کر دیئے گئے۔ کیا ان سب شہیدوں کی قربانیوں اور ان سب ہجرت کرنے والوں کے رہنما قائداعظم محمد علی جناحؒ واقعی ایک سیکولر ملک بنانا چاہتے تھے؟ نئی نسل کو یہ سب تضاد لگتا تھا اور وہ سوچتی رہتی کہ اگر ایسا ہی تھا تو ایک نئے ملک کے لیے قائداعظمؒ نے اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور بربریت کا خطرہ کیوں مول لیا۔ سیکولر طرز زندگی اور حکومت تو متحدہ ہندوستان میں بھی ممکن تھی۔

یہ تضاد جب نوٹنگھم میں رہنے والی پاکستانی لڑکی سلینہ کریم تک پہنچا تو تحقیق اور جستجو کی قائل اس خاتون نے سچ اور جھوٹ کا کھوج لگانے کی ٹھان لی۔ وہ اس سے پہلے متعدد اردو کتابوں کا ترجمہ کر چکی تھی اور برطانیہ کے ٹیلیویژن کے پروگرام "Deliver" کا سکرپٹ لکھ چکی تھی۔ وہ کئی ٹی وی پروگراموں اور فلموں سے وابستہ رہی۔ اس نے تحقیق کا آغاز کیا تو سب سے پہلے جناح آرکائیو کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور ایک گروہ ترتیب دیا جس کا نام "Visionary Fiction Alliance" تھا۔ جس کا مقصد جھوٹ اور سچ کو واضح کرنا تھا۔ سلینہ کریم کے مطابق، جب اس کے ہاتھ پاکستان کے سب سے متنازع چیف جسٹس منیر احمد کی کتاب "From Jinnah to Zia" لگی تو وہ اسے پڑھ کر حیران رہ گئی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ تمام سیکولر حلقوں کی مقبول ترین کتاب تھی۔ وہ اس کتاب کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کے سیکولر ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے اور پھر اپریل 1954ء میں حکومت پاکستان کو جمع کرانے والی منیر رپورٹ کا ذکر کرتے اور کہتے کہ دیکھو اس جسٹس نے کس طرح اس ملک کی تخلیق میں اسلام کے عنصر کی نفی کی ہے اور اس تصور کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ سلینہ کریم کے مطابق جب 2004ء میں وہ اس کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی تو اس کو اپنے والد فضل کریم فضلی کی کتاب ''قرآن اور پاکستان'' یاد آئی جو انہوں نے منیر رپورٹ کے جواب میں لکھی تھی۔ جب اس رپورٹ اور والد کی کتاب میں سلینہ نے قائداعظم کے ایک انٹرویو کے وہ حصے پڑھے جو انہوں نے 21 مئی 1947ء کو رائٹرز کے نمائندے Doom Campbell کو دیئے تھے تو میرا قائداعظمؒ کے بارے میں نظریہ متزلزل ہونے لگا کہ وہ اسلام کے نام پر ایک ملک بنانا چاہتے تھے۔ میں نے تحقیق شروع کی تو پہلے مجھے اس انٹرویو میں گرائمر کی غلطیوں پر حیرانی ہوئی۔ پھر مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ جسٹس منیر نے انٹرویو کی کوئی تاریخ نہیں لکھی بلکہ سال بھی 1946ء لکھا ہے۔ جسٹس منیر نے جو الفاظ لکھے وہ یہ تھے۔

"The new state would be modern democratic state with sovereignty resting in the people and the members of the new nation having equal rights of citizenship regardless of religion, caste or creed."

''نئی ریاست ایک جدید جمہوری ریاست ہوگی، جس میں اقتدار اعلیٰ عوام کا ہوگا اور اس نئی قوم کے عوام کو مذہب، رنگ اور نسل کے امتیاز کے بغیر مساوی حقوق حاصل ہونگے۔''

سلینہ کریم نے جب رائٹرز کے اصل انٹرویو تک رسائی حاصل کی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی اہم رپورٹ جسے حکومت پاکستان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو آج تک سیکولر حلقوں کی مقبول اور محبوب تحریر ہے اس میں ایک انتہائی ذمہ دار شخص اس قدر جھوٹا اور بددیانت بھی ہو سکتا ہے۔ قائداعظمؒ کے اصل الفاظ یہ تھے۔

"But the Government of Pakistan can only be a popular representative and democratic form of Government. It's Government and cabinet responsible to the parliament will both be finally responsible to the electorate and people in general without any distinction of caste, creed or sect."

''لیکن حکومت پاکستان ایک عوامی نمائندہ جمہوری طرز حکومت ہوگی۔ اس کی مقننہ اور حکومت پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہوں گی اور اس طرح عوام کے سامنے بھی جوابدہ۔ یہ جوابدہی کسی ذات، نسل یا گروہ کے امتیاز کے بغیر ہوگی۔''

آپ اس جھوٹ پر حیران رہ جائیے کہ جسٹس منیر نے عوام کے اقتدار اعلیٰ کا لفظ قائداعظم کے منہ میں اپریل 1954ء میں کیوں ڈالا۔ اس لیے کہ 1949ء میں قائداعظم کی مسلم لیگ کے منتخب نمائندے قراردادِ مقاصد منظور کر چکے تھے جس کا پہلا فقرہ یہ تھا ''اس کائنات اور مملکت خداداد پاکستان کا اقتدار اعلیٰ اللہ کے پاس ہے اور یہ حکومت ایک امانت ہے''۔ اللہ کے مالک و مختار ہونے کا اعلان پاکستان کے سیکولر حلقوں کو اس قدر برا لگتا تھا کہ وہ آج تک اس قرارداد کو سب برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قدر جھوٹے اور بددیانت ہوں گے کہ قائداعظمؒ کے نام سے جھوٹی تحریر یا جھوٹا انٹرویو ایک اہم سرکاری دستاویز، منیر رپورٹ میں درج کرائیں گے۔ جسٹس منیر سے رائٹرز کا انگریز صحافی ڈون کیمبل زیادہ دیانت دار تھا کہ اس نے سیکولر ہونے کے باوجود قائداعظم کے انٹرویو میں اپنی جانب سے ایک لفظ بھی شامل نہ کیا؛ حالانکہ اس وقت انٹرویوز کو ریکارڈ کرنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ صحافی نوٹس لیتے تھے لیکن اس کی دیانت نے قائداعظم کے اصل روپ کو سلامت رکھا۔ جسٹس منیر کے جھوٹ نے اس ملک کے نوجوانوں کو بددیانتی کا تحفہ دیا۔

سلینہ کریم نے اس بددیانتی اور جھوٹ کو بے نقاب کرنے کے لیے 2005ء میں ایک طویل مضمون لکھا اور پھر قائداعظم اور علامہ اقبال کے بارے اصل ماخذ کی تحقیق اور جستجو میں مصروف ہوگئی۔ اس کے سامنے دو سوال تھے کہ پاکستان وجود میں کیسے آیا؟ اور دوسرا یہ کہ پاکستان کو بنانے کا مقصد کیا تھا۔ اس نے اپنی اس تحقیق پر کئی سال صرف کر دیئے۔ پھر انگلش میڈیم سیکولر نسل کے لیے ایک حقائق کشا کتاب لے کر میدان میں آگئی۔ یہ کتاب مغرب کے ماحول میں پرورش پانے والی ایک پاکستانی لڑکی کی وہ عظیم تحریر ہے جو اس سیکولر نظریات پر مائل نسل کے سامنے یہ حقیقت کھولتی ہے کہ اس مملکت خداداد پاکستان کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا لا الہٰ الا اللہ اور وہ سب لوگ جو اس راہ میں قربان ہوئے، ان کی شہادتیں اللہ کے ہاں عظیم ہیں۔ کتاب Secular Jinnah & Pakistan کو پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹرپرائزز نے چھاپا ہے۔ کتاب میں وہ سب جھوٹ کھولے گئے ہیں اور وہ بددیانتیاں بے نقاب کی گئی ہیں، جن کی بنیاد پر ایک مخصوص گروہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا ہے کہ قائداعظم سیکولر تھے۔ جس شخص کو اللہ نے یہ عزت عطا کی ہو کہ دو سو ملکوں کے درمیان ایک ایسا ملک تخلیق کرنے کا سہرا اس کے سر بندھا، جو صرف اور صرف اللہ کے نام پر بنایا گیا، اس پر جھوٹ بولنے والوں کا پول ایک نہ ایک دن کھلنا ہی تھا۔ جس جسٹس منیر کے سینے پر اس ملک میں مارشل لاء کے حق میں پہلا فیصلہ دینے کا تمغہ سجا ہوا تھا۔ جس نے جمہوریت کا پہلا عدالتی قتل کیا تھا، وہ سیکولر دانشوروں کا ہیرو تھا۔ اس کے سینے پر جھوٹ اور بددیانتی کا یہ میڈل کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر سچی بات یہ کہ اتنا بڑا جھوٹ صرف جسٹس منیر ہی تصنیف کر سکتے تھے۔

KitaabPoint.blogspot.com

کہانیاں گھڑنے والے

یہ شخص دنیا بھر کے تیس فیصد سے زیادہ میڈیا کا مالک ہے۔ اس کی میڈیا کمپنی ''نیوز کارپوریشن'' دنیا کی دوسری بڑی کمپنی ہے۔ پہلے نمبر پر والٹ ڈزنی ہے جس کے تسلط میں اس وقت سینتیس فیصد میڈیا ہے۔ دنیا بھر کا میڈیا تین بڑی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی یہ دوسو آزاد اور خودمختار میڈیا ہاؤس ہوا کرتے تھے لیکن گزشتہ دہائی میں خرید و فروخت کا ایسا بازار گرم کیا گیا کہ ستانوے فیصد اخبارات، رسائل، ٹی وی چینل تین کمپنیوں کے پاس آ گئے۔ ان میں سے اس شخص ریوپرٹ مرڈوک کی کمپنی دوسرے نمبر آتی ہے۔ گیارہ مارچ 1931ء کو آسٹریلیا میں پیدا ہونے والے اس شخص کو 1952ء میں باپ کی موت کے بعد ایک میڈیا کمپنی ورثے میں ملی۔ اس وقت اس کمپنی کا نام نیوز لمیٹڈ تھا۔ صرف دس سال کے اندر اندر اس شخص نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بڑے اخبار خرید لیے اور پھر برطانیہ روانہ ہوا اور وہاں سے ''دی سن'' اور ''نیوز آف دی ورلڈ'' خریدنے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ وہاں ہفت روزہ ٹائمز کا مالک بن گیا۔ 1985ء میں اس نے امریکی شہریت حاصل کی اور اب اس کی کمپنی، وال سٹریٹ جنرل، فوکس نیوز، ہارپر کولنز جیسے اہم میڈیا ہاؤسز کی مالک ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس کے اخبار نیوز آف دی ورلڈ کو ٹیلی فون گفتگو ریکارڈ کرنے اور خفیہ طریقے سے دوسروں کے ٹیلیفون سننے پر مقدمے کا سامنا ہے۔

دنیا بھر کا میڈیا اخلاقی اصولوں سے عاری ہے۔ اس کا مقصد خالصتاً کاروباری مفادات کا تحفظ ہے، اسی طرح ان صاحب نے بھی اپنے زیرنگیں میڈیا ہاؤسز کو ایسی ہی پالیسی گائیڈ لائن دی ہیں۔ آج کے میڈیا میں لکھے جانے والے کالموں، تجزیوں، دکھائے جانے والے اشتہارات، ڈراموں کے اخلاقی زوال اور شخصیات کی کردارکشی، سب کی قلعی کھولتی ہے۔ مرڈوک کی میڈیا پالیسی کے چار بنیادی اصول ہیں: (1) تمام موسیقی الیکٹرانک سازوں پر منتقل کر دی جائے۔ (2) اخباروں، ٹیلی ویژن اور دیگر نشریاتی اداروں میں جو بھی تجزیہ ہو اس میں سازش یعنی "Conspiracy" کے عنصر کو نمایاں کیا جائے۔ (3) جو قیادت عوام میں از خود مقبول ہونے لگے اس کی کردار کشی کی جائے۔ (4) جنسی تلذذ کو آہستہ آہستہ میٹھے زہر کی طرح پروگراموں میں داخل کیا جائے۔ ان تمام پالیسی اہداف کو غور سے دیکھئے تو آپ کو آج کے میڈیا کی ساری کہانی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ موسیقی کو الیکٹرانک کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ پورے معاشرے میں ایک ہیجان اور بے سکونی کی کیفیت پیدا کی جائے، جس سے تحمل اور برداشت ختم ہو کر رہ جائے۔ پھر آپ ایک چھوٹے سے نعرے کی بنیاد پر لوگوں کو مشتعل کر سکتے ہیں۔ پس پردہ سازش ایک ایسا جال ہے، جس کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم ایک ناکارہ سی مخلوق ہو۔ تبدیلی، اقتدار پر بٹھانا، اتارنا، سب امریکہ کرتا ہے، مقتدر حلقے کرتے ہیں، ایجنسیاں کرتی ہیں یا پھر طاقت ور اشرافیہ۔ یہ ہے وہ بنیادی نقطہ جس کے اردگرد آج کا میڈیا گھومتا ہے۔ باقی رہا جنسی تلذذ، میوزک کو الیکٹرانک کرنا اور ابھرتے ہوئے لیڈروں کی کردار کشی، سب اس کی ذیلی شقیں ہیں۔

سازش، عالمی سازش، علاقائی اور ملکی سازش کو طشت ازبام کرنا، اس کی کہانیاں گھڑنا، یہ تینوں آج کے میڈیا کے محور ہیں۔ انہیں Conspiracy Theory بھی کہا جاتا ہے۔ کالم نگار ایک لچھے دار کہانی کا پلاٹ تیار کرتے ہیں، اینکر پرسن اس پلاٹ کی اہم باتوں پر زوردار بحث کراتے ہیں۔ رپورٹر اس پلاٹ کے اندر موجود مختلف عوامل پر خبریں ڈھونڈ کر لاتے ہیں تاکہ اس لچھے دار کہانی کو رنگ دیا جائے۔ اسے لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہونے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں اس ملک میں جتنی بھی تحریکیں چلیں، لوگ سڑکوں پر نکلے، جانیں دیں، جیلیں کاٹیں، اسے کبھی امریکہ، کبھی روس اور کبھی بھارت کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جو ظالم، آمر، ڈکٹیٹر یا جمہوری طور پر منتخب ہو کر فرعون بننے والا حکمران لوگوں کی جدوجہد سے حکومت سے گیا، اسے بھی امریکہ، عالمی طاقتوں اور ملک کے مقتدر حلقوں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ لوگوں میں کبھی یہ خود اعتمادی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ کسی آمر سے تخت چھین سکتے ہیں یا کسی حکومتی پالیسی کا رخ موڑ سکتے ہیں۔

جب اپنے کسی لیڈر کو عالمی طاقتوں اور ملک کے مقتدر حلقوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کا اصل مقصد لوگوں کی اس نفرت اور حقارت کا رخ بدلنا ہوتا ہے جو وہ اس لیڈر کے ساتھ کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف 1977ء میں اٹھنے والا عوامی سیلاب ایسا تھا کہ اس کا راستہ روکنا ناممکن تھا۔ اس کے پیچھے بہت سی کہانیاں تھیں۔ بلوچستان کے عوام کا وحشیانہ قتل تھا۔ چھ ہزار بلوچ مارے گئے تھے۔ سیاسی انتقام تھا کہ اپنے پیارے دوست مصطفیٰ کھر کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ مقتول سیاسی رہنماؤں کی ایک لمبی قطار تھی۔ مولوی شمس الدین، ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، عبدالصمد اچکزئی۔ یہی زمانہ تھا جب حنیف رامے جیسا شخص لاہور کے شاہی قلعے کی زیر زمین تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا تھا۔ اس کی بیوی ملاقات کیلئے سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتی پھرتی تھی۔ اس پورے دور اقتدار سے تنگ آئے لوگ جب سڑکوں پر نکلے تو پہلے اسے اعظم کلاتھ مارکیٹ کے تاجران کا پیسہ کہا گیا۔ عوام کے اس جوش انتقام کو جنرل ضیاالحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے استعمال کیا۔ بھٹو دشمنی کو ہتھیار بنایا تو بھٹو دور میں اذیتیں سہنے والے باچا خان کے بیٹے اور اسفندیار ولی کے والد عبدالولی خان نے جنرل ضیاء الحق کو مشورہ دیا کہ قبر ایک ہے اور مردے دو آپ ہوں گے یا بھٹو۔ یوں ضیاء الحق نے اس زیرک سیاستدان کی بات کو پلے باندھ لیا۔ یہ ایک زمینی حقیقت تھی۔ اقتدار کی جنگ تھی لیکن اس سب کو عالمی اور امریکی سازش کا ایسا نقاب پہنایا گیا کہ آج کوئی شخص بھی اس دور کا سچ بیان نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ضیاء الحق اور فوج بیچ میں نہ آتے تو وہ بلا کی نفرت تھی کہ تاریخ کا رخ کسی اور طرف متعین ہو چکا ہوتا۔

ہماری خفیہ ایجنسیاں، مقتدر حلقے اور میڈیا آپس میں ایک مشترکہ مفاد کے تحت سازش کی کہانیاں گھڑتے ہیں۔ لچھے دار بنانے کے لئے ان میں مرچ مصالحہ ڈالتے ہیں۔ پھر عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جو قتل و غارت ہو رہا ہے یہ جو آئے دن لوگوں کے لاشے گر رہے ہیں، اس میں ان لوگوں کا کیا قصور جو قتل کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے یہ ضیاء الحق کے دور میں مسلط کی گئی افغان جنگ کی وجہ سے ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس میں بھارت اور دیگر ممالک حصہ دار ہیں۔ تیسرا ایہ جواز دینے کی کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب سی آئی اے، بلیک واٹر اور امریکہ کی وجہ سے ہے۔ نہ عوام کسی کو قتل کرتے ہیں نہ عوام مقتول ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے جنازے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ وہ جھوٹ ہے جس نے ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے کا بھرکس نکال دیا ہے۔ صرف کراچی کو لیں تو کیا ایک لسانی گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے افراد کے قتل کی منصوبہ بندی نہیں کرتے۔ اپنے دشمن کو تاک کر نشانہ نہیں بناتے۔ یہ سب آپریشن ان کے دفاتر یا گھروں میں طے نہیں ہوتے۔ اس ملک کی انتظامیہ تو ایک طرف کراچی کے ہر فرد کو معلوم ہے کہ کون سا قتل کس نے کیا یا کس نے کرایا۔ خضدار شہر گزشتہ عیدالفطر سے لے کر آج تک ایک مقتل بنا ہوا ہے۔ صرف چھ دن کیلئے بازار کھلے۔ پک اپ گاڑیوں میں دونوں اطراف کے لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔ کیا یہ آسمانی مخلوق ہے۔ نہیں دونوں بلوچ یا براہوی ہیں۔ خضدار سے بلوچ ہجرت کر رہے ہیں۔ کیا یہ واقعی عالمی سازش ہے۔ کسی شیعہ یا سنی دہشت گرد تنظیم کے لوگوں کے درمیان بیٹھ جائیں، آپ کو بہت سے لوگ ایسے مل جائیں گے جو کہیں گے کہ میں نے فلاں مکتب فکر کے اتنے لوگ جہنم رسید کیے۔ ایسے بھی ہوں گے جو بتائیں گے کہ میں نے فلاں عالم دین کو دوزخ میں پہنچایا۔ ان کا یہ غصہ اور قتل و غارت دونوں جانب کے علما کی شعلہ بیانیوں کا نتیجہ ہے۔ کیا یہ سب بھی امریکہ، عالمی، علاقائی یا ملکی سازش ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ''میں جس کو چاہوں بادشاہت عطا کروں اور جس سے چاہوں بادشاہت چھین لوں، جسے چاہوں عزت دوں، جسے چاہوں ذلت دوں، اس کے ہاتھ میں خیر ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' ایک لمحے کو ان آیات کو غور سے پڑھیے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے یہ دعوے اور یہ تمام خصوصیات ہم نے امریکہ، عالمی طاقتوں، علاقائی قوتوں اور ملکی مقتدر حلقوں پر منطبق نہیں کر دیئے؟ اللہ کی خصوصیات امریکہ سے وابستہ کر دی ہیں۔ بت صرف پتھر کے نہیں ہوتے، انسان اور ادارے بھی۔ ایسے واضح شرک کے بعد یہ قوم اللہ سے رحمت کی خواستگار ہے، تعجب ہے!

KitaabPoint.blogspot.com

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

فلپائن کے شہر منیلا کے علاقے پاسک میں ایشیائی ترقیاتی بنک کی کئی منزلہ عمارت میں ہزاروں کمرے ہوں گے لیکن اس کے کمرے کے دروازے کے اوپر شاندار ٹائل پر خوبصورت رنگوں میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی تھی۔ کتنے مسلمان ملکوں کے نسل در نسل خاندانی مسلمان وہاں کام کرتے ہیں لیکن اس ماحول میں رنگے ہوئے۔ عالمی طور پر وضع کردہ اصطلاحات میں رچی بسی گفتگو کرتے اور ویسی ہی زندگی بسر کرتے ہوئے مگر وہ تو ایک امریکی تھا۔ ایک کٹر عیسائی خاندان میں پلا بڑھا۔ امریکی ریاست ایریزونا کا رہنے والا۔ وہ ریاست جو بلوچستان کی طرح بے آب وگیاہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ جہاں پانی کی اہمیت نے اس شعبے کے ماہرین کو اپنا اثاثہ بنایا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی ماہر تھا جس کی مانگ ہر ایسے خطے میں تھی جہاں پانی کو ذخیرہ کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لئے منصوبہ سازی کی جاتی تھی۔ قسمت اسے صومالیہ لے گئی۔ وہاں اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ مسلمان عجیب قوم ہے کہ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہوتی ہے' فاقوں پر فاقے چل رہے ہوتے ہیں لیکن جہاں وہ پانچ وقت اللہ کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں وہیں وہ اس پروردگار سے کوئی شکایت نہیں کرتے بالکل مسلسل اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ یہ رویہ اسے اسلام کے نزدیک لے آیا۔ وہ مسلمان ہوا تو اس کی زندگی میں جو تبدیلی آئی وہ صرف اسی شخص کی زندگی میں آسکتی ہے کہ جو سمجھتا ہے کہ ایک صحیح مسلمان اسی وقت بنا جا سکتا ہے جب آپ ان اصطلاحات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں جو اسلام کا جداگانہ خاصہ ہیں۔ وہ کہتا تھا جب تک میں امریکی اور مغربی اصطلاحات استعمال کرتا رہوں گا میں کبھی بھی اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ اس لیے کہ اسلام کی دی گئی اصطلاحات ایک مختلف طرز زندگی اور مخصوص روحانی اور ایمانی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ لفظ اللہ استعمال کرتا اور امریکی انگریزی میں پروان چڑھنے کے باوجود کبھی گاڈ (God) کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ میں اس کے گھر گیا تو اس کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ کوئی اہتمام نہ تھا۔ میں نے دس سالہ معصوم لڑکی سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا ''اس میں کیا خاص بات ہے کہ میں پیدا ہوئی''۔ میں نے کہا تحفے ملتے ہیں۔ اس کا جواب تھا میرے ماں باپ اکثر مجھے تحفے دیتے ہیں' میرے مانگنے پر بھی اور میری کسی کامیابی پر بھی' بلکہ اکثر مجھ سے محبت کے اظہار کے لئے بھی' تو پھر کسی ایک دن تک مصنوعی خوشی کو محدود کرنے میں کیا فائدہ۔ دس سالہ بچی کے منہ سے یہ جواب صرف اس کے والدین کی تربیت کا نتیجہ تھا جنہوں نے اسے اسلامی اصطلاحات کے معانی و مفاہیم کے تناظر میں پالا تھا۔ ڈیوڈ جس نے اپنا اسلامی نام داؤد رکھا تھا اور جس نے مجھے اس سمت سوچنے کا راستہ دکھایا کہ روز مرہ زندگی میں اصطلاحات استعمال کرنے سے طرز زندگی میں کتنا فرق آجاتا ہے اور اسلام تو ہے ہی ایک جداگانہ طرز زندگی کا نام' جسے اقبال نے کس خوبصورتی سے بیان کیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اصطلاحات روز مرہ زندگی میں استعمال کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی بھی لسانیات کا ماہر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی زندگی میں جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ اس کی شخصیت اور رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں کسی لڑکے یا لڑکی کو کتنی آسانی سے ''آئی لو یو'' کہہ دیتے ہیں لیکن اگر آپ کو کسی سے ''میں تم سے عشق یا محبت کرتا ہوں یا کرتی ہوں'' کہنا پڑ جائے تو آپ سو بار سوچیں گے کہ یہ کتنا عامیانہ لفظ ہے' کیا مجھے ایسا کہنا زیب بھی دیتا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے پیچھے آپ کے معاشرے کے وہ رویے ہوتے ہیں جو آپ کو مدتوں شرم وحیا اور دوسری صنف سے گفتگو کے آداب سکھاتے ہیں۔ یہ تو معاشرت کی بات ہے۔ اب ذرا اسلام کے معیارات اور اصطلاحات کے استعمال سے زندگی پر پڑنے والے اثرات دیکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیبی اثرات کی وجہ سے ایسے بہت سے فقرے عام ہوگئے ہیں جو ہم بغیر کسی جھجک کے آسانی کے ساتھ بول جاتے ہیں۔ مثلاً We are too close, we are physical, I have an offair یہ تمام انگریزی جملے ہم جسمانی تعلق کے ڈھکے چھپے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اپنی طرز پر ادائیگی سے اگلے تک مطلب بھی پہنچا دیتے ہیں لیکن اگر ہمیں اپنے اس تعلق کے لئے لفظ زنا استعمال کرنا پڑ جائے تو اس کے ساتھ جو تصور گناہ وابستہ ہے وہ ہمیں شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا ہے۔ اسی طرح ہم کسی ایسے شخص کو عیاش کہہ لیتے ہیں' یہ تک کہہ لیتے کہ وہ فلرٹ ہے' کوئی زیادہ انگریزی دان ہو تو Debosh کہہ دے گا لیکن اس کے جرم کی نوعیت دیکھتے ہوئے اسے زانی کہہ کر نہیں پکارتے ہیں حالانکہ وہ اسی فعل کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم اس احساس گناہ سے بچنا چاہتے ہیں جو اسلام ہمارے ذہن میں صرف ایک اصطلاح کے استعمال سے ڈالتا ہے اسی طرح کرپشن' کک بیک اور بددیانتی جیسے لفظ ہم روز استعمال کرتے ہیں۔ ہم ایسے پٹواری' تھانیدار' انجینئر یا اعلیٰ ترین افسر کو بددیانت اور کرپٹ تو کہہ دیتے ہیں لیکن اسے راشی نہیں کہتے کہ ہمارے ذہنوں میں سید الانبیاء کی وہ حدیث گونجنے لگتی ہے کہ ''رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔ دنیا کا ہر بینکار یہ بخوبی جانتا ہے اور اس کا ادراک رکھتا ہے کہ وہ جو بھی زائد رقم اپنے کھاتے داروں کو دے رہا ہے وہ سود ہے لیکن وہ اسے منافع کہہ کر لوگوں کو قائل کرتا ہے اور لوگ بھی وصول کرتے ہیں لیکن اگر وہ لفظ سود یا رباء استعمال کرے تو اسے اندازہ ہو جائے کہ لوگ کیسے اس کاروبار سے منہ پھیرتے ہیں۔ لفظ سود کا اصل ترجمہ انگریزی میں USURY ہے۔ یہ سود کا نظام اس قدر مکار ہے کہ اسے علم ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اسے جائز تصور کرتا اس لئے اس سود کو ایک نیا نام دیا گیا جسے interest کہتے ہیں۔ پاکستان کے آئین میں انسانی اخلاق اور صاف وشفاف کردار کو ثابت کرنے کیلئے صرف دو اسلامی اصطلاحات ''صادق'' اور ''امین'' استعمال ہوئی ہیں جس پر آج تک بحث چلتی ہے۔ کوئی سیاست دان انہیں ماننے کو تیار نہیں۔ کتنے بڑے بڑے دانشور اور تجزیہ نگار اپنے تعصب اور نفرت کا اظہار ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ کیا کسی حکمران' ممبر اسمبلی یا سینیٹر کو سچا اور امانت دار نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کوئی بھی لفظ بول لیں' راست گو کہہ لیں Thuthful کہہ لیں' Trustee کہہ لیں وہ ماننے کو تیار ہیں لیکن جیسے ہی لفظ ''صادق'' اور ''امین'' استعمال ہوتا ہے تو چیخیں نکل جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں الفاظ سے وہ معیارات ذہن میں آتے ہیں جو قرآن اور حدیث طے کرتی ہے۔ آئین میں یہ صرف دو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں تو وہ پورا تہذیبی نظام خوفزدہ ہے جو اپنی بددیانتی' جھوٹ' مکروفریب' ریاکاری' خیانت' کرپشن' رشوت خوری اور اقرباپروری جیسے جرائم کو اصطلاحات کی آڑ میں چھپا کر ایک طرز زندگی مہیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے جج کو قاضی نہیں کہتے کہ پھر ہمیں معیار مدینہ سے لانا پڑے گا' ہم اپنے حکمران کو امیر یا خلیفہ نہیں کہتے کہ پھر لوگ ان سے ویسا ہی طرز عمل طلب کریں گے جو ان عہدوں پر سید الانبیاء کے صحابہ نے اختیار کیا تھا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے آئین کی ایک کتاب تحریر کی جاتی ہے تاکہ لوگ انہی اصطلاحات میں سوچنا اور زندگی گزارنا شروع کریں۔ دنیا کا کوئی آئین ایسا نہیں جس کی ہزاروں مختلف توجیہات نہ ہوں۔ ہر کسی کی اپنی توجیہہ ہوتی ہے لیکن وہ نافذ ہوتا ہے۔ بس ایک ادارے کو اس کی توجیہہ کرنے کا اختیار دے دیا جاتا ہے جیسے سپریم کورٹ لیکن آپ کہیں کہ قرآن کو آئین بنادو تو آواز اٹھتی ہے کونسی توجیہہ نافذ کریں۔ کتنا آسان ہے کہ ایک ادارہ بنادو جسے توجیہہ کا اختیار دے دو لیکن یہ کوئی نہیں کرے گا۔ وہ تمہیں اپنی اصطلاحات میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی اسلام کی اصطلاحات کا استعمال کرنے لگے تو اسے دقیانوس' فرسودہ' غیر ترقی یافتہ اور دیگر القاب سے نوازا جاتا ہے۔ اصل خوف یہ ہے کہ اگر اصطلاحات استعمال ہونا شروع ہوگئیں تو معیار زندہ ہو جائیں گے۔

KitaabPoint.blogspot.com

خوف، نفرت، تعصب، ہیجان اور افراتفری

میرے سامنے ایک غیر ملکی سفارت خانے اور اسکے ایک ملکی امدادی ادارے کے وہ تازہ ترین اشتہارات ہیں جن میں پاکستان بھر میں کام کرنے والی این جی اوز سے درخواستیں طلب کی گئیں ہیں تاکہ ان کو مختلف پروجیکٹ کے لیے فنڈز فراہم کیۓ جائیں۔ ہر شعبہ کے حوالے سے درخواست دینے کی علیحدہ آخری تاریخ ہے۔ سفارت خانے کا پبلک افیئرز آفس تعلیمی شعبے میں درخواستیں مانگ رہا ہے تو اس کا امدادی ادارہ کاروباری مہارتیں پیدا کرنے اور خواتین کو معاشی طور پر خود مختار کرنے کے لیے فنڈز مہیا کرنے پر تیار ہے۔ یہ صرف ایک سفارت خانے کی بات نہیں، پاکستان میں موجود ہر مغربی ملک کے سفارت خانے نے اعلانیہ یا خاموشی سے پاکستان میں اپنے مقصد کی این جی اوز کو رقم فراہم کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ آپ درخواست جمع کرائیں۔ آپ کی این جی او کے مقاصد اگر ان سفارت خانوں کے مقاصد کو پورا کرتے ہوں تو آپ پر ڈالروں، پاؤنڈوں اور یوروز کی بارش شروع ہو جائے گی۔ سفارت خانوں کے علاوہ پوری دنیا میں ڈونرز کا ایک جال بچھا ہوا ہے، کئی سو فاؤنڈیشن ہیں جو پاکستان میں لوگوں کو اپنے ایجنڈے کے مطابق سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان میں یہ تمام ڈونرز علی الاعلان اخبارات میں بھی اور انٹرنیٹ پر بھی درخواستیں طلب کرتے ہیں، اس کے بعد ملک بھر سے سرمائے کی طلب میں حواس باختہ لوگ اپنی این جی اوز رجسٹرڈ کرواتے ہیں۔ پھر ان تمام ڈونرز کے مطابق پراجیکٹ ترتیب دیتے ہیں، اسکے بعد اپنی درخواستیں جمع کرواتے ہیں اور انہیں کروڑوں کے حساب سے سرمایہ فراہم ہو رہا ہے۔ مثلاً یورپی کمیشن نے پراجیکٹ کے لیے امداد کی زیادہ سے زیادہ شرح سات لاکھ پچاس ہزار یورو رکھی ہے جبکہ کسی بھی این جی او کو کم سے کم ملنے والی امداد پانچ لاکھ یورو ہے۔ یہ تمام امداد کس قسم کی این جی اوز کو دی جاتی ہے۔ یہ ہے اصل سوال اور اس سوال کے جواب میں ہی وہ راز پنہاں ہے جس نے پاکستان کے معاشرے کو خوف، نفرت، تعصب اور افراتفری کا شکار کر رکھا ہے۔ سب سے زیادہ امداد Advocacy یعنی وکالت، حمایت اور (Awareness) یعنی آگاہی اور شعور کے لیے کام کرنے والی این جی اوز کو دی جاتی ہے۔ یہ شعور اور وکالت بھی جن شعبوں میں دی جاتی ہے، ان میں سب سے پہلے نمبر پر حقوقِ نسواں اور پھر اقلیتوں کے حقوق والی تنظیمیں آتی ہیں۔ آگاہی اور شعور کی بہترین مثال یہ ہے کہ آپ بھوکے کو بار بار اس بات کا احساس دلائیں کہ تمہیں بھوک لگتی ہے، تم کھاؤ گے نہیں تو تمہاری صحت خراب ہو جائے گی اور تم مر جاؤ گے، لیکن اسے کبھی روٹی فراہم نہ کرو۔ کیونکہ روٹی فراہم کرنا ان تمام این جی اوز کے نزدیک محتاجی کو عام کرنا ہے، جسے وہ اپنے زبان میں (Dependence) کہتی ہیں۔ اس لیے وہ کہتی ہیں کہ اگر لوگوں کو اپنے حقوق اور محرومی کا شعور دے دیا جائے تو وہ خود آگے بڑھ کر اسے حاصل کر لیتے ہیں۔ گزشتہ تیس سال سے یہ سفارت خانے اور ڈونرز اس ملک میں اربوں روپے کا سرمایہ ان این جی اوز کو فراہم کر چکے ہیں اور اس تمام سرمایہ کاری پر حکومتِ پاکستان کو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں اور نہ ہی وہ ایسی کسی قسم کی فنڈنگ کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان گزشتہ تیس سالوں سے اس وافر سرمائے کی فراہمی نے ان تمام این جی اوز کے کرتا دھرتا افراد کو ملا کر ایک سول سوسائٹی تخلیق کر دی ہے جو ایسے وقت میں سڑکوں پر نکلتی ہے جب ان تمام ڈونرز کا ایجنڈا انہیں نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ان تمام افراد اور اداروں کے خلاف آواز بلند کرتی ہے جو اس ایجنڈے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ یہ پاکستان کے ہر اہم ادارے سے اتنی دیر تک محبت کرتی ہے جب تک وہ ان کے ایجنڈے کے مطابق کام کرتا ہے لیکن جیسے ہی ان اداروں کا کوئی بھی عمل ان کے ایجنڈے سے مختلف ہو جائے تو یہ این جی اوز پاکستان کی سلامتی تک داؤ پر لگاتے ہوئے پاکستان کے ہر ادارے کی تضحیک کرتی ہے اور انہیں پاکستان کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔

یہ سول سوسائٹی شعور اور وکالت کے نام پر لوگوں میں خوف، نفرت، تعصب اور ہیجان کیسے پیدا کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس کے کام کرنے کے طریقِ کار سے ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں روزانہ ہزاروں ایف آئی آر درج ہوتی ہیں جن میں ہزاروں بے گناہ مجرم جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کئی بے گناہ افراد جھوٹے گواہوں اور انصاف کی عدم فراہمی کی وجہ سے پھانسی کے گھاٹ تک بھی جا پہنچتے ہیں، لیکن یہ سول سوسائٹی صرف توہین رسالت کے ایسے مجرم کے لیے سڑکوں اور چوراہوں پر آئے گی جو کسی اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ توہین رسالت کے زیادہ تر مقدمے مسلمانوں کے خلاف درج ہوتے ہیں لیکن عیسائیوں یا ہندوؤں کے مسلے کو خصوصاً اچھالنا دراصل اس پوری کمیونٹی کے اندر خوف، نفرت، تعصب اور ہیجان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ ان کا بچہ اس بات پر یقین کر لے کہ یہ زیادتی صرف ان کے ساتھ ہو رہی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے تمام رفاہی تعلیمی ادارے قومی ملکیت میں لے لئے تھے۔ اس سے پہلے مسلمان رفاہی ادارے بھی ملک بھر میں تعلیمی ادارے چلاتے تھے اور عیسائی مشنری بھی، لیکن پاکستان کی تاریخ میں یہ واحد استثناء ہے کہ کسی مسلمان رفاہی ادارے کو اس کے تعلیمی ادارے واپس نہیں کیۓ گئے لیکن تمام عیسائی مشنری تنظیموں کو ان کے تعلیمی ادارے واپس کر دیئے گئے اور آج یہ ادارے اس ملک میں اپنی مرضی کی تعلیمی پالیسی اور مخصوص نصابِ تعلیم کے تحت چل رہے ہیں۔ اس سول سوسائٹی نے کبھی عیسائی اقلیت کے ساتھ اس بہترین سلوک کا ذکر تک نہیں کیا، اسلئے کہ کہیں اس اقلیت میں یہ احساس پیدا نہ ہو جائے کہ تمہیں مسلمانوں سے بھی بہتر سلوک سے نوازا گیا۔ اس لیے بھی کہ ایسا کرنے سے "آگاہی اور وکالت" کے اس ایجنڈے کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ملک میں بھٹہ کے مزدور ہر رنگ نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور بدترین غلامی کا شکار ہیں۔ اکثر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جب انہیں مالکان اپنے تشدد کی انتہا پر پہنچتے ہوئے زندہ جلا دیتے ہیں۔ خوفزدہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ لیکن مسئلہ اچھالنا ہو تو کسی بھی اقلیت کو سامنے رکھ کر اچھالا جاتا ہے۔ توہین قرآن پر گوجرانوالہ میں ایک شخص کو ڈنڈے مار کر مار دیا گیا لیکن کوئی سول سوسائٹی حرکت میں نہ آئی، کیونکہ اس کے منہ پر داڑھی تھی اور وہ مسلمان تھا۔ اس شخص کے کیس کو اچھالنے سے ان کا "آگاہی اور وکالت" کا ایجنڈا پورا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان کی عدالتوں میں روز خواتین بھاگ کر شادی کرتی ہیں۔ میری عدالت میں چار جوڑوں نے پسند کی شادی کی۔ چاروں عورتوں کو ان کے آشناؤں نے بیچ دیا اور وہ بچیاں بدترین زندگی گزار رہی ہیں۔ ان چار مردوں کے خلاف کوئی سول سوسائٹی کبھی نہیں اٹھے گی کہ اس سے عورتوں کے حقوق کی وکالت کا ایجنڈا پورا نہیں ہوتا۔ ایجنڈا تو اس وقت پورا ہوتا ہے اگر لڑکی والدین سے نفرت کر کے بھاگے۔ پاکستان سارے کا سارا غربت و افلاس کی تصویر ہے، کچی آبادیوں کی ایک قطار ہے جس میں ہر رنگ نسل، زبان اور مذہب کے لوگ آباد ہیں لیکن سول سوسائٹی کو یہ سب بلا رنگ نسل و مذہب نظر نہیں آتا۔ کسی مخصوص مذہب کے حوالے سے ہیجان پھیلانا ان کا خاصہ ہے۔ گوجرہ میں گھر جلائے جائیں تو سول سوسائٹی کا احتجاج سالوں پر محیط ہوتا ہے، لیکن بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں 250 انسان جل جائیں تو ایک پلے کارڈ بھی مجرموں کے خلاف نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس سے ایجنڈے کی تکمیل نہیں ہوتی۔ گزشتہ تیس سالوں سے اس سول سوسائٹی نے اقلیت کے ذہنوں میں ہتھوڑے مارنے کی طرح بار بار یہ بات ذہن نشین کروائی ہے کہ ظلم صرف تم پر ہوتا ہے۔ اٹھارہ کروڑ لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ تمہیں اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا ہو گی اور دیکھو پوری دنیا کی عالمی طاقتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہ قبیلے کے مسلمان سو کے قریب لاشیں ساتھ رکھ کر احتجاج کرتے ہیں اور صبر کا دامن نہیں چھوڑتے، لیکن یوحنا آباد کے لوگ جنہیں سول سوسائٹی نے اپنے پراپیگنڈے سے خوف، نفرت، تعصب اور ہیجان کا شکار کیا ہے وہ دو انسانوں کو زندہ جلا دیتے ہیں۔ مقدمہ کس کے خلاف درج ہونا چاہیے؟۔

KitaabPoint.blogspot.com

خواب تو خواب ہوتے ہیں

یورپ میں امن کے نوبل انعام کے دستخطوں کی اس مہم میں جو ملالہ کے لیے چلائی جارہی ہے، موجودہ ظلم و بربریت کی تاریخ کے اوراق میں ایک روشن اور تابناک چہرے کی یاد آرہی ہے۔ وہ شخص جس نے اس مہذب دنیا کے مکروہ نوبل امن انعام کو لینے سے انکار کردیا تھا جس دن سے یعنی 1901ء سے اس نوبل انعام کا آغاز ہوا دو عظیم انسانوں کو انکار کی یہ جرأت نصیب ہوئی۔ ایک ژاں پال سارتر جسے ادب کا انعام دیا گیا تھا۔ وہ بہت بڑا ادیب تھا لیکن اپنے ادب کو انعامات، ایوارڈز اور سرکاری اعزازات کی لعنت سے پاک رکھنا چاہتا تھا لیکن جس دوسرے شخص نے امن کا نوبل انعام دھتکارا اس نے امن کے ٹھیکیداروں کے چہروں سے نقاب الٹ کر ان کا بھیانک اور خوفناک روپ دنیا کو دکھا دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے ملک ویت نام پر امریکی فوج قابض تھی اور بربریت کی تاریخ رقم ہورہی تھی۔ معصوم ویت نامی قتل ہو رہے تھے، عورتیں جنسی تشدد کا نشانہ بن رہی تھیں، بچے بندوقوں پر نصب سنگینوں پر اچھالے جارہے تھے۔ امریکہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ وہاں موجود تھا اور نہتے ویت نامی عوام گوریلا جنگ سے اس کا مقابلہ کررہے تھے۔ یہ قوم کتنی خوش نصیب تھی کہ ان کے ہاں کوئی ایسا ''عظیم'' دانشور، تجزیہ نگار، ادیب یا صحافی موجود نہ تھا جو ان سے میرے ملک کے دانشوروں کی طرح کہتا کہ ''بے وقوف اور جاہل ہیں یہ لوگ، اسپرین کی گولی بنا نہیں سکتے اور امریکہ جیسی سپر پاور کو شکست دینے کے خواب دیکھتے ہیں۔'' غیرت مند قوموں میں ایسے لوگ جنم نہیں لیا کرتے۔ یہ ویت نامی کہ جن کے قد ہمارے ملک کے بچوں کے برابر ہیں جن کی جسمانی ساخت ایک کمزور اور ناتواں انسان جیسی ہے۔ جن کے ملک میں نہ کوئی پہاڑی سلسلہ ہے کہ اس کی پناہ میں چھپ کر امریکی فوج پر حملے کیے جاسکیں۔ صاف چٹیل میدان جیسا ملک اور سروں پر ہر وقت پرواز کرتے امریکی جہاز اور ہیلی کاپٹر لیکن امریکہ 59 ہزار فوجیوں کی لاشیں اٹھا کر وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ اسی ویت نام پر نیپام بموں کی بارش کی گئی۔ اپنے فوجیوں کی موت اور واضح شکست نے امریکی قیادت کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور 1972ء میں رچرڈ نکسن نے شمالی ویت نام کے دو شہروں ہنوئی اور ہائی فونگ پر شدید بمباری کا سلسلہ شروع کیا۔ دس دنوں میں ان دونوں شہروں پر ایک لاکھ بم گرائے گئے۔ ان بموں کی تباہ کرنے کی مجموعی صلاحیت ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹم بم سے پانچ گنا زیادہ تھی۔

جس دوران یہ قتل عام جاری تھا، بم برسائے جارہے تھے۔ ویت نام کے گوریلا یعنی اس قوم کے ''طالبان'' ایک منظم گروہ کی حیثیت سے امریکی افواج پر حملے بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس زمانے کے امریکی اخبارات اور عالمی میڈیا اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ان ویت نامی گوریلوں کے خلاف ویسی ہی زبان اور اسی طرح کے الزامات ملیں گے جو آج مسلمانوں کے کسی بھی مزاحمتی گروہ کے بارے میں اخباروں میں نظر آتے ہیں۔ یہ شدت پسند ہیں، انسانیت کے دشمن ہیں، معصوموں کو قتل کرتے ہیں، بچوں کو ورغلا کر جنگ کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انہوں نے سکولوں، ہسپتالوں اور ریڈ کراس کی عمارتوں کو تباہ کیا ہے۔ یہ ہمارے لائف سٹائل کے دشمن ہیں۔ یہ ترقی کے دشمن ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ویت نام میں امن ہو، یہاں بیرونی سرمایہ کاری آئے، لوگ خوشحال ہوں لیکن ان سب الزامات کے باوجود ویت نامی گوریلوں کو دہشت گرد، شدت پسند اور قاتل کے القابات سے نوازنے کے ساتھ ساتھ امریکہ اپنی شکست کو چھپانے اور وہاں سے باعزت واپسی کے لیے مارچ 1968ء سے فرانس کے شہر پیرس میں ویت نامی گوریلوں سے مذاکرات کررہا تھا۔ کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ پہلے ہتھیار پھینکو پھر مذاکرات کریں گے۔ اس وقت وہاں ڈیموکریٹ صدر جانسن کی حکومت تھی۔ ویت نامی گوریلے امریکی پٹھو جنوبی ویت نامی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے تھے جو حامد کرزئی کی طرح وہاں بنائی گئی تھی۔ جانسن حکومت نے یہ حل نکالا کہ جنوبی ویت نام کی حکومت کو امریکی وفد کا حصہ بنالیا۔ یہاں امریکی الیکشن آگیا۔ اسی طرح جیسے ملالہ کے واقعہ کے قریب اوباما کا الیکشن آیا تھا۔ رچرڈ نکسن ریپبلکن پارٹی کی جانب سے امیدوار تھے۔ انہوں نے جنوبی ویت نام کی حکومت کو یقین دلایا کہ ہم تمہیں تسلیم کرائیں گے اور امریکہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ یوں جنوبی ویت نام کی حکومت امریکی وفد سے باہر آگئی۔ جانسن جس کی انتخابی مہم ہی ویت نام میں امن کی بنیاد پر چل رہی تھی، ٹھس ہوگئی اور وہ الیکشن ہار گیا۔ جانسن نے اسے ملک سے غداری کہا لیکن کسی پر غداری کا مقدمہ نہ چل سکا۔ نکسن آیا، ظلم و بربریت بڑھا اور مذاکرات بھی دوبارہ شروع ہوئے۔

ان مذاکرات میں ویت نامی گوریلوں کی نمائندگی تاریخ ساز اور عظیم شخصیت لی ڈیو تھو (Le Duetho) کررہی تھی۔ یہ شخص 14 اکتوبر 1911ء کو ویت نام کے نام ہا صوبے میں پیدا ہوا۔ اس نے 1930ء میں ہند چینی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور اپنے ملک پر فرانسیسی تسلط کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس دوران وہ 1930ء سے 1936ء اور 1939ء سے 1944ء تک دو دفعہ مجموعی طور پر گیارہ سال جیل میں رہا۔ امریکی مفادات اور عالمی استعمار نے اس کے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس عظیم رہنما نے جنرل گیاپ اور ہوچی منہ کے ساتھ مل کر انقلابی لیگ بنائی۔ امریکہ 1960ء میں اس خطے میں اپنی فوجوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ آٹھ سال کی اس گھمسان کی لڑائی کے بعد جب امریکی حکومت کی آنکھوں میں شکست کے تارے ناچنے لگے تو مذاکرات کی میز سجادی گئی۔ اس میز پر ایک جانب امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر تھا اور دوسری جانب لی ڈیو تھو۔ مذاکرات بھی چل رہے تھے اور قتل و غارت بھی جاری تھا۔ آخر کار 23 جنوری 1973ء کو معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ نوبل انعام کی کمیٹی نے ہنری کسنجر اور لی ڈیو تھو کو امن کے نوبل انعام کا مستحق قرار دے دیا لیکن دنیا اس بات پر ورطۂ حیرت میں چلی گئی کہ اس شخص نے نوبل انعام لینے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ میرے ملک میں ساٹھ لاکھ لوگوں کو قتل کرنے والوں اور آج بھی قتل و غارت کے بہانے ڈھونڈنے والوں کے ہاتھوں سے میں یہ امن کا انعام نہیں لے سکتا۔ جس عالمی برادری نے سالوں ہم پر غلامی مسلط کی، ہمیں قاتل، دہشت گرد اور ظالم کہہ کر ہمارا خون بہایا ان کے خونی ہاتھ اس قابل نہیں کہ ان سے امن کا انعام وصول کیا جائے۔ نوبل انعام کی تاریخ کا یہ واحد ہیرو ویت نام جیسی غریب، مفلوک الحال اور پسماندہ قوم کو نصیب ہوا۔ اس پسماندہ اور غریب قوم کو جس نے ٹیکنالوجی کے غرور میں ڈوبی امریکی سپر پاور کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔

لی ڈیو تھو یاد آئے تو میرے جیسا خواب دیکھنے والا شخص پتہ نہیں کیوں سوچنے لگتا ہے کہ کاش ملالہ جسے پورا میڈیا عظمت کی بلندیوں پر دیکھ رہا ہے اچانک یہ اعلان کردے کہ میں ان خونی ہاتھوں سے نوبل انعام نہیں لوں گی جو ہر روز میری عمر کی معصوم بچیوں کو ڈرون حملوں میں قتل کردیتے ہیں۔ جس دن مجھ پر حملہ ہوا، اسی دن افغانستان میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں میری عمر کے تین معصوم بچوں کو قتل کیا گیا۔ چلیئے اسلام کے نام پر نہ سہی پشتون خون کی غیرت اور اس زبان کی حرمت کی خاطر ہی ملالہ یہ اعلان کردے کہ مت کرو میرے نوبل امن انعام کے لیے دستخط۔ تم پچاس کے قریب ملک میرے ہم زبان اور ہم نسل دس لاکھ انسانوں کے قاتل ہو۔ لیکن کیا کروں خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں، پورے تھوڑا ہوا کرتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

خشت اوّل چوں نہد معمار کج

1970ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست پر محمود خان اچکزئی کے والد خان عبدالصمد اچکزئی امیدوار تھے ۔انہیں جمعیت العلماء اسلام کے امیدوار مولانا عبدالحق نے شکست دے دی۔ صوبائی الیکشن میں ابھی تین دن باقی تھے۔پشتونوں کے حقوق کے علمبردار اس سیاسی رہنما کے لیے یہ ایک سانحے سے کم نہ تھا۔ قوم پرست سیاست کا خاصہ یہ ہے کہ یہ نسل اور زبان سے شروع ہو کر نچلی سطح پر قبیلے اور برادری تک جا پہنچتی ہے۔ عبدالصمد اچکزئی صوبائی اسمبلی کے بھی امیدوار تھے۔اچکزئی قبیلے کے لیے یہ زندگی موت کا مسئلہ بن گیا۔تو اچکزئی کے حاجی بہرام خان اچکزئی نے قبیلے کے تمام مشران (بزرگوں) کو جمع کیا اور سب کو "گوجن" اور "بادن" کے نسلی تعصب کی کہانیاں سناتے ہوئے قسم، قرآن اور دستار کا واسطہ دے کر قبائلی عصبیت کی بنیاد پر ووٹ مانگے۔ پشتون معاشرے میں قسم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عبدالصمد خان اچکزئی صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیت گئے۔حاجی بہرام خان اچکزئی اس قصے کو بہت تفصیل سے سنایا کرتے اور پھر آخر میں مسکراتے ہوئے کہتے سب غٹ غٹ (بڑی بڑی) باتیں کرتے ہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ قبیلے سے باہر کچھ بھی نہیں۔خان عبدالصمد اچکزئی کے ووٹروں کی اکثریت کو شاید ہی اس بات کا علم تھا کہ ان پارٹی کے نظریات کیا ہیں،وہ کن جمہوری اقدار پر یقین رکھتے ہیں،ان کا منشور کیا کہتا ہے۔

یہ صرف خان عبدالصمد اچکزئی یا ان کے فرزند محمود خان اچکزئی کے حلقے کی کہانی نہیں بلکہ اس ملک کے نوے فیصد سے زیادہ حلقوں کی یہی داستان ہے۔ان تمام حلقوں سے جیتنے والے جب قومی اسمبلی کے ایوان میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، تو ان کی باتوں سے انسانیت،جمہوری اقدار، برابری اور آزادیٔ رائے کے پھول جھڑ رہے ہوتے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ نسل، رنگ، زبان اور عقیدے کا تعصب ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ملکی مفاد کا ترانہ گاتے ہیں اور جمہوری نظام کے تحفظ کی قسمیں کھاتے ہیں۔اس طرح کا جمہوری نظام انہوں نے بڑی محنت سے تخلیق کیا ہے۔بار بار الیکشن میں جیتنے اور ہارنے کے بعد انہوں نے وسیع تجربے سے اپنے لیے محفوظ حد بندیاں بنالی ہیں۔علاقائی اور نسلی تعصب کی جڑوں کو گہرا کر لیا ہے۔لوگوں کے مخصوص مفادات ان لیڈروں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔اب یہاں کوئی نسل کا پرچم بلند کرے یا مذہب کا،انہی مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔جناب محمود خان اچکزئی کے حلقے کو ہی اگر مثال کے طور پر لے لیا جائے تو ان کے علاقے گلستان سے لے کر چمن تک اکثریت کا کاروبار سمگلنگ ہے۔وہاں کا ڈپٹی کمشنر لوگوں کو آٹا، چاول، چینی اور دیگر اشیاء کی راہداریاں جاری کرتا ہے۔یہ سلسلہ ڈیورنڈ لائن کے قائم ہونے سے جاری ہے۔انہی راہداریوں کی آڑ میں یہ تمام اشیاء افغانستان جاتی ہیں اور وہاں سے دنیا بھر کا سامان سمگل ہو کر کوئٹہ کی مارکیٹوں میں آتا ہے۔اس سارے معاملے پر "نظر" رکھنے کے لیے، ایف سی، کسٹم اور لیویز کی پوسٹیں قائم ہیں۔میں نے "نظر" رکھنے کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ کنٹرول کا تو تصور بھی وہاں نہیں دیکھا جا سکتا۔جب کبھی کسی سیاسی پارٹی کا جلسہ ہوتا تو چمن کے بازار سے سینکڑوں بسیں سمگلنگ کے سامان سے لدی ہوئی روانہ ہوتیں،اوپر پارٹی کا جھنڈا ہوتا اور چند سوار لوگ پارٹی کے نعرے لگاتے ہوئے جلسہ گاہ جاتے اور سامان کوئٹہ کی مارکیٹوں میں آرام سے پہنچ جاتا۔پورے علاقہ میں دو طرح کے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں۔ایک بڑے بڑے سمگلر جو حکومتی اداروں کے ساتھ مل کر یہ کام کرتے ہیں اور دوسرے، چھوٹی سطح پر مال ادھر سے ادھر کرنے والے۔جب کبھی ہڑتال ہوئی، جلوس نکلے تو مطالبات کی فہرست میں ایف سی چیک پوسٹوں کو ہٹانے کا مطالبہ ضرور شامل رہا۔سیاسی جلسوں اور عمومی سیاسی گفتگو میں بھی سمگلنگ کا جواز، غربت، پسماندگی اور روزگار کی عدم دستیابی کو بنایا جاتا۔قبائلی جھگڑے،مقامی نسلی عصبیتیں،سیاست کا بازار چمکاتی رہیں۔مارچ 1980ء میں جب میں بلوچستان پہنچا تو صوبے کی ہر دیوار پر پنجابی استعمار کے خلاف نعرے درج تھے اور ہر لیڈران کے خلاف زہر اگلتا تھا۔دونوں سیاسی جماعتیں جمعیت علماء اسلام اور پختونخوا ملی عوامی پارٹی اپنی طاقت کا محور جہاں علاقائی قبائلی تعصب کو سمجھتیں، وہیں افغانستان سے بھی اپنی حمایت کے لیے گروہوں سے تعلق استوار رکھتیں۔ محمود خان اچکزئی کا تعلق نجیب اللہ سے تھا اور جمعیت علماء اسلام افغان مجاہدین میں طاقت ڈھونڈتی تھی۔چمن کی سرحد کے پار افغانستان کے شہر سپن بولدک میں عصمت اللہ مسلم اچکزئی نے اغوا برائے تاوان کا مرکز قائم کیا ہوا تھا جسے وہ "قرار گاہ" کہتا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شہری اغوا ہوتا اور پھر وہ انہی قبائلی نما سیاستدانوں کے توسط سے رہا ہوتا۔ نجیب اللہ کی حکومت گئی تو افغانستان میں اس گروہ کی طاقت کا مرکز ختم ہو گیا۔ اب پاکستان سے امیدیں وابستہ کرنے کے دن تھے۔ایک نعرہ بلند کیا گیا۔وہ بولان تا چترال۔ پشتونستان (بولان سے چترال تک پشتونستان ہے) پنجابی تو وہاں بہت دور تھے لیکن بلوچوں کو خطرہ محسوس ہوا تو اکبر بگٹی، عطاءاللہ مینگل اور خیر بخش مری تمام رنجشیں بھلا کر اکٹھے ہو گئے۔سریاب روڈ پر اکبر بگٹی نے للکارتے ہوئے کہا "چترال پہ جو مرضی دعویٰ کرو مگر بولان کی جانب دیکھنا بھی مت"۔

بلوچستان کی صبحیں اور شامیں خون آلود ہونے لگیں۔ کوئٹہ میں کرفیو کا راج ہو گیا۔اس کے بعد طالبان کی حکومت قائم ہوئی تو افغان قوم کے اس عالمی اتحاد کے داعی کو پاکستان کی سیاست میں گزارا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے ایک گُر سیکھ لیا تھا کہ جمہوریت، عوام کی حکمرانی اور انسانیت کی سربلندی کے نعرے اس وقت بے معنی ہو جاتے ہیں اگر اپنا اچکزئی قبیلہ ساتھ نہ ہو۔اسی لئے آج ان کا قبیلہ نہیں بلکہ گھرانہ اقتدار کی نعمتوں سے سرفراز ہے۔ آج وہ اس کرم خوردہ، فرسودہ جمہوری نظام کے سب سے بڑے دعویدار ہیں کہ اس سے فوائد بھی انہیں کے خاندان کو حاصل ہیں۔

محمود خان اچکزئی کا ذکر اس لیے کیا کہ پنجاب اور دیگر صوبوں کے لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچستان کی سیاست پاکستان کے دوسرے خطوں سے مختلف ہے۔لوگ آج یہ تصور کر رہے ہیں کہ محمود اچکزئی صاحب اعلیٰ جمہوری اقدار کے علمبردار ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی اس ملک کی سیاست پر چھائے، چوہدریوں، لغاریوں، مزاریوں، پراچوں، ٹوانوں، بجارانیوں، زرداریوں، مخدوموں، خٹکوں، یوسف زئیوں، تالپوروں اور جاموں سے مختلف نہیں ہیں۔انہیں بھی اس ملک کا یہ جمہوری نظام بہت راس آتا ہے، جہاں اسمبلی کے ایوان، ٹی وی کے ٹاک شو اور اخبار کے انٹرویوز میں آپ کا بیان ایسے ہوتا ہے جیسے آپ اس ملک میں افلاطون کی جمہوریہ کے فلسفی بادشاہ کے تصور پر یقین رکھتے ہیں لیکن جب یہ سب سیاسی رہنما الیکشن لڑنے اپنے حلقوں میں جاتے ہیں تو لوگوں کو نسلی، قبائلی اور برادری کے نام پر تعصب کی چادر اوڑھا دیتے ہیں۔ گزشتہ بارہ انتخابات میں عوام اور ان سیاسی رہنماؤں کے درمیان یہ خلیج گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی ہے۔دھاندلی کے طریق کار میں مہارتوں کے نئے نئے ڈھنگ وجود میں آگئے ہیں۔لورالائی کے طاہر لونی الیکشن جیتے تو ان کے خلاف پٹیشن ہوئی۔اس میں ان کے قبیلے کے فوت شدہ لوگوں کے ووٹ بھی شامل تھے۔وہ اکثر لوگوں سے مذاقاً کہتے پھرتے "میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں اگر میں اپنے مردوں کو حکم دوں تو وہ اپنی قبروں سے نکل کر مجھے ووٹ دیں گے"۔پاکستان کی سیاست میں جمہوریت گزشتہ ساٹھ سال سے دھوکہ، فراڈ، تعصب اور دھونس کی بنیاد پر قائم ہے۔سیاستدانوں نے کامیابی کے دو شاندار گُر سیکھ لیے ہیں۔اقتدار کی اعلیٰ ترین مسندوں پر قریبی خاندان کے سوا کسی شخص پر بھروسہ نہ کرو اور اپنے خاندان کو ہی وہاں متمکن رکھو اور حلقے کی سیاست میں ووٹر کے ہر ناجائز مطالبے کو بھی جائز اور وہاں موجود بدترین تعصب کو بھی حق پر سمجھو۔دنیا پر ہزاروں سال ظالم ترین بادشاہوں کی حکومتیں قائم رہیں لیکن وہ بھی اپنے وزیر، مشیر، گورنر اہلیت کی بنیاد پر لگایا کرتے تھے۔خاندانی اور نسلی تعلق کی بنیاد پر نہیں۔ سعدی کا شعر ہے۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج

تاثریا می رود دیوار کج

اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دے تو دیوار بے شک ثریا ستارے تک لے جاؤ ٹیڑھی رہے گی۔جب تک یہ اینٹ سیدھی نہیں کی جاتی سو سال بھی یہ کرم خوردہ جمہوری سسٹم چلتا رہے، حقیقی قیادت سے مرحوم ہی رہے گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

خونِ خاک نشیناں (1)

بلوچستان میں پنجابیوں سے نفرت کا بیج کس نے بویا، کس کی سیاست نے اسے پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ کون لوگ تھے جنھوں نے وہاں بسنے والے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں یہ تصور پختہ کیا کہ اس مملکت خداداد پاکستان میں صرف پنجابی ہی ایسی قوم ہے جو تمہارے وسائل کو لوٹ رہی ہے اور تمہارے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ 1980 ء کے آغاز میں جب میں بلوچستان یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو یہ نفرت درودیوار سے عیاں تھی۔ کوئٹہ شہر چونکہ محمود خان اچکزئی صاحب کی پختونخواہ پارٹی کے کارکنوں کے نزدیکی علاقوں میں سے تھا، اس لئے شہر کی ہر دیوار پر ان کی پارٹی کی طرف سے "پنجابی استعمار" کے خلاف بڑے بڑے نعرے درج تھے۔ افغانستان میں روس کی افواج کو داخل ہوئے ابھی صرف چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اسی لیے وہاں سے افغان مہاجرین کی آمد کا سلسلہ بہت کم تھا۔ ابھی صرف کچھ بڑے بڑے دولتمند افغان کوئٹہ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ بلوچستان کے بلوچ علاقوں میں گھومتے ہوئے مجھے کبھی کسی دیوار پر "پنجابی استعمار" کے خلاف نعرے نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ لوگ جب بھی گفتگو کرتے وہ پنجابی کے خلاف ایک عداوت کا اظہار ضرور کرتے۔ لیکن بروہی علاقے میں یہ عداوت اور نفرت بہت واضح تھی۔ میں اکثر سوچتا کہ بلوچ علاقے جن میں نصیر آباد، مری، بگٹی، سبی، مکران اور لس بیلہ اور گوادر جیسے شہر موجود ہیں وہاں لوگوں میں اسقدر پنجابیوں سے نفرت نہیں پائی جاتی، جبکہ اکثر دیہی پشتون علاقوں میں بھی پنجابی سکون کے ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔ پھر کوئٹہ اور چند بروہی علاقوں میں نفرت شدید کیوں ہے۔ یہ نفرت بھی زیادہ تر سیاستدانوں کی تلخ گفتگو میں ملتی یا پھر یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ کی حد تک جو اپنے آپ کو بلوچستان کی آزادی کا ہراول دستہ سمجھتے تھے۔ روزمرہ زندگی میں، کاروبار کرتے ہوئے، پڑوس میں زندگی گزارتے ہوئے یہاں تک کہ کبھی کبھار رشتہ داری کرتے ہوئے بھی اس کا اظہار نہ ہوتا۔ لیکن جیسے ہی کسی میڈیکل کالج یا انجینئرنگ یونیورسٹی کی سیٹ کا مقابلہ ہوتا تو تین صدیوں سے رہنے والے پنجابی بھی خوفزدہ سے ہو جاتے۔ میں نے ان خوفزدہ پنجابی لڑکوں کو ان داخلوں میں انٹرویو کے وقت بار بار سہمے ہوئے دیکھا ہے۔ یہی حالت نوکریوں کے دوران انٹرویو یا امتحان میں ہوتی۔ لیکن جب یہ ملازم ہو جاتے تو ایک دوسرے میں شیر و شکر ہو جاتے۔ کوئٹہ کے رہنے والے پنجابی جو کئی پشتوں سے وہاں رہ رہے ہیں، ان کی اکثریت، پشتو، بروہی اور کسی حد تک فارسی ایسے بولتے ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہو۔ ان کے لباس، وضع قطع اور یہاں تک کہ کھانوں وغیرہ سے بھی آپ کو یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ یہ پنجابی ہیں۔ اس چوبیس سالہ عرصے میں جب میں وہاں مکین تھا، میں نے کسی ایک شخص کو بھی دھوتی کرتہ یا سر پر صافہ وغیرہ پہنے نہیں دیکھا۔ ان کی شادیوں تک میں بھنگڑا نہیں بلکہ پشتون ڈانس اتنٹر اور بلوچی ڈانس چاپ یا لیوا ہوتا تھا۔ وہ مخصوص کھانے جو پنجابیوں کیلئے مخصوص ہیں، نہ بازار میں میسر تھے اور نہ ان کے گھروں میں۔ چند پنجابی تھے جو کوئلے کی کانوں کے کاروبار کی وجہ سے بلوچستان کے پشتون اور بروہی علاقوں میں صاحب حیثیت اور مالدار نظر آتے، لیکن وہ بھی اپنا یہ کاروبار کسی علاقائی سردار، ملک، وڈیرے یا ٹکری کی آشیرباد اور مدد کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ پورے صوبے میں پنجابیوں کی اکثریت مزدوری کرنے والے افراد کی تھی جو پنجاب کی غربت اور بے روزگاری سے تنگ آکر وہاں رزق کمانے گئے تھے۔ ان میں حجام، مستری، مزدور، دھوبی، ترکھان، لوہار اور خاکروب شامل تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو بلوچستان کے وسائل پر قبضہ کرنے کی اہلیت اور استطاعت رکھتا ہو۔ ایک بہت بڑی تعداد ان اساتذہ کی تھی جو اپنے گھربار چھوڑ کر ایک مشن اور لگن کے ساتھ بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں مدتوں سے علم کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ ایسے علاقے جہاں پانی بھی میسر نہ تھا، جہاں بیمار پڑ جاؤ تو دوا بھی نہ ملتی تھی، وہاں یہ استاد ایک بوریا نشین درویش کی طرح اپنے گھربار سے دور بلوچ، بروہی اور پشتون بچوں کو پڑھا رہے ہوتے۔ آج آپ کسی پچاس ساٹھ سال کے بلوچستان کے پڑھے لکھے شہری یا دیہاتی شخص کے سامنے ان استادوں کا تذکرہ چھیڑو تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے، وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا ہم نے ان کو یہاں سے بھیج کر بہت بڑی غلطی کی۔ دوسری بڑی تعداد ان پنجابی نرسوں کی آج بھی وہاں موجود ہے جو ایسی جگہوں پر جاکر لوگوں کو صحت کی سہولیات فراہم کر رہی ہوتی ہیں جہاں بلوچ وزیراعلیٰ اور پشتون گورنر بھی شاید زندگی میں نہ گیا ہو۔ جہاں کوئی بلوچ، پشتون یا بروہی ڈاکٹر بھی عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ ان نرسوں کو ان علاقوں میں تنہا زندگی گزارنے کی وجہ سے جس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میں اسے بیان کرنے لگ جاؤں قلم سے سیاہی کی جگہ آنسو ٹپکنے لگیں۔ کیا یہ سب لوگ بلوچستان کے وسائل اور اقتدار پر قبضہ کرنے گئے تھے۔ اس کے باوجود پنجابی کو بلوچستان میں قابل نفرت کس نے بنایا کہ پاکستان میں 67 سالہ تاریخ میں شناختی کارڈ دیکھ کر لوگوں کو قتل کرنے کی رسم کا آغاز بلوچستان کے علاقے درہ بولان کے پیر غیب سے ہوا تھا۔

جن دنوں بلوچستان کے پشتون علاقوں میں محمود خان اچکزئی صاحب کی پشتونخوا پارٹی پنجابی استعمار کے خلاف نعرے لکھ رہی تھی، انہی دنوں افغان مہاجرین کی آمد کی وجہ سے بلوچ خوفزدہ تھے، اور انہوں نے دیواروں پر افغان بھگوڑوں کے خلاف نعرے لکھنے شروع کر دیئے۔ لیکن یہ افغان مہاجر اسقدر محنتی تھے کہ وہ پورے بلوچستان میں ایک سستے مزدور کی حیثیت سے مقبول ہو گئے۔ بلوچ اور بروہی علاقوں کی وہ بے آب و گیاہ زمینیں ان کی محنت سے آباد ہونے لگیں۔ گوادر سے لورالائی تک کوئی باغ ایسا نہ تھا جہاں یہ آباد نہ ہوئے ہوں۔ افغانستان سے آنے والے مال کے کاروبار پر ہزارہ برادری اور پشتونوں کی اجارہ داری تھی۔ کوئٹہ شہر میں یہ گنے چنے لوگ تھے جو اس کاروبار سے وابستہ تھے۔ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو چمن کی سرحد سے روزانہ ہزارہ برادری کے افراد اور پشتون کوئٹہ میں آکر آباد ہونے لگے، یہاں تک ہزارہ برادری کا اپنا ایک علاقہ ہزارہ ٹاؤن کی حیثیت سے کوئٹہ کے مغرب میں آباد ہو گیا جبکہ مشرق میں پشتون آباد کے نام سے مہاجر پشتونوں کا شہر آباد ہو گیا۔ پشتون اور ہزارہ یہاں کے لوگوں سے کاروباری اور خاندانی رشتوں کی وجہ سے ایسے ضم ہوئے کہ یہ تصور تک ختم ہو گیا کہ کون یہاں پانچ سال سے ہے اور کون پانچ سو سال سے کسی نے ان کو وسائل پر قابض، استعماری قوت یا ظالم کی حیثیت سے پیش نہ کیا۔ یہ الگ بات کہ ہزارہ ایک اور طرح کی قبائلی اور مسلکی جنگ میں الجھ کر مارے جانے لگے۔ لیکن پنجابی کا نام آج بھی وہاں نفرت کی علامت ہے۔ مدتوں اسے سرداروں نے نفرت کی علامت بتایا۔ وہ سردار جو اپنے زیرِ سایہ لوگوں کو آگ میں پھینک دیا کرتے تھے، (چاکر چاکرانی کا قصہ سب کو یاد ہو گا)۔ ان کی زبانیں مستقل یہی زہر اگلتی رہیں کہ پنجابی بلوچستان کے وسائل کو لوٹ کر یہاں قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یوں انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کے دلوں میں پنجابیوں کا خوف بٹھا کر ان کو مرغی کے چوزوں کی طرح پروں میں سمیٹ لیا اور اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔ اس لیے خواہ ایوب خان خیبر پختونخوا سے اور ذوالفقار علی بھٹو سندھ سے اقتدار میں آئے اور بلوچستان پر آرمی ایکشن کریں، گالی پنجابی کو دی جاتی رہی۔ وہ پنجابی جو نہ وہاں قبائلی طور پر منظم ہو سکتا تھا اور نہ ہی اس کی یہ روایت ایسی تھی۔ وہ تو اس دھرتی پر پنجاب کی غربت سے تنگ آکر مزدوری کرنے گیا تھا۔ (جاری ہے۔)

نوٹ: ایک صاحب جگر کی بیماری کی وجہ سے ایک مستقل اذیت اور غربت کا شکار ہیں۔ روزمرہ کی زندگی سے رشتہ جاری رکھنا بھی مشکل ہے۔ میں موبائل نمبر لکھ رہا ہوں۔ کوئی صاحب ان کی مدد فرما کر اللہ کے ہاں اپنا اجر محفوظ کر سکتے ہیں۔ 0333-4345147

KitaabPoint.blogspot.com

خون خاک نشیناں (2)

بلوچستان میں بسنے والے پنجابیوں کی اکثریت اگر مزدور پیشہ ہے' رزق کی تلاش میں بے گھر ہونے والے ہیں تو پھر انہیں اسقدر قابل نفرت کیوں بنا کر پیش کیا گیا کہ بندوقوں کا رخ ان ریاستی اداروں کی طرف نہیں ہوتا جن سے نفرت ہے بلکہ کسی دکان میں کام کرتے حجام' کسی بس میں سفر کرتے مسافر' یا کسی فیکٹری میں موجود مزدور کو پہچان کر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بلوچستان سے ہزاروں بلوچ اور پشتون پنجاب کے شہروں میں آباد ہیں۔ لاہور میں باقاعدہ پشتون خواہ ملی عوامی پارٹی کی تنظیم ہے جس کا سربراہ سلیم کاکڑ پشین کے نزدیک ایک گاؤں کلی فیضو کا رہنے والا نوجوان ہے۔ کیا ایسی کسی لسانی پارٹی کا تصور بھی کوئی پنجابی کسی دوسرے صوبے خصوصاً بلوچستان میں کر سکتا ہے۔ ہر بڑے شہر میں بلوچستان سے آئے ہوئے بلوچوں نے بلوچ سجی کے نام پر کھانے پینے کی دکانیں کھولی ہوئی ہیں' جہاں پنجابی انتہائی شوق سے جاتے ہیں۔ حاجی فیروز خان لہڑی اور اس جیسے بلوچ ٹرانسپورٹرز اور وہاب پیر علی زئی جیسے بلوچستان کے پشتون ٹرانسپورٹرز کی کئی سو بسیں اور ٹرک روز پنجاب کے علاقوں سے گزرتے ہیں اور انہیں ایک دن کیلئے بھی کسی سکیورٹی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ان میں روزانہ بلوچستان کے ہزاروں بلوچ' بروہی اور پشتون سفر کرتے ہیں۔ روزانہ ہزاروں ٹرک چمن اور تفتان کی سرحدوں اور بلوچستان کے باغات سے روانہ ہوتے ہیں۔ رحیم یار خان سے لے کر اٹک تک پھیلی سڑکوں پر بلوچستان سے آنے والے پشتون اور بلوچ افراد کے ہوٹل دن رات چلتے ہیں۔ یہ سب اس معاشرے میں عام آدمی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ تلاش رزق میں گھربار چھوڑنا کسقدر اذیت کی بات ہوتی ہے۔ میں جب بھی کسی ایسے سرراہ ہوٹل پر رکتا ہوں تو وہاں کام کرنے والے بلوچستان کے لوگوں سے مستونگ' کوئٹہ یا پشین کی بات چھیڑ دوں تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور دیر تک وہ وہاں کے قصے سنتے سناتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی حال بلوچستان جاکر رزق کمانے والے ان مزدوروں کا بھی ہو گا جو بار بار اس لئے مارے جاتے ہیں کہ ان کی زبان پنجابی ہے۔ نواب اکبر خان بگٹی کی محفل میں بیٹھے ہوئے ایک دفعہ اسی طرح پنجابی استعمار پر گفتگو طول پکڑ گئی۔ کہنے لگے بلوچستان میں پولیس کی اکثریت پنجابیوں کی ہے۔ میں نے کہا آپ نے استادوں کو واپس بھیجا تھا' اچھا ہوتا' استاد رکھ لیتے اور پولیس والوں کو واپس بھیج دیتے۔ کہنے لگے' ان کے رویے کی وجہ سے یہاں پنجابی کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے کہا یہ پنجابی پولیس جو پنجاب میں پنجابیوں کے ساتھ کرتی ہے اس کا یہاں سوچ بھی نہیں سکتی۔ پنجاب میں ان کے ظلم کے قصے بیان کئے جائیں تو لوگ ہلاکو اور چنگیز خان کو بھول جائیں۔ یہ تیس برس پرانی بات ہے' اب تو پولیس بھی بلوچ' بروہی اور پشتون لوگوں پر مشتمل ہے۔ پورے بلوچستان میں سب سے زیادہ غصہ ایف سی کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ کہ اسے ایک سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے عطاء اللہ مینگل کی حکومت سے سیاسی انتقام لینے کیلئے مرکز کے ماتحت کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے یہ مقامی انتظامیہ کے ماتحت ہوتی تھی۔ کرنل امان شاہ جو پشین کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بلوچستان میں ہوم سیکرٹری کے عہدے پر تعینات رہے' بتایا کرتے تھے کہ جب وہ ژوب ملیشیا کے کمانڈنٹ تھے تو وہاں کا مقامی تحصیلدار ان کی گشت کی ڈیوٹیاں لگایا کرتا تھا اور وہ اس پر عمل درآمد کرتے تھے لیکن عطاء اللہ مینگل کی سیاسی حکومت کو ناکام بنانے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو کا یہ پہلا سوچا سمجھا اقدام تھا۔ نفرت کی دوسری وجہ ان کا سمگلنگ کی روک تھام کی ڈیوٹی پر مامور ہونا۔ سمگلنگ بلوچستان کی معیشت میں ایک اہم کردار رکھتی ہے اور اس کا پورے ملک کی معیشت میں اتنا تھوڑا حصہ ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ وہاں کی بے روزگاری کو کم کرتی ہے۔ ایک عام آدمی چند ہزار روپے کی اشیا سمگل کر کے اپنا رزق بنا لیتا ہے۔ یہ ان سمندری راستوں اور ایئر پورٹوں پر براہ راست ہونے والی سمگلنگ سے انتہائی کم ہے۔ اسی اینٹی سمگلنگ ڈیوٹی نے ایف سی کو براہ راست عام آدمی کیلئے نفرت کی علامت بنایا۔ تیسری وجہ ذوالفقار علی بھٹو ہی کے زمانے میں 1974ء میں ہونے والے آپریشن میں ایف سی کا کردار تھا۔ یہ سارے کا سارا آپریشن ایف سی کے بل بوتے پر کیا گیا۔ مری علاقے میں کاہان سے کٹ منڈائی اور سانگان تک' درہ بولان' مستونگ کے لک پاس سے لے کر خضدار کے وڈھ تک ہر جگہ ایف سی نے پہاڑوں پر اپنے مورچے بنائے' قلعے تعمیر کیے' چیک پوسٹیں لگائیں۔ ایک سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم کی ذاتی انا اور سیاسی عدم برداشت نے بلوچستان کو آگ اور خون کی وادی میں دھکیل دیا۔ یہ بلوچستان پر پہلا سب سے بڑا آپریشن تھا۔ لیکن اس میں حصہ لینے والی ایف سی میں اس وقت بھی اور آج بھی غالب اکثریت پشتونوں کی ہے۔ وہاں مختلف یونٹوں میں کوٹہ مقرر ہے کہ اس میں کس قبیلے کے پشتونوں کو بھرتی کیا جائے گا۔ لیکن اس سب کے باوجود جب بھی در و دیوار پر گالی لکھی گئی تو وہ پنجابی استعمار کے خلاف' انتقام میں بندوق اٹھی تو پنجابی مزدور' خاکروب' نان بائی اور حجام پر۔ بے گھر اور بے دخل بھی وہی ہوئے۔ مستونگ میں زمرد خان 1974 کے آپریشن میں بلوچ اور پشتون رہنماؤں کے ساتھ شانہ بشانہ تھے' تمام صعوبتیں' تشدد اور جیلیں انہوں نے برداشت کیں۔ ان کا قلات پبلشرز تمام بلوچ رہنماؤں کی سیاسی سرگرمیوں کا جناح روڈ کوئٹہ پر مرکز تھا۔ وہ اور ان کے بھائی صدیق صاحب مستونگ کی خاک میں دفن ہوئے لیکن آج ان کا خاندان اپنا گھربار چھوڑ کر لاہور میں ایک کرائے کے مکان میں تلاش رزق کیلئے رہ رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس پشتون' بلوچ یا بروہی شخص کو اپنے دشمن قبیلے سے مارے جانے کا خوف ہوتا ہے تو وہ بلوچستان سے دور پنجاب کے شہروں میں آرام اور سکون سے رہ رہا ہوتا ہے۔ کون ہے جس نے اس خوف میں پناہ کے دن پنجاب کے شہروں میں نہیں گزارے۔ کیا کوئی پنجابی یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ اپنے دشمنوں سے بچنے کیلئے کسی دور دراز بلوچ یا پشتون علاقے میں بے خوفی سے رہ سکے۔

بلوچستان کے معاملے پر اور بلوچوں کے حقوق پر میں گزشتہ دس سال سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے ان کے قبائلی پس منظر میں بے شمار ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ میں ان کی جدوجہد کو گزشتہ ساٹھ سال کی زیادتیوں کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ لاپتہ افراد کا سلسلہ صرف بلوچستان تک محدود نہیں۔ پنجاب' خیبر پختونخوا اور سندھ کا کون سا علاقہ ہے جہاں سے لوگ نہ اٹھائے گئے اور پھر سالوں ان کا پتہ تک نہ چلا ہو۔ خیبر پختونخوا میں تقریباً تیرہ سے زیادہ علاقوں میں فوجی آپریشن ہوا۔ آپریشن کرنے والوں کو بھی معلوم ہے کہ مخالف کون ہے اور جن کے خلاف آپریشن ہو رہا ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ مقابل پہ کون ہے۔ لیکن بلوچستان میں ایسا کیوں ہے بلکہ صرف بلوچستان میں ہی نہیں ہر صوبے میں ایسا ہے کہ گالی پنجابی کو دی جاتی ہے۔ اس سے پہلے یہ گالی مغربی پاکستان کو دی جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں کوئی پنجابی کی بات نہیں کرتا تھا' سب مغربی پاکستان کو استعمار کا نام دیتے تھے۔ یہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ تمام قوموں کے پسے ہوئے' غریب' مفلوک الحال اور ظلم سہتے ہوئے لوگ ایک دوسرے کے دکھ جان کر متحد نہ ہو جائیں۔ یہ متحد ہو گئے تو ان چودھریوں' وڈیروں اور سرداروں کا کیا بنے گا جن کی سیاست کی بنیاد ہی نفرت ہوتی ہے جو ایک نسل' علاقے یا قبیلے کا خوف اور نفرت پیدا کر کے اپنے قبیلے کو خوفزدہ رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کے پروں کے نیچے متحد ہو جائیں۔ کیا یہ وہی سردار نہیں جو یکم جنوری 1876ء میں خان آف قلات کے دربار میں رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ مل گئے تھے تو خان آف قلات کے ساتھ صرف اس کے بیٹے اور دو سردار رہ گئے تھے۔ آج یہ بلوچستان کے حقوق کے علمبردار ہیں۔ خوف سے سہما بلوچ اور پشتون صدیوں سے ان کے ظلم سہتا رہا اور اب ان کے اقتدار کو طول دینے کیلئے اپنے جیسے غریب لوگوں پر بندوق تانتا ہے۔ کل اگر کوئی اور رابرٹ سنڈیمن آ گیا تو کیا یہ کردار پوری قوم کا سودا نہیں کریں گے۔

(ختم شد)

KitaabPoint.blogspot.com

خونی چاند، اسرائیل اور مسلمان

"یہ صرف ایک کتاب نہیں ہے جس کے مندرجات نیویارک ٹائمز میں چھپے ہیں تو شور شروع ہو گیا ہے۔ کارلوٹا گیل (CarlottaGall) کی یہ کتاب جس میں اس نے ایک افسانوی انداز سے پاکستان کی حکومت خصوصاً فوج کا تعلق اسامہ بن لادن کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئٹہ کی گلیوں اور بازاروں میں جس طرح اُس نے طالبان کی ٹریننگ اور بھرتی کے افسانے تراشے ہیں، اس پر اس ملک کے شہروں اسلام آباد، لاہور اور کراچی کے دانشور تو شاید یقین کر لیں لیکن بلوچستان کے قبائلی معاشرے میں بسنے والے لوگ جہاں ذرا سی آمدورفت لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہتی ہو، جس معاشرے کے بارے میں آج بھی لوگ اعتماد سے کہتے ہیں کہ وہاں نہ قتل چھپ سکتا ہے اور نہ چوری، وہاں کے رہنے والے یہ کہانی پڑھیں یا تصویریں دیکھیں تو انہیں ہنسی آئے۔ لیکن اس کتاب کو یقین کی طرح پھیلانے والوں کی کمی نہیں، پوری دنیا کا میڈیا جن لوگوں کے کنٹرول میں ہے وہ یہ کہانی یہاں ختم نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ تو ایک آغاز ہے۔ یہ آغاز کیوں ہے۔ اس کا جواب ہر اُس شخص کو آسانی سے مل سکتا ہے۔ جو گذشتہ دو یا تین سالوں سے اسرائیل اور امریکہ میں موجود طاقتور ترین صہیونی لابی کے 2014 میں آنے والے دنوں کے خواب اور اس حوالے سے دنیا بھر میں پھیلائے جانے والے پراپیگنڈے کو جانتا ہو۔ اسرائیلی اور امریکی میڈیا ان آنے والے دنوں کی پیش گوئیوں سے بھرا پڑا ہے۔

ان پیش گوئیوں کا آغاز وہ یہودیوں کی مقدس کتاب تالمود سے کرتے ہیں۔ تالمود کے مطابق، "جب چاند گرہن لگتا ہے تو یہ بنی اسرائیل کے لیے یہ ایک بُرا شگون ہوتا ہے لیکن اگر چاند کا چہرہ ایسے سرخ ہو جائے جیسے خون تو سمجھو دنیا پر تلوار آ رہی ہے"۔ دنیا بھر کے یہودی گذشتہ دو ہزار سالوں سے ان چاند گرہنوں کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہودیوں میں تصوف کی ایک بہت بڑی تحریک ہزاروں سال سے ہے جسے قبالہ کہتے ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کا علم زبانی طور پر منتقل کیا جاتا رہا لیکن پھر وہاں تصوف کے لٹریچر نے جنم لیا اور تین کتابیں "باہیر" "سفر رازیل حمالخ" اور "ظہر" لکھیں گئیں اور آج بھی یہ اس سلسلۂ تصوف "قبالہ" کی رہنما تصانیف مانی جاتی ہیں۔ حروفِ ابجد اور الفاظ کے اعداد نکالنے کا سلسلہ بھی ان کے ہاں رائج ہے بلکہ ہمارے ہاں بھی حروفِ ابجد بالکل وہی ہیں جو ان کے ہاں ہیں۔ یہودی علم نجوم سے دور رہتے ہیں لیکن چاند اور سورج کے گرہنوں کے دوران ہونے والی زمین پر تبدیلیوں کا مطالعہ اپنی مقدس کتابوں کی روشنی میں ضرور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ میں جب کبھی چار خونی چاند گرہن ایک ترتیب میں آئے ہوں تو پھر بنی اسرائیل کے لیئے ایک ایسی آفت کا آغاز ہوتا ہے جس میں یقینی فتح پوشیدہ ہوتی ہے، اور آخر فتح ہو ہی جاتی ہے، اور ایسا تاریخ میں بار بار ہوا ہے۔ اس سارے عمل کو وہ "ایلی" یعنی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی جانتے ہیں۔ خونی چاند گرہن، مکمل چاند گرہن کو کہا جاتا ہے جب چاند زمین کے سائے میں چھپ جانے کی وجہ سے بالکل سرخ رو ہو جاتا ہے۔ یہ چار مسلسل چاند گرہن گذشتہ پانچ سو سالوں میں صرف تین مرتبہ آئے ہیں۔ ان کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہ خونی چاند کسی نہ کسی یہودی مذہبی دن کے دوران ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گذشتہ صدیوں میں یہ دو یہودی مذہبی دنوں میں مسلسل رونما ہوتے رہے ہیں، اور اب 2014 میں دو دفعہ اور 2015 میں پھر دو دفعہ مسلسل انہی دنوں میں رونما ہوں گے۔ گذشتہ پانچ سو سالوں کی تاریخ میں پہلی دفعہ 93-1492 میں ایسا ہوا اور بنی اسرائیل پر آفت آئی۔ سپین کو ازابیلا اور فرڈیننڈ نے فتح کیا اور پھر یہودیوں پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی۔ قتل کیے گئے، غلام بنا لیے گئے، زبردستی عیسائی مذہب اس طرح قبول کروایا گیا کہ سؤر کھانا لازمی قرار دیا گیا اور ہفتہ کے دن کاروبار کرنا بھی۔ لیکن اسی دوران کولمبس نے امریکہ دریافت کر لیا جسے یہودی اپنے لیئے "ایلی" یعنی اللہ کی طرف سے ایک فتح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہودی وہاں جا کر آباد ہوئے اور آج وہ اس کی سیاست، معیشت اور میڈیا پر قابض ہیں۔ دوسری دفعہ ایسے چار خونی چاند گرہن 50-1949 میں ظہور پذیر ہوئے۔ اسرائیل وجود میں آ چکا تھا اور ڈیوڈ بن گوریان کی حکومت بن چکی تھی۔ اس حکومت کے خلاف سات عرب ممالک کی افواج متحد ہو کر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت اسرائیل ایک نوزائیدہ ملک تھا اور مغرب سے یہودی اور قتل عام سے بھاگ کر یہودی یہاں آباد تھے۔ اسرائیل کے پاس صرف ایک ٹینک تھا لیکن قوم پرستوں عربوں کے پاس دو سو ٹینک تھے۔ اسرائیلی یہ سمجھتے ہیں کہ "ایلی" نے انہیں قوم پرست، روس نواز عربوں پر فتح دی۔ تیسری دفعہ یہ چار خونی چاند 68-1967 میں طلوع ہوئے۔ اس دوران مشہور عرب اسرائیل معرکہ تھا۔ ایک جانب قوم پرست اور کمیونسٹ نواز عرب تھے جنہیں روس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اسرائیل کی آبادی 8 لاکھ تھی اور عرب 5 کروڑ۔ چار ملک مصر، شام لبنان اور اردن نے حملہ کیا۔ روس نے دو ارب ڈالر کا اسلحہ فراہم کیا۔ یہ وہ جنگ تھی جس میں مصر کے سیکولر حکمران جمال عبدالناصر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اے فرعون کے بیٹو! آج تمہارا موسیٰ کے بیٹوں سے مقابلہ ہے۔ اپنی تاریخی شکست کا بدلہ چکا لو" ان تمام نہاد مسلمان اور قوم پرست سیکولرز نے دراصل اللہ کے دشمن کا نام لے کر اللہ کی غیرت کو للکارا تھا۔ دوسری جانب امریکہ اسرائیل کی مدد کو آیا اور دو ہزار سال بعد یروشلم کا مقدس شہر یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

گذشتہ دو سال سے یہودی ان آنے والے چار خونی چاند گرہنوں کا انتظار کر رہے ہیں اور پورے اسرائیل کے معبدوں میں مستقل دعائیں اور دیوار گریہ پر عبادت ہو رہی ہے۔ ان میں پہلا خونی چاند گرہن 15۔ اپریل 2014 کو لگے گا، اس دوران یہودیوں کا مشہور تہوار "پدش" جسے انگریزی زبان میں (Passover) کہتے ہیں وہ ہو گا۔ یہ سات دن تک چلتا ہے۔ اس دوران یہودی مخصوص روٹی پکاتے اور معبد کے سامنے قربانی کرتے ہیں۔ دوسرا خونی چاند گرہن 8 اکتوبر 2014 کو لگے گا اور اس دوران یہودیوں کا مشہور مذہبی دن سکوٹ ہو گا جسے انگریزی میں (FeastofTabernacle) کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کے آخر میں یوم کپور آتا ہے۔ یہ یہودیوں کی مصر سے صحرائے سینائی طرف روانگی اور پھر چالیس سال تک وہاں اللہ کے عذاب میں بھٹکنے کی یاد میں ہے۔ تیسرا خونی چاند 4۔ اپریل 2015 کو طلوع ہو گا اور یہ "پدش" کے دنوں میں ہو گا اور چوتھا خونی چاند 28 ستمبر 2018 کو ہو گا اور یہ سکوٹ کے دنوں میں ہو گا۔ پوری عالمی یہودی برادری یہ تصور کر رہی ہے۔ کہ یہ اسرائیل کے لیئے کسی جنگ کا آغاز ہو گا جس کے آخر میں فتح ہو گی۔ ان کے اخبارات، رسائل اور میڈیا اس سارے عمل کو "(TragedyandthenTriumph) کہتے ہیں۔ یعنی "غم واندوہ کے بعد کامیابی" اس سارے پس منظر میں دنیا بھر کا یہودی میڈیا بلکہ مغربی میڈیا جو ان کے قبضے میں ہے، تمام عرب ممالک میں آنے والی عرب بہار کو مسلم امہ کی خوفناکی سے تعبیر کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اب عرب دنیا پورے عالم کے لئے ایک خطرہ بن چکی ہے۔ اس دوران وہ یہ بھی پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ امریکہ اب دنیا میں امن قائم کرنے کے قابل نہیں رہا اور اسرائیل کو خود آگے بڑھ کر اس عالمی دہشت گردی کو روکنا ہو گا۔ مسلمانوں سے جنگ کے راستے میں سب سے زیادہ کھٹکنے والی چیز پاکستان کا ایٹمی پروگرام ہے۔ اس کے خلاف ایک منظم مہم کا آغاز بہت دیر سے شروع تھا لیکن اب آنے والے دنوں میں شدت لائی جائے گی۔ عربوں کی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر حملوں کی تیاریاں ہیں۔ کیونکہ یہودیوں کی اکثریت یہ یقین کرتی ہے کہ اب ان کی عالمی حکومت قائم ہونے کے دن آ گئے۔ یہ وہی حکومت ہے جسے سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال کے ظہور سے تعبیر کیا ہے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا "دجّال کا ظہور اس وقت ہو گا جب مساجد میں اس کا ذکر ختم ہو جائے گا" کیا ہم پھر اس خطرے کا مقابلہ فرعون کی اولاد، قریش کی قوم، سائرس اعظم کی نسل اور موہنجوداڑو کے وارثوں کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر شکست ہمارا مقدر۔ اس لیے کہ میرے اللہ کا وعدہ صرف اپنے بندوں کے ساتھ ہے رنگ نسل، زبان اور علاقے کے بندوں کے ساتھ نہیں۔" (یہ کالم 22۔ مارچ 2014ء کو شائع ہوا)

اس کالم کی اشاعت کے بعد کتنے ہاتھ تھے جو میرے گریبان تک آ گئے۔ کسی نے توہم پرستی کا طعنہ دیا اور کسی نے مذہبی تعصب کا، کوئی دقیانوس، فرسودہ اور غیر حقیقی تجزیہ نگار ہونے کا لیبل لگاتا رہا۔ لیکن یہودیوں نے اپنی مذہبی علامتوں کے مطابق جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ جنگ ہم کو لڑنا ہی پڑے گی۔ یہ اس امت کا مقدر ہے۔ یہ ریلیوں، بلے کارڈوں، اور ٹاک شوز کی جنگ نہیں ہو گی۔ یہی وہ معرکہ ہے جو اس دنیا میں حق و باطل کا آخری فیصلہ کر دے گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

کیا ہم نے قرآن کو چھوڑ نہیں دیا

بخشش اور شفاعت کے طلبگار رمضان کے اس آخری عشرے میں رات دن آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ اپنے گناہوں سے استغفار بھی کرتے ہوں گے اور نار جہنم سے آزادی کی دعائیں بھی۔ مسجدیں اعتکاف کرنے والوں سے آباد ہو چکیں ہیں۔ ایک اہتمام ہے جو ہر رمضان بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے میں لوگوں کا عبادات کے ساتھ تعلق دیکھ رہا ہوں۔ ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسجدوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی وسعت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جہاں کبھی تنکوں کی بنی ہوئی صفیں ہوتی تھیں' وہاں اب دبیز قالین بچھے ہوئے ہیں۔ کچے گارے اور اینٹوں سے بنی ہوئی گاؤں کی مسجدوں پر بھی خوبصورت ٹائلیں' سنگ مرمر اور آرائشی میناکاری نظر آتی ہے۔ مسجد میں جہاں کبھی پنکھے بھی میسر نہ تھے اب وہاں نمازیوں کی سہولت کے لئے ائر کنڈیشنڈ لگے ہوئے ہیں۔ یہ حال اور یہ جذبہ شوق صرف مسجدوں تک ہی محدود نہیں' جس شہر میں کبھی ایک یا دو ایسے اللہ کے برگزیدہ بندے ہوا کرتے تھے جن کی قبریں مرجع خلائق ہوتی تھیں' ان پر عقیدت مندوں نے مزار تعمیر کیے ہوئے تھے' اب ان میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ آپ کو ہر دوسرے موڑ پر ایک گنبد ایسا نظر آ جائے گا اور شہر میں کسی نہ کسی عرس کے اشتہار بلکہ رکشوں پر فلیکس ضرور دکھائی دیں گے۔ آپ اگر کسی بھی شہر میں ایسی تقریبات جن میں عرس' محافل میلاد' محافل نعت کی فہرست مرتب کریں تو یہ آپ کے لیے ممکن ہی نہیں ہو گا کہ سب کی سب میں شرکت کر سکیں۔ نعت خوانوں کی قدر و منزلت اور عزت افزائی کا یہ عالم ہے کہ لوگ ان کو ثناخواں مصطفٰے سمجھتے ہوئے ان پر دولت نچھاور کر رہے ہوتے ہیں۔ اہل بیت رسولؐ کے محبت کے مظاہرے بھی اب دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی تعداد میں ہی اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ ان میں شرکت کرنے والوں میں بھی اور اسے منانے کی شدت بھی دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ شہر بھر میں صرف دسویں محرم کا جلوس عزاداری نکلتا تھا جسے پورا شہر دورویہ کھڑے ہو کر اور عورتیں بچے چھتوں سے دیکھا کرتے تھے۔ باقی جلوس بڑے شہروں میں ہی ہوا کرتے۔ لیکن اب تو ہر بستی اور قریے میں غم حسینؓ بھی منایا جاتا ہے اور شہادت علیؓ کے جلوس میں بھی آنکھیں آنسوؤں سے تر کی جاتی ہیں اور سینہ غم گساری میں ماتم کناں۔ یہی حال مجالس کا ہے' آپ ان کی فہرست مرتب کریں تو آپ کو کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی حوالے سے کوئی مجلس ضرور میسر آ جائے گی جہاں آپ اہل بیت رسولؐ سے اپنی محبت اور مودت کا اظہار کرنے کے لئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد میں بھی ان سالوں میں کثیر اضافہ ہوا ہے جو گلیوں' بازاروں اور محلوں میں گھوم پھر کے لوگوں کو دین کی اصل اساس کی طرف لوٹنے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اکا دکا جماعت کبھی کبھار کسی محلے کی مسجد میں پڑاؤ ڈالتی اور لوگوں کو مغرب کی نماز کے بعد ایک ایسے بیان کی طرف دعوت دیتی جس میں دنیا و آخرت کا نفع اور بھلائی ہو۔ آج آپ کو یہ روزمرہ کا معمول نظر آتا ہے۔ کبھی صرف ایک مقام پر سالانہ اجتماع ہوتا تھا' اب ایسے کئی سالانہ اجتماع ملک کے ہر شہر میں نظر آتے ہیں۔ تحمل اور بردباری کا نمونہ یہ لوگ اب اپنی لگن میں تیز اور تعداد میں زیادہ بلکہ کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ بلکہ پہلے تبلیغ صرف ایک مسلک تک محدود تھی اب یہ راستہ دوسرے مسالک نے بھی اختیار کر لیا ہے اور ان کے بھی اجتماع ہوتے ہیں اور وفود اور جماعتیں گلی گلی کوچہ نکلتی ہیں۔ سنت رسولؐ پر عمل کرنے کے دلنشین منظر عماموں' مسواکوں' خوشبوؤں اور داڑھیوں کی تراش خراش سب کچھ اب زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں۔ لوگوں کا مذہب کے ساتھ جذبہء شوق و عقیدت دیکھتے ہوئے دنیا بھر کی کمپنیاں اپنا مال بیچنے آ پہنچتی ہیں۔ ایک رنگا رنگی اور گہما گہمی ہے' عقیدتوں کے پھول نچھاور ہو رہے ہیں' علماء مذہبی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کر رہے ہیں' طرح طرح کے پکوان پک رہے ہیں' ایک پر کیف فضا ہے جس میں کمپنیوں کے تحائف کی بھی تقسیم ہو رہی ہے' اشتہارات والے وہیں آتے ہیں جہاں کشش محسوس ہو اور پورے سال میں سب سے زیادہ مال رمضان کی نشریات پر لگایا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ اور بڑی اشتہاری مہم رمضان کی نشریات میں چلائی جاتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ لوگ ان نشریات کو دیکھتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں ورنہ کون بے وقوف ہے جو اپنا سرمایہ ان نشریات پر صرف کرے۔

اس ساری رنگا رنگی اور گہما گہمی کے باوجود' مذہب اور دین سے لگاؤ کے ان عملی مظاہر کے باوصف' مساجد کی بہتات' تزئین' محافل و مجالس کی کثرت اور لوگوں کی دین کے ساتھ وابستگی میں اضافے کے باوجود اس امت پر ادبار کی کالی گھٹا چھائی ہے۔ ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہے' جو چاہتا ہے گزرتے گزرتے دو میزائل داغ جاتا ہے' چند لوگوں کو قتل کر جاتا ہے۔ ایک تماشہ گاہ ہیں ہم لوگ' ایک کھیل ہیں کہ ہر کسی کو ہمارے ساتھ کھیلنے میں لذت ملتی ہے۔ کچھ دن ہم نے اس پر چیخ و پکار کی لیکن اب ہماری بے حسی بھی عروج پر ہے۔ امت مسلمہ میں چودہ سو سالوں میں کبھی اتنی بے حسی نہیں تھی جتنی آج ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا کہ اس امت کے ایک علاقے میں ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے جا رہے ہوں اور دوسری جانب لوگوں کے روزمرہ معمولات تو دور کی بات عیش و عشرت اور رنگا رنگی میں بھی فرق نہ آئے۔ کہا جاتا ہے امت مسلمہ کہاں ہے' اب تو سب کو اپنے اپنے ملک کی پرواہ کرنا چاہئے۔ کیا ہم اپنے ملک میں ہی سہی' کسی دوسرے انسان پر ظلم کی پرواہ کرتے ہیں۔ غزہ میں شہید ہونے والے معصوم بچے اور عورتیں تو بہت دور ہیں۔ کراچی' لاہور' کوئٹہ اور پشاور میں کسی بھی حادثے میں مرنے والوں کے سوگ میں صرف اس کے عزیز و اقارب ہی اشک کناں ہوتے ہیں۔ ہر قوم' قبیلے اور مسلک کے لوگ اپنے مرنے والوں کا ماتم کرتے ہیں' اپنی مظلومیت پر نوحہ کرتے ہیں۔ امت مسلمہ کا نوحہ پڑھنا تو اب دور کی بات ہے اب آپ ان ریاستوں میں جو مغرب نے سو سال پہلے تخلیق کی تھیں آپ کو وہاں قومیت کے حوالے سے دکھ کا اظہار بھی نظر نہیں آئے گا۔ کیا شام میں علوی کسی سنی یا شیعہ کی موت کو اپنا دکھ سمجھتا ہے' کیا عراق' مصر' لیبیا' سعودی عرب کسی ایک ملک میں بھی صرف قوم کے نام پر ہی سہی ہمارے درد مشترک ہیں۔ ہماری حالت عرب کے ان بدوؤں کی طرح ہے جو زمانہ جاہلیت میں قوم' قبیلے اور برادری میں تقسیم تھے بس ہم نے اس میں مسلک کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ امت مسلمہ کا نوحہ پڑھنا اب صرف چند دقیانوسی اور فرسودہ نوحہ گروں کا مقدر رہ گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ جس قدر دین سے محبت کے مظاہر میں اضافہ ہوا ہے ہماری ذلت و رسوائی میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوا ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم جس کو دین سمجھ کر اپنی پوری زندگی اس سے وابستہ کر لیتے ہیں وہ دین نہیں بلکہ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ پوری عمارت الحاد کی اینٹوں اور سود کی معیشت سے استوار ہو، اس کی بنیادوں میں قوم پرستی ،باطل اور طاغوت سے محبت کا گارا اور سیمنٹ لگا ہو تو اس کی آرائش اور اس پر چھڑکی جانے والی خوشبو اس کے اندر کی بدبو نہیں مٹا سکتی۔ ہم ایک سڑاند زدہ بدبودار معاشرہ بن چکے ہیں۔ ایسے معاشرے اسی طرح ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔ رات بھر کھڑے عبادتوں میں ہم مظلوم کی مدد اور ان کے حق میں جہاد کی آیتیں پڑھتے ہیں لیکن ہمارے قدم ان کی مدد کو نہیں اٹھتے۔ ہم اس رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قیامت کے روز شفاعت کے طلبگار ہوں گے جس کی امت کو ہم نے رنگ، نسل، زبان، علاقہ اور مسلک کے نام پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ رمضان کی راتوں اور آخری عشرے کی عبادات میں ہم بخشش اور شفاعت کے طلبگار ہیں۔ لیکن قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ روز قیامت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمارے خلاف ایک مقدمہ تیار کر رکھا ہے۔ سورۃ فرقان میں اللہ قیامت کے دن کی منظر کشی کرتے ہوئے آخر میں فرماتا ہے "اور رسول کہیں گے! اے میرے رب یہ ہے میری قوم جو اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنا کر چھوڑ بیٹھی تھی" (الفرقان 30)

کیا ہم نے قرآن کو چھوڑ نہیں دیا۔ اپنے سیاسی، معاشی، ثقافتی، خاندانی اور معاشرتی نظام پر ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شفاعت کے طلبگار رسول اللہ کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔ کون ہے جو سامنا کر سکتا ہو۔ سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

KitaabPoint.blogspot.com

کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں

دنیا میں کسی بھی یونیورسٹی کے بزنس ایڈمنسٹریشن کے کورس کی بنیادی کتاب اٹھالیں، آپ کو تجارت کا پہلا اصول جو کاروبار کی دنیا میں آنے والے ہر شخص کو پڑھایا جاتا ہے، وہ یہی ملے گا کہ ''خریدار بادشاہ ہوتا ہے'' "Consumer is the King"۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس پر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اور تجارت کی عمارت کھڑی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے دکاندار سے لے کر بڑی سے بڑی ملٹی نیشنل کمپنی تک سب کے سب خریدار کے ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔ ایک عام سے کپڑا بیچنے والے دکاندار کے پاس بھی اگر کوئی خاتون چلی جائے، پورا گھنٹہ وہ طرح طرح کے تھان کھلوا کر دیکھتی رہے اور بعد میں کہہ دے کہ مجھے ان میں سے کچھ بھی پسند نہیں آیا تو دکاندار ماتھے پر بل نہیں ڈالے گا۔ ممکن ہو تو اس کی پسند کی تفصیلات پوچھ لے گا اور وعدہ کرے گا کہ آئندہ آمد پر ممکن ہوا تو وہ ایسا ہی کپڑا لانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ کاروبار کا یہ وہ بنیادی اصول ہے کہ جس کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی سے بڑی تجارتی کمپنیاں پہلے کسی ملک، شہر یا علاقے میں عوام کی خواہشات اور ترجیحات کا سروے کرتی ہیں اور پھر اس کے مطابق اپنی مصنوعات کو ڈھال کر مارکیٹ میں لاتی ہیں۔ اگر انہیں کسی ملک، علاقے یا شہر میں کوئی ایسی چیز بیچنا ہو جس سے لوگ بالکل نا آشنا ہوں، انہیں کسی طور پر بھی اس کی عادت نہ ہو تو پھر ان کمپنیوں کا یرغمال میڈیا طرح طرح کے ہتھکنڈوں کے ذریعے لوگوں میں اس کا تجسس پیدا کرتا ہے۔ لوگ اسے حیرانی سے دیکھتے ہیں اور جب وہ چیز مارکیٹ میں آجاتی ہے تو اسے استعمال کی خواہش انہیں خریدنے پر مجبور کرتی ہے۔ عموماً ایسی چیزیں پہلے فلموں اور ڈراموں کے ذریعے ایک طرز زندگی کے طور پر متعارف کروائی جاتی ہیں، جیسے ٹشو پیپر، موبائل فون، شیمپو، آراستہ ڈرائنگ روم، مشروبات اور ملبوسات وغیرہ۔ پھر ان ڈراموں اور فلموں کو کثیر رقم والے اشتہارات دے کر ٹیلی ویژن سکرین پر مقبول عام کا درجہ دلوایا جاتا ہے، ان اشتہاروں میں عورت کے بے دریغ استعمال سے لے کر لوگوں کی محبوب شخصیات تک سب کو یہ چیزیں استعمال کرتے دکھایا جاتا ہے۔ یوں خریدار جو بادشاہ ہوتا ہے، اس کے اندر ایک حس طلب جاگ اٹھتی ہے۔ وہ ایسی چیزوں کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ انہیں خریدتا ہے اور پھر اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی نے سوچا تھا کہ دس سال قبل موبائل فون کے بغیر زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تیس سال بعد ٹشو پیپر کے بغیر گزارا ممکن نہ ہوگا یا پھر بیس پچیس سال پہلے کھانے کے ساتھ مشروبات نہ ہوں تو کھانا اچھا نہیں لگے گا۔ چائے اور سگریٹ کا آغاز تو اس زمانے کے محدود میڈیا کا حیران کن کارنامہ تھا۔ لوگ اس کڑوے، گرم اور بدذائقہ مشروب سے آشنا ہی نہ تھے اور آج یہ ہر محفل میں فوری پیشکش کے طور پر حاضر کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ جب ان چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو خریدار جو بادشاہ ہوتا ہے، اس کے ناز نخرے اٹھانے کے لئے ان میں طرح طرح کی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ ان اشیا کو خوشنما، خوش رنگ اور خوش ذائقہ بنایا جاتا ہے۔ یہ سارا کھیل اس لئے کھیلا جاتا ہے کہ خریدار بادشاہ کی جیب سے سرمایہ نکال کر اپنی جیب میں ڈالا جائے۔

یہ کاروباری دنیا اور سرمایہ دارانہ نظام جہاں ٹیکنالوجی کی بنیاد پر آگے بڑھ رہا ہے، وہاں اس کا سب سے بڑا سہارا اور اس کی ترقی کی اساس خریدار یعنی Consumer پر ہے۔ ان کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنے قبضے میں کرنے کی دوڑ ہے، جس میں اس وقت دنیا کا ہر بڑا سرمایہ دار پڑا ہوا ہے۔ ان بڑے سرمایہ داروں کا جمگھٹا ملٹی نیشنل کمپنیوں کی صورت دنیا کے وسائل پر قابض ہے۔

دنیا کی پوری تجارت پر چالیس ہزار ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ ان میں دو سو ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسی ہیں جن کی مشترکہ فروخت 8 کھرب ڈالر ہے جو کہ دنیا کے پورے جی ڈی پی کا 29 فیصد ہے۔ ان میں سے اکثریت کے ہیڈ کوارٹر امریکہ اور یورپ میں ہیں۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جو امریکی اور یورپی سیاست کو اپنے سرمائے سے کنٹرول کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں کی طرف سے پارٹیوں کو فنڈز دیئے جاتے ہیں جو الیکشن مہمات اور میڈیا پر خرچ ہوتے ہیں تو پھر کہیں اوباما جیتتا ہے تو کہیں بش، کہیں سرکوزی جیتتا ہے تو کہیں گورڈن۔ اگر اوباما کی پارٹی کے پاس الیکشن میں خرچ کرنے کے لئے چھ ارب ڈالر نہ ہوتے تو وہ وائٹ ہاؤس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا۔ یہی کمپنیاں اپنے مفادات کے لئے حکومتی پالیسیاں مرتب کراتی ہیں۔ ملکوں کو جنگوں میں جھونکتی ہیں اور اپنے ہی ہم وطنوں کو لاشوں کے تحفے دلواتی ہیں۔ ان کو جمہوریت اس لئے اچھی لگتی ہے کہ اس کے نام نہاد طریق کار سے ایک کٹھ پتلی شخص عوام کا نمائندہ بن کر اقتدار پر بیٹھتا ہے لیکن وہ کام ان کے مفاد کے لئے کرتا ہے کہ اس پر ان کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عوام کا فیصلہ ہے۔ اس کے منتخب نمائندوں نے ایسا کیا ہے۔ یہ کمپنیاں اپنا ذرا سا بھی نقصان برداشت نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو وہ فوراً اپنے زرخرید جمہوری قائدین کو قتل و غارت سمیت ہر قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ طالبان نے جب یونی کول کمپنی کو ٹھیکہ دینے سے انکار کیا تو افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

یہ سب اس لئے تحریر کیا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم میں بھی طاقت ہوتی تو کوئی رسول اکرم ﷺ کی شان میں ایسی گستاخانہ فلم بنانے کی جسارت نہ کرتا۔ یہ وہ لوگ کہہ رہے ہیں جو دنیا کے ساٹھ کے قریب ممالک میں رہتے ہیں اور ڈیڑھ ارب سے زیادہ جن کی آبادی ہے۔ یہ ڈیڑھ ارب ''خریدار بادشاہ'' یعنی Consumer Kings ہیں۔ بدقسمتی سے یہ ٹوتھ پیسٹ سے لے کر خوشبو، مشروبات سے لے کر دلیہ اور صابن سے لے کر موبائل فون تک سب کچھ خریدتے ہیں۔ ان میں قوت خرید رکھنے والے امیر ترین ممالک بھی شامل ہیں۔ متحدہ عرب امارات کی فی کس قوت خرید 36 ہزار ڈالر ہے، جبکہ امریکہ کی فی کس قوت خرید 33 ہزار ڈالر ہے۔ یہ روزانہ اربوں روپے کے برگر، پیزا، مشروبات، کافی، چائے، خوشبو، دیگر اشیاء خریدتے ہیں اور ان دو سو بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پیٹ کا ایندھن بھرتے ہیں۔ کیسا مذاق ہے کہ ہمارے جیسے ملک اپنے لئے دلیہ، مکھن، مشروبات، برگر، چکن، ٹوتھ پیسٹ یا شیمپو بھی نہیں بنا سکتے۔ اس لئے کہ میڈیا کی چکا چوند کی وجہ سے خریدار کی آنکھوں کو چندھیا دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں بننے والی کسی ایسی چیز کو خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں یہاں تیل کی دولت اور ان پر قابض، بڑی بڑی عالمی کمپنیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا، ورنہ کسی ایک ملک کا اعلان کہ ہم تیل ڈالر میں نہیں بیچیں گے پورے امریکہ کی چیخیں نکلوا سکتا ہے۔ لیکن ایسے مشورے غیرت مند حکمرانوں کو دیئے جاتے ہیں۔ میں تو صرف غیرت مند مسلمانوں سے مخاطب ہوں، جن کے دلوں میں آج بھی سید الانبیاء ﷺ کے عشق کی چنگاری زندہ ہے۔ یہ ڈیڑھ ارب ''خریدار بادشاہ'' ہیں۔ ان کا ایک فیصلہ وقت کا رخ بدل سکتا ہے۔ ان کا ایک بائیکاٹ دنیا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ جو دکاندار آپ کے باپ کو گالی دے، کیا آپ اس کی دکان سے سودا خریدیں گے۔ آپ کا ایمان ہی مکمل نہیں ہو سکتا اگر آپ سرکار دو عالم ﷺ کو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، بیٹے بیٹیوں اور رشتے داروں سے زیادہ عزیز نہ جانیں۔ مشورے محبت کرنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور ایسے فیصلے بھی محبت کرنے والے کیا کرتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

کیا جنگ مقدر ہو چکی؟

فرانس کے شہر پیرس میں اظہارِ رائے کے تحفظ کے لیے ہونے والا ایک جہتی کا مظاہرہ ایک معمول کا واقعہ نہیں۔ یہ لوگ کسی سے یک جہتی کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ اس اتحاد کا آغاز ہے جس نے ایک دن پوری مسلم امت سے جنگ میں کودنا ہے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے حکمران پیرس کی سڑکوں پر ایسے مارچ کر رہے تھے جیسے آج سے چند صدیاں بیشتر یورپ کی گلیوں میں صلیبی جنگوں میں جانے والے رضاکار لوگوں کے جلوس پرجوش تالیوں میں شہروں کی گلی کوچوں میں گزرا کرتے تھے۔ کیا یہ سب کچھ آنے والے زمانوں کا پیش خیمہ ہے جس کی بشارت سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، فرمایا "پھر رومی اپنے بادشاہ سے کہیں گے کہ ہم عرب والوں کے لیے آپ کی جانب سے کافی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک عظیم جنگ کے لیے اکٹھے ہوں گے اور اسی (80) جھنڈوں کے تحت آئیں گے اور ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار سپاہی ہوں گے (مستدرک و صحیح ابن حبان)۔ یہ جنگ کب برپا ہونی ہے، اس کا علم صرف اور صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ لیکن دنیا میں چھڑنے والی جنگوں کا آغاز اگر دیکھیں تو ان کے پس منظر میں آپ کو اسی طرح کے واقعات نظر آئیں گے۔ کوئی معمولی سا واقعہ جنگ کا بہانہ بنتا ہے اور جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جنگ کے بادل چھٹ جاتے ہیں، لاکھوں لوگ قتل ہو جاتے ہیں، ہزاروں گھر برباد اور شہر کھنڈر بن جاتے ہیں، کسی کے سینے پر فتح کا تمغہ سجتا ہے اور کسی کے سر پر ذلت کا تاج۔ اس سارے کھیل کے ختم ہونے کے بعد جب لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں، تو کہانیاں منظر عام پر آنے لگتی ہیں۔ یہ تو فلاں ملک کی سازش تھی، یہ آگ تو جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ یہ سب تو ایک جھوٹے پراپیگنڈے کی وجہ سے ہوا۔ اس جنگ سے تو فلاں نے اپنا مفاد حاصل کرنا تھا۔ پیرس کے ایک غیر مقبول جریدے کے قتل کیے جانے والے چند صحافیوں اور کارٹون بنانے والوں کو ایک ایسی تحریک کی شکل دینا جو پوری دنیا کو دو خیموں میں تقسیم کر دے، یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی گرد سے عالمی جنگ کے شعلے اٹھتے نظر آ رہے ہیں۔

1096ء میں شروع ہونے والی پہلی صلیبی جنگ میں حصہ لینے والے آج کے دور کے اتحادیوں کی طرح منافق نہیں تھے۔ انہوں نے آزادی اظہار، سیکولرزم اور جمہوریت کا لبادہ نہیں اوڑھا ہوا تھا۔ ستمبر 1096ء میں جب کاؤنٹ بوہمنڈ آف ٹیرانٹو نے نارمن صلیبی فوجیوں کو مارچ کرتے ہوئے دیکھا جو شہر کے بیچوں بیچ جلوس کی صورت جا رہے تھے تو اس نے اپنا سرخ لباس پھاڑ پھینکا، کیتھڈرل سے جا کر صلیب اٹھائی اور کہا، میں بھی "فرینک ہوں، اور کہا یہ میرے سب بھائی شہید ہو کر میرے بغیر ہی جنت میں چلے جائیں گے، اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ستمبر 1096ء سے لے کر 2 اکتوبر 1187ء تک، وہ دن جب صلاح الدین ایوبی فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوا، پورا یورپ اسی طرح جلوسوں کی صورت شہروں میں نکلتا اور اپنے صلیبی جنگجوؤں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتا۔ انہیں خوبصورت انداز سے محاذِ جنگ کے لیے رخصت کیا جاتا۔ یہ لوگ واضح تھے، اپنے مقصد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ 1099ء میں جب انہوں نے یروشلم فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کا قتل عام کیا، تو انہوں نے اس پر فتح کے شادیانے بجائے، کسی نے انسانی حقوق، نظام کی تبدیلی، آمریت سے نجات کے نعرے میں پناہ نہیں ڈھونڈی۔ صاف صاف کہا ہم تمہارے دشمن ہیں اور تم ہمارے دشمن ہو۔ لیکن آج تو امن اور اظہار رائے کی آزادی کا نعرہ بلند کیا گیا ہے۔ یہ نعرہ اس پیرس میں لگایا گیا جہاں آج سے چند سال پہلے عدالت نے ایک ایسے اشتہار پر پابندی لگائی تھی، جس میں ماڈل حضرت عیسیٰ کے آخری کھانے (LastSupper) کی نقالی کر رہا ہوتا ہے۔ 2005ء میں عدالت نے ایک ادارے (AideshauteGaronne) کو اس لئے سزا سنائی کہ اس نے ایڈز کی روک تھام کے لیے ایک تقریب منعقد کی جس کے معلوماتی کتابچے پر ایک عیسائی راہبہ (Nun) کی ایسی تصویر تھی جس کے سکارف کے ساتھ دو گلابی کنڈوم لٹکے ہوئے تھے۔ 1994ء میں اسی فرانس کی ایک عدالت نے ایک اخبار (Le quotidian de Paris) کو مجرم قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسا مضمون چھپا تھا جس میں پوپ اور ان ریاستوں کے خلاف گفتگو کی گئی تھی جو کیتھولک نظریات پر کاربند تھیں۔ خود یہ میگزین چارلی ہیبڈو اپنے ایک کارٹونسٹ کو صدر سرکوزی کی بیوی کے قابلِ اعتراض کارٹون بنانے پر نوکری سے بھی نکال چکا ہے اور معافی بھی مانگ چکا ہے۔ فرانس کا یہ صدر سرکوزی جب وہاں وزیر داخلہ ہوتا تھا، اس نے ایک رسالے پیرس میچ کے ڈائریکٹر کو نوکری سے اس لیے نکلوایا تھا کہ اس نے اسی کی بیوی سیسلیا کی نیویارک کے کسی آدمی کے ساتھ قابلِ اعتراض تصویریں شائع کی تھیں۔

لیکن یہاں مسئلہ آزادی اظہار کے تحفظ کا نہیں۔ اگر آزادی اظہار کا تحفظ یورپ کے ممالک کو اتنا ہی عزیز ہوتا تو کوئی وہاں یہودیوں، اسرائیل یا ہولوکوسٹ پر چند سطریں ہی لکھ کر دکھاتا۔ اخبار تو ایک منظم ادارہ ہے، آپ سوشل میڈیا پر چند سطریں لکھ کر دیکھیں کیسے آزادی اظہار کا گلا گھونٹنے کے لیے بے تاب انتظامیہ آپ کا گلا گھونٹ دے گی۔ جہاں ایک بارہ سالہ بچے کو اس لیے سزا سنا دی گئی کہ اس نے ہٹلر کی تعریف اور یہودیوں کے خلاف بلاگ بنایا تھا۔ مسئلہ ابھی تو عالمی جذبات کی گرد میں لپٹا ہوا ہے۔ لیکن وہ جن کی زندگی جنگ و جدل اور سازشوں کے تانے بانے بنتے گزری ہے ان میں سے چند لوگ زبان کھول رہے ہیں کہ یہ سب کیوں برپا ہوا۔ پال کریگ رابرٹس (PaulCraigRoberts) جو صدر ریگن کے زمانے میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھا اور آج کل وال سٹریٹ جنرل کا ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں امریکہ اور اس کی سی آئی اے کو خوب جانتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ امریکہ نے نیٹو کے ممالک پر روس سے کاروباری تعلق رکھنے پر پابندی لگا رکھی ہے جس سے فرانس کی معیشت بری طرح خسارے کا شکار ہو رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانس کے صدر نے اس واقعہ کے چند دن پہلے اعلان کیا تھا کہ روس پر سے پابندیاں ہٹا دی جائیں گی۔ یہ فرانس کا امریکہ کی ان دیکھی غلامی سے آزادی کا اعلان تھا۔ لیکن چارلی ہیبڈو کے حق میں اظہار یک جہتی اسے ایک ایسی جنگ میں واپس گھسیٹ لائے گی جہاں اسکے لئے امریکہ کے اشاروں پر ناچنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ اسی لیے اس مارچ میں مسلمان ممالک سے بھی وہی سربراہانِ مملکت گئے ہیں جو امریکی اثر و رسوخ کے تحت ہیں یا پھر جن کی حکومتوں کی بقا امریکہ، فوج اور سیاسی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ابھی تو قتل کی تحقیق کا آغاز ہے اور ابھی سے مقصد کا سراغ نظر آ رہا ہے۔ نیویارک ٹائمز اپنی اشاعت میں لکھتا ہے کہ ان کارٹونسٹ اور صحافیوں کا قتل دراصل شام اور عراق میں قائم خلافت اسلامیہ کے ایما پر ہوا ہے۔ وہ تین بندوق بردار جو پیرس کے واقعہ میں ملوث بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک احمدی کوبلی کی موت کے دو دن بعد وڈیو منظر عام پر لائی گئی ہے جس میں وہ خلافت اسلامیہ کے جھنڈے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کے سوالات اور جوابات پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس ویڈیو میں وہ ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ اخبار پر حملے کرنے والے اور ہم سب ایک گروہ کا حصہ ہیں۔ کچھ کام ہم ساتھ کرتے ہیں اور کچھ علیحدہ علیحدہ، لیکن میں نے ابوبکر البغدادی کو اپنا امیر مانا ہوا ہے۔ جس دن صبح نیویارک ٹائمز میں یہ مضمون چھپا اسی شام کو امریکی سینیٹر جان میکین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر خلافت اسلامیہ کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکہ کا سب سے قابلِ اعتماد اور حکومتی پالیسیوں کا آئینہ دار رسالہ "فارن پالیسی" اس واقعے کے بعد ایسے مضامین شائع کر رہا ہے جن سے ایک نئی جنگ کی کے آغاز کی بو آ رہی ہے۔ یہ جنگ خوفناک بھی ہو سکتی ہے اور فیصلہ کن بھی۔ امریکہ کے بارے میں یہ رسالہ لکھتا ہے کہ پراپیگنڈہ کی جنگ میں بھی امریکہ خلافت اسلامیہ کو نہیں ہرا سکتا۔ اسلئے کہ مغرب کو علم تک نہیں کہ وہاں کا مذہب، ثقافت اور حالات کیا ہیں۔ اس کام کے لیے عرب ریاستوں اور مسلمانوں کو آگے آنا ہو گا۔ جنگ میں کودنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ دشمن کس قدر متحد ہے اور مسلمانوں کا اتحاد دیکھنا ہو تو ایک ہی ٹیسٹ ہے اور وہ یہ کہ امت ابھی تک وہ سید الانبیاء کے نام پر اور اُن کی شان پر جان قربان کرنے کو تیار ہے یا نہیں۔ یہ وہ واحد محبت ہے جس میں کوئی فرقہ بندی اور مسلکی اختلاف نہیں۔ اسی لئے خاکے دوبارہ شائع کیے گئے ہیں تاکہ دیکھا جا سکے کہ اس امت میں غیرت کہاں تک باقی ہے۔ یہ صرف یک جہتی کا مظاہرہ نہیں، آنے والے خوفناک دِنوں کا آغاز ہے۔

نوٹ: سود کے متبادل نظام پر بحث کے لیے تقریب آج 16 جنوری 2015ء، پنجابی انسٹیٹیوٹ، قذافی سٹیڈیم، لاہور میں تین بجے سہ پہر منعقد ہو گی۔ آپ کا انتظار رہے گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

کیا معرکہ حق و باطل قریب ہے

ملکہ سباء کی سرزمین اور عرب دنیا کا غریب ترین ملک ''یمن'' دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ اہم رہا ہے۔ عاشق رسول ﷺ حضرت اویس قرنی کا مسکن اور وہ خطہ جس کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا ''بہترین ایمان یمن میں ملے گا اور شاندار حکمت بھی وہاں کی''۔ احادیث کی تمام کتب میں جہاں کہیں قیامت کے قرب میں دور فتن کا تذکرہ ہے وہاں ہادی برحق ﷺ نے دو خطوں کو بہت اہمیت دی ہے' ایک شام اور دوسرا یمن۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اے اللہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما' اے اللہ ہمارے یمن میں برکت عطا فرما' لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارے نجد میں بھی' آپ نے فرمایا' اے اللہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں بھی۔ لوگوں نے پھر کہا ہمارے نجد میں بھی' راوی کا کہنا ہے کہ میرا خیال ہے تیسری بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں زلزلے آئیں گے اور فتنے ہوں گے اور وہاں شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا۔ (بخاری' مسند احمد)۔ شام تو گزشتہ تین سالوں سے اس جنگ میں داخل ہو چکا ہے جس کا تذکرہ کتب احادیث میں ملتا ہے اور اب یمن نے انگڑائی لے لی ہے۔ ایک حیران کن ترتیب زمانی ہے جو ہو بہو ویسی ہی ظہور پذیر ہوتی جا رہی ہے جیسی کتب احادیث میں بتائی گئی ہے۔ سب سے پہلے عراق کی جنگ ہے اور اس کے نتائج سے دوسری جنگیں نکل رہی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ وہ وقت قریب ہے جب بنو ق نطورا یعنی اہل مغرب تمہیں عراق سے نکال دیں گے' میں نے پوچھا ہم دوبارہ واپس آ سکیں گے' حضرت عبداللہ نے فرمایا' آپ ایسا چاہتے ہیں' میں نے کہا ضرور' انہوں نے فرمایا ہاں عراق واپس لوٹ آئیں گے اور ان کے لئے خوشحال اور آسودگی کی زندگی ہوگی (الفتن۔ نعیم بن حماد)۔ اسی جنگ کے بارے میں ایک اور روایت' آپ ﷺ نے فرمایا' قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک فرات سے سونے کا پہاڑ نہ نکلے' لوگ اس پر جنگ کریں گے اور ہر سو میں سے ننانوے مارے جائیں گے۔ ہر بچنے والا سمجھے گا کہ شاید میں ہی اکیلا بچا ہوں (مسلم)۔ عراق پر جنگ جس طرح مسلط کی گئی اور جس طرح تمام اہل مغرب نے مل کر وہاں کی ہر بستی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انہیں ہجرت پر مجبور کیا' اس کی کہانی بار بار بیان ہو چکی۔ اس کے بعد کی ترتیب کے مطابق' مصر میں انتشار اور خرابی کا ذکر ہے اور ٹھیک اسی ترتیب سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ حضرت وہب ابن منبہ فرماتے ہیں کہ جزیرۃ العرب اس وقت تک خراب نہ ہوگا جب تک مصر خراب نہ ہو جائے (السنن الواردہ فی الفتن)۔ حضرت اسحٰق ابن ابی یحییٰ الکعبی حضرت اوزاعی سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ جب پیلے جھنڈوں والے مصر میں داخل ہو جائیں تو اہل شام کو زمین دوز سرنگیں کھود لینی چاہئیں (السنن الواردۃ فی الفتن) ۔ مصر ہی عرب بہار میں سب سے پہلے متحرک ہونے والے ملکوں میں سے تھا۔ وہاں سے حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ التحریر اسکوائر کے اجتماعات کے بعد ہوا۔ پیلے جھنڈے وجود میں آئے جن پر چار انگلیوں کے نشان تھے' اخوان المسلمون کی حکومت بنی اور پھر دوبارہ وہاں جنرل سیسی کے ذریعے آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ یہی دور تھا جب شام کے صدر بشار الاسد نے اپنے خلاف بغاوت کو کچلنے کے لئے بے دریغ قتل عام شروع کیا اور طیاروں سے بمباری شروع کی جس سے اس وقت تک اندازاً چار لاکھ کے قریب لوگ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ کس قدر اہم ہدایت دی گئی تھی اس حدیث میں کہ شام کے لوگوں کو زمین دوز سرنگیں کھود لینی چاہئیں۔ شام آخری جنگ میں جسے رسول اللہ ﷺ نے ملحمۃ الکبریٰ کہا ہے مسلمانوں کا ہیڈ کوارٹر ہوگا اور اسی جگہ مغرب سے جنگ برپا ہوگی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی نصرت یمن سے کی جائے گی۔ حضرت کعب سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ''جب رومی جنگ عظیم (ملاحم) میں اہل شام سے جنگ کریں گے تو اللہ تعالیٰ دو لشکروں کے ذریعے اہل شام کی مدد کرے گا۔ ایک مرتبہ ستر ہزار سے اور دوسری مرتبہ اسی ہزار' اہل یمن کے ذریعے' جو اپنی بند تلواریں لٹکائے ہوئے آئیں گے۔ وہ کہتے ہوں گے کہ ہم پکے سچے اللہ کے بندے ہیں۔ ہم اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے طاعون' ہر قسم کی تکلیف اور تھکاوٹ اٹھا لیں گے (الفتن' نعیم بن حماد)۔ مغرب کی طاقتوں سے یہ جنگ اعماق اور دابق کے مقام پر لڑی جائے گی۔ یہ دونوں قصبے شام کے شہر حلب سے پنتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ترکی کے قریب ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے ''اہل روم اعماق اور دابق کے مقام پر پہنچ جائیں گے۔ ان کی طرف ایک لشکر مدینہ سے پیش قدمی کرے گا جو اس زمانے کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوں گے تو رومی کہیں گے تم ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جو ہمارے لوگوں کو قید کر کے لائے ہو' ہم انہی لوگوں سے جنگ کریں گے' مسلمان کہیں گے نہیں اللہ کی قسم ہم ہرگز تمہارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہیں ہٹیں گے۔ اس پر تم ان سے جنگ کرو گے۔ اب ایک تہائی مسلمان بھاگ کھڑے ہوں گے جن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہیں کرے گا' ایک تہائی شہید کر دیئے جائیں گے' باقی ایک تہائی فتح حاصل کرینگے (مسلم' ابن حبان) سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے آثار کس قدر واضح نظر آ رہے ہیں۔ پورا مغرب شام میں جنگ کرنے کے لیے متحد ہو رہا ہے اور بہانہ وہی لگایا جا رہا ہے کہ ہمارے یورپ کے لوگ قید کر کے لائے گئے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے لڑیں گے ، لیکن اگر جنگ شروع ہو گئی تو پھر اہل مغرب کے مقابلے میں سب مسلمان متحد ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں انتظار میں تھا کہ کب یمن میں امریکہ کی قائم کردہ پٹھو حکومت ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس آخری جنگ میں شام کی نصرت میں یمن سے بھی لوگ جائیں گے اور خراسان کے سیاہ جھنڈوں والے تو پہلے ہی افغانستان میں امریکہ کو شکست فاش دے چکے۔ اب تو بس اتحادی فوجیوں کی جانب سے جنگ کا نقارہ بجنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھیں امت کس طرح ایک جگہ اکٹھی ہوگی اور اس کا ذکر ہادی برحق صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وضاحت سے کر دیا ہے

۔

یمن وہ سرزمین ہے جہاں سیدنا علی بن حسینؓ جنہیں امام زین العابدین کہا جاتا ہے ان کے فرزند ارجمند حضرت زید بن علیؒ کے ماننے والے زیدیہ فرقے کے افراد مقیم ہیں۔ حضرت زید بن علیؒ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اموی حکمران کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ وہ کوفہ پہنچے تو کوفہ والوں نے ان کے ساتھ وہی کیا جو ان کے دادا سیدنا امام حسینؓ اور مسلم بن عقیل کے ساتھ کیا تھا۔ چالیس ہزار افراد نے ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کی بیعت کی' لیکن جب وقت آیا تو وہ سب اکٹھے ہو کر آئے اور پوچھا' تم کس چیز کی دعوت دیتے ہو ، فرمایا اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کیا جائے۔ اس پر ان لوگوں نے سوال اٹھایا ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ، کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صحبت میں انہوں نے زندگی گزاری اور میں نے اپنے گھر والوں سے ان کا ذکر ہمیشہ خیر اور بھلائی سے سنا۔ یہ سننا تھا کہ وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ جب زید بن علیؒ جہاد کے لیے علم بلند کر رہے تھے تو امام ابو حنیفہؒ نے ان کے بارے میں کہا تھا ''زید کا اس وقت اٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بدر میں تشریف آوری کے مشابہ ہے''۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول کس قدر درست ثابت ہوا کہ زید بن علیؒ جب خروج کے لیے نکلے تو ان کے ساتھ بھی تین سو تیرہ افراد تھے۔ وہی تعداد جتنی بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ تھی۔ حضرت زید بن علی کے ماننے والے زیدیہ کہلاتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد کو حضرت زید کے اس خطبے سے اخذ کرتے ہیں۔ ''میں ان لوگوں سے بری ہوں جو اللہ کو مخلوق جیسی ہستی سمجھتے ہیں اور ان جبریوں سے بھی بری جو اپنی ساری بداعمالیوں کی گٹھڑی اللہ پر لاد کر کہتے ہیں کہ سب اللہ کرتا اور کراتا اور ان لوگوں سے بھی بری جنہوں نے بدکاروں کے دلوں میں یہ امید پیدا کر دی ہے کہ خدا انہیں یوں ہی چھوڑ دے گا اور میں ان دین باختوں سے بھی بری جو حضرت علیؓ کو دین سے خارج اور ان رافضیوں سے بھی جدا جو ابو بکرؓ اور عمرؓ کی تکفیر کرتے ہیں۔'' یہی ہے ایک امت کا عقیدہ' اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا بہترین ایمان یمن میں ملے گا۔'' یہ لوگ اس طوق غلامی کو اتار پھینکیں گے جو امریکہ اور اس کے حواریوں نے انہیں پہنایا تھا۔ حالات کی ترتیب تو ویسی ہی ہے جیسی احادیث میں رقم ہے لیکن دیکھنا صرف یہ ہے کہ کب مغرب یلغار کرتا ہے اور پھر کب یہ امت ایک ہو جاتی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

کوئی اور حل نہیں ہے

موت کا کھیل چاروں جانب رقصاں ہے۔ رات گئے پچاس کے قریب ٹیلی ویژن چینلوں پر گفتگو کے بازار سجتے ہیں۔ جذبات سے عاری اور موت کی تلخی سے بے خبر سیاسی رہنما خود کو معصوم اور دوسروں کو ظالم ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ کسی کے لہجے میں دکھ ہے اور نہ چہرے پر پشیمانی۔ گزشتہ دس سالوں سے میڈیا اور سیاست کی لغت میں چند لفظ آ گئے ہیں، جن کا جب اور جس وقت چاہا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ دہشت گرد، شدت پسند، طالبان، فرسودہ خیالات اور دقیانوسی نظریات کے امین وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور فقرہ بہت استعمال ہوتا ہے۔ ''حکومت کچھ نہیں کر رہی۔'' ''حکومت سب کچھ کر سکتی ہے۔'' کوئی نہیں یہ بتاتا کہ یہ حکومت کس بلا کا نام ہے۔ کابینہ میں بیٹھا وزیر، حکومتی پارٹی کا ممبر پارلیمنٹ یا اس کا اتحادی اگر گلے پھاڑ پھاڑ کر کہے کہ حکومت کچھ نہیں کر رہی تو لوگ حیرت سے سوچنے لگتے ہیں کہ یہ حکومت نام کا ادارہ یقیناً اس ملک سے یا تو باہر کہیں ہوتا ہے، یا پھر اس کا وجود آسمانوں میں ہے جہاں سے حکم جاری ہوتے ہیں۔ کابینہ، پارلیمنٹ، رینجرز، پولیس اور فوج تو بس دکھاوے کی چیزیں ہیں۔ اصل میں حکومت کچھ نہیں کر رہی۔ اس لیے روز قتل و غارت ہوتا ہے۔ یہ ہے اس ملک کے ہر روز کا منظر نامہ۔ آپ آج سے ایک ماہ پہلے کے ایک دن کے اخبار اٹھائیں یا ٹیلیویژن چینلوں کے پروگرام دیکھیں۔ خبریں یہ ہوں گی کہ آج اتنے مارے گئے۔ پھر رات کو پروگراموں میں جو فقرے سیاست دانوں نے بولے ہوں گے، جو سوالات اینکروں نے پوچھے ہوں گے۔ آج ایک ماہ بعد ان میں کوئی فقرہ بھی نہیں بدلا ہو گا۔ وہی سوال اور وہی جواب۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں صرف ایک قسم کے گروہ پر اپنی جانب سے لعنت کی ہے۔ فرمایا ''جھوٹوں پر اللہ کی لعنت'' لیکن ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ روزانہ لاشیں گرتی ہیں اور روزانہ اس المیے پر اس قدر جھوٹ بولا جاتا ہے کہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں شرما جاتی ہیں۔ سوال کرنے والے اینکرز اور بستیوں، گلیوں اور بازاروں میں گھومنے والے رپورٹروں کو لوگوں کی روتی آنکھوں، سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان سچ مل جاتا ہے۔ لوگ چیخ چیخ کر بتا رہے ہوتے ہیں کہ ان کے پیاروں کو کون قتل کر گیا ہے اور گزشتہ پچیس سال سے کون کر رہا ہے لیکن ان عوام کے بتائے ہوئے سچ کو بیان کرتے ہوئے ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی مصلحت کے تحت جس کو چاہتا ہے مورد الزام ٹھہرا دیتا ہے۔ سب سے آسان نام طالبان یا دہشت گردوں کا ہے۔ کسی بھی ضلع میں اگر کوئی شخص قتل کر کے مفرور ہو جائے تو پولیس کے لوگ ہر قتل، چوری یا ڈکیتی کو تفتیش سے پہلے ہی اس مفرور ملزم کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے، نہ وہ سامنے آئے گا، نہ پکڑا جائے گا اور نہ ہی کوئی ان سے کہے گا مجرم کو ڈھونڈ کے لاؤ، بند کرو، مقدمہ چلاؤ۔ ہر ضلع کے اپنے اپنے مفرور ہوتے ہیں اور ان کے کھاتے میں روز نئے جرم ڈال کر فائل دن بدن موٹی کر دی جاتی ہے۔

دوسری جانب اس ملک کے اٹھارہ کروڑ میں سے چند ایک اہل اقتدار کو چھوڑ کر ہر شہری مشکوک ہے۔ کوئی بڑا شہر، بڑی شاہراہ ایسی نہیں جس کے کونے کونے پر رکاوٹیں نہ کھڑی کی گئی ہوں۔ تلاشیاں نہ لی جاتی ہوں، پشاور شہر کے ایک باسی نے ایک کیمرے کے سامنے پاکستان کو ''پھاٹکستان'' کہہ دیا جہاں ہر قدم پر پھاٹک لگے ہوں اور ان پر شہری تذلیل اور رسوائی برداشت کر رہے ہوں۔ ایک دانشور اور تجزیہ نگار طبقہ ایسا ہے جو بڑی دور کی کوڑی لے کر آتا ہے کہ یہاں غیر ملکی مداخلت عروج پر ہے۔ کبھی کبھی لوگوں کے سوالوں سے تنگ آئے اعلیٰ انتظامی عہدیدار اور سیاسی رہنما بھی یہ تھیوری پیش کر دیتے ہیں۔ عام سپاہی تک یہ بات پہنچتے پہنچتے سچ سی ہو جاتی ہے اور وہ ہر آنے والے کو غیر ملکی ایجنٹ ہی تصور کرنے لگتا ہے۔ یار لوگوں نے اس تلاشی کے عالم پر کیا کیا لطیفے بنا رکھے ہیں۔ مثلاً ایک چیک پوسٹ پر کسی شخص کو روکا گیا۔ نام پوچھا، تلاشی لی اور پھر اطمینان سے کہا کلمہ سناؤ۔ اس نے سنا دیا، دوسرا سناؤ، سنا دیا، تیسرا سناؤ، سنا دیا، جب اس نے چوتھا کلمہ بھی سنا دیا تو پیچھے کھڑے افسر نے کہا، اس کو بند کر دو، اس ملک میں کس کو سارے کلمے آتے ہیں، اسے ضرور غیر ملک نے پوری تیاری کروا کر بھیجا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود انسان قتل بھی ہو رہے ہیں اور اغوا بھی، بھتہ بھی وصول ہو رہا ہے اور رات کو گھر سے باہر نکلنے پر خوف بھی آتا ہے لیکن اگر کسی سے پوچھو کہ کراچی میں ایسا کیوں ہے تو وہ کہتا ہے کہ ایسا تو پنجاب میں بھی ہوتا ہے۔ پوچھو بلوچستان میں ایسا کیوں ہے تو کہتا ہے کراچی میں ہم سے زیادہ ہو رہا ہے۔ ادھر اگر یہ سوال کسی مرکزی رہنما سے کرو تو ملکوں کے نام گنوانا شروع کر دے گا کہ فلاں ملک میں بھی ایسا ہوتا ہے، فلاں ملک میں اغوا اور قتل ہوتے ہیں۔ ایسے جیسے طاعون، ہیضہ یا چیچک کی کوئی بیماری ہے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ ساری دنیا میں قتل اور اغوا بند ہو جائیں گے تو ہمارے ہاں بھی ہو جائیں گے۔ ساری دنیا میں تو پولیو بھی ختم ہو گیا، ہمارے ہاں نہیں ہوا۔ پولیو کی طرح اگر پوری دنیا میں امن ہو گیا اور ہم ویسے ہی رہے تو پھر۔ تو پھر کچھ نہیں۔ ہماری چرب زبانی اور غلط بیانی ہماری حفاظت کرے گی۔

کیا کبھی کسی نے سوچا ہے کہ وہ لوگ جن کو اس بات کا تفصیل کے ساتھ علم ہو کہ کس گھر میں بکرے، دنبے یا گائے کی قربانی ہوئی ہے، کہاں پرچی پھینکنی ہے اور کہاں سے کھال اٹھانی ہے۔ لوگ گھر سے بیس میل دور بھی قربانی کریں اور چھپا کر گاڑی میں گوشت لائیں، پھر بھی بو سونگھتے، پرچی بردار کھال طلب کرنے آ جائیں۔ ایسے چست اور تیز منتظمین کو اس بات کا پتہ نہ ہو کہ اس گلی، محلے یا علاقے میں کون قتل کر رہا ہے۔ یہ لوگ جب اپنے ورکروں کی لاشیں اٹھاتے ہیں تو شدید غصے میں بھرے جملوں میں ٹھیک سچ بول رہے ہوتے ہیں۔ اپنی نجی محفلوں میں صحیح صحیح قاتلوں کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ٹی وی کا کیمرہ سامنے آتے ہی ان کی زبانیں کچھ اور بولنے لگتی ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کون کر رہا ہے، کوئی تو ہے جو اس شہر کا امن خراب کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو حکومت کا کام ہے۔ ان کو ڈھونڈے، ان پر ہاتھ ڈالے، ان کو پکڑے، امن قائم کرے، شہریوں کو تحفظ دے۔ یہ سب کچھ ہماری خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو مشرف دور کے تحفے ہیں۔

دنیا کے ہر ملک میں کبھی نہ کبھی ایسا دور ضرور گزرا ہے جب مافیا کے پرتشدد انسانوں اور سیاسی کارکنوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔ جب سیاست دان کہیں کہ ہمارا جھنڈا، ہمارا نعرہ یا ہمارا نام استعمال ہو رہا ہے۔ ہم بری الذمہ ہیں۔ تو پھر 1913ء کا لندن ہو یا 90ء کی دہائی کا نیویارک، 60ء کی دہائی کا شکاگو ہو یا 80ء کی دہائی کا سسلی۔ ان سب نے وہاں موجود سیاست دانوں کو انتظامی معاملات سے الگ کر دیا۔ لندن میں تو ان سب کو حفاظتی قید میں محصور کر دیا اور پھر شہر کو قاتلوں، غنڈوں اور بھتہ خوروں سے پاک کر دیا۔ اس دوران کسی کو یہ کہنے کی اجازت نہ دی گئی کہ ہمارے اتنے مارے گئے اور ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ جب شہر اس دہشت اور خوف سے باہر آ گیا تو پھر کہا کہ آؤ اور کرو سیاست۔

KitaabPoint.blogspot.com

کتا کنویں سے نکالو

پاکستان کی تاریخ انکوائری کمیشنوں سے عبارت رہی ہے۔شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس نے عوامی دباؤ کو ختم کرنے کے لیے مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں سرد خانے میں ڈال کر اعلیٰ سطح کے کمیشن بنا دیئے ہوں ہم اس فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ایسے کمیشنوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہر بڑے المیے اور اہم مسئلے کا حل ہی ایک کمیشن کی تشکیل میں پوشیدہ ہے۔یہ کمیشن بڑے بڑے سانحات پر بھی بنے اور تبدیلی کے خواہشمند حکمرانوں نے ریفارمز لانے کے لیے بھی بنائے۔ لیکن ان تمام کمیشنوں کی رپورٹوں کا مقدر تقریباً یکساں ہے۔۔الماریوں کی زینت۔۔کچھ کھلی الماریوں میں پڑی رہتی ہیں اور دو چار اخبار نویس ان پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں اور کچھ ایسی ہیں جنہیں ایک راز سمجھ کر سربمہر کر دیا جاتا ہے اور پھر ایک دن انہیں کوئی چرا لے جاتا ہے اور شائع کر دیتا ہے۔کچھ دن ان پر بھی تبصرے چلتے ہیں اور پھر مستقل خاموشی چھا جاتی ہے۔

گزشتہ 60 سالوں کے دوران بننے والے ان کمیشنوں کی رپورٹوں کو اگر ایک دفعہ سنجیدگی سے پڑھ لیا جائے تو اس ملک کو ایک بہتر راستے پر ڈالنے کے لیے مزید کسی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔کونسا ایسا شعبہ ہے جہاں انتہائی محنت اور جانفشانی سے رپورٹیں نہ مرتب کی گئی ہوں۔ صرف اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں پڑھ لی جائیں اور ان کی پاکستان کے تمام قوانین پر شِق وار بحث دیکھ لی جائے تو آدمی حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔کونسل کی یہ رپورٹیں آئین کے مطابق پارلیمینٹ میں پیش ہونا چاہیں تھیں، لیکن اب تو انہیں ڈھونڈنا تک مشکل ہو چکا ہے۔ کمیشنوں کی یہ رپورٹیں اگر منظر عام پر آ بھی جائیں تو ہمارے حکمران اسقدر بے حس واقع ہوئے ہیں کہ نہ تو انہوں نے کبھی ان کے مندرجات پر غور کیا، نہ ہی اس سے کچھ سبق سیکھا، اور نہ ہی ان کے بتائے گئے خطرات سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کی۔ عدلیہ، انتظامیہ، پولیس، صحت، تعلیم، زراعت غرض کونسا شعبہ ایسا ہے جس کے بارے میں کروڑوں روپے خرچ کر کے کمیشن نہ بٹھائے گئے ہوں، اعلیٰ سطح کے تحقیقی گروہ نہ بنائے گئے ہوں، لیکن ان سب کا لکھا بس الماریوں کی زینت ہے۔

انکوائری کمیشن کی اس تاریخ میں ایک تازہ ترین کمیشن "ایبٹ آباد کمیشن" ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ایک رات اچانک امریکی ہیلی کاپٹر پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے، ایبٹ آباد کے ایک گھر میں امریکی دستے اترے، انہوں نے دنیا کے سب سے مطلوب فرد، اسامہ بن لادن پر گولیوں کی بوچھاڑ کی، جاتے ہوئے اس کی لاش اور گھر میں موجود اہم سامان ساتھ لے گئے۔دو مئی 2011ء یہ ایک بہت حیران کن دن تھا۔ کمیشن بنا، سپریم کورٹ کا ایک سنیئر جج اس کا سربراہ، ایک ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل پولیس، ایک ریٹائرڈ سفارت کار اور ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل اس کے ممبران تھے۔رپورٹ مرتب کر دی گئی۔ رپورٹ سربمہر کر دی گئی، سرد خانے میں چلی گئی۔ لیکن 8 جولائی 2013ء کو الجزیرہ چینل نے وہ رپورٹ اپنی ویب سائٹ پر شائع کر دی۔یہ رپورٹ پاکستان میں ہونے والی خونریزی، دہشت گردی اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے بنیادی عوامل پر ایک ایسے زاویے سے بحث کرتی ہے جو ہماری اس دہشت گردی کی جنگ میں کبھی بھی واضح نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ سانحہ پشاور کے بعد بلائی جانے والی آل پارٹیز کانفرنس، مشترکہ اعلامیہ، نیشنل ایکشن پلان اور اس کے نتیجے میں ہونے والی اکیسویں ترمیم کی بحث میں بھی اس بنیادی نقطے پر کسی نے گفتگو تک نہیں کی۔

دنیا میں کوئی خلفشار، کوئی دہشت گردی حتیٰ کہ ریاستی جبر سے آزادی کی تحریک بھی کبھی اس قدر طویل نہیں چل پاتی، اگر اسے بیرونی مدد یا اشیرباد حاصل نہ ہوں۔ بیرونی مدد اور اشیرباد کے بھی اب ہزار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ سرمایہ اور اسلحہ فراہم کرنا ایک عام سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔اب تو بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کے اندر باقاعدہ اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا نیٹ ورک بناتے ہیں اور وہ براہ راست اس سارے کھیل کی نگرانی کرتے ہیں۔اس کا آغاز امریکی سی آئی اے نے سب سے پہلے لاطینی امریکہ کے ممالک میں شروع کیا اور وہاں کے عوام کو آگ اور خون میں نہلا دیا گیا۔اسی طرح افریقہ کے ممالک میں اس کی لگائی گئی آگ آج تک ایک الاؤ کی طرح روشن ہے اور روزانہ ہزاروں لوگ اس میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ان تمام ممالک میں سی آئی اے کے نیٹ ورک کی کارستانیاں پڑھ لیں، لاپتہ افراد، قتل و غارت گری، قبائلی اور نسلی فسادات، لگتا ہے پورا ملک اس آگ کی لپیٹ میں ہے جبکہ ان ممالک میں پس پردہ سی آئی اے کا کوئی نام تک نہیں لیتا۔ سب کہتے ہیں یہ تو ہمارا اپنا قصور ہے۔ پاکستان میں بھی دہشت گردی کے خلاف بننے والے نیشنل ایکشن پلان بناتے وقت کسی نے اس بنیادی نکتے پر غور ہی نہیں کیا کہ ایبٹ آباد کمیشن اس ملک میں سی آئی اے کے ایک وسیع نیٹ ورک کی نشاندہی کر چکا ہے۔اس نیٹ ورک کی موجودگی میں دہشت گردی کا خاتمہ ایسے ہی ہے جیسے کنویں سے سو ڈول پانی نکال لیا جائے لیکن کتا نہ نکالا جائے۔

یہ رپورٹ اپنے صفحہ 332 اور پیراگراف 786 میں تحریر کرتی ہے "اگر پاکستان نے اپنے زیر نگیں علاقوں میں امن اور اختیار قائم کرنا ہے تو اسے فوری طور پر سی آئی اے اور دیگر بیرونی ملکوں کے خفیہ اور عسکری نیٹ ورک ختم کرنے ہوں گے"۔ رپورٹ کے پیرا 531 میں درج ہے کہ "سی آئی اے پاکستان میں مختلف طریقوں سے نیٹ ورک چلاتی ہے اور اس نے این جی اوز، ٹھیکیداروں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، سفارت کاروں کے بھیس میں عہدیداروں اور تکنیکی ماہرین کے ذریعے ایک وسیع جال پھیلا رکھا ہے اور اس بات کی شہادتیں وزارت دفاع نے مہیا کی ہیں" رپورٹ کے پیراگراف 572 میں درج ہے "کمیشن نے معلومات حاصل کیں کہ امریکیوں نے اسلام آباد میں 389 گھر کرائے پر لئے ہوئے ہیں۔ جب وزارت سے پوچھا گیا کہ امریکیوں کے پاکستان آنے جانے کی کوئی پالیسی موجود ہے تو جواب ملا کہ 2000ء میں تجارتی مقاصد کے لیے ویزا پابندیاں نرم کی گئی تھیں اور اب نسبتاً کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔" رپورٹ کے پیراگراف 516 میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کا ذکر ہے، جنہوں نے امریکیوں کو بے تحاشا ویزے جاری کئے جس کی وجہ سے سی آئی اے کو پاکستان میں اپنا نیٹ ورک بنانے میں مدد ملی"۔اسی لیے اپریل 2011ء میں جب امریکہ میں خفیہ ایجنسیوں کی کانفرنس ہوئی جنہیں (Spymasters) کہا جاتا ہے تو امریکی سی آئی اے کے نمائندے نے کھلم کھلا کہا کہ ہم نے پاکستان میں اپنا نیٹ ورک بنا لیا ہے اور وہ اسقدر مضبوط ہے کہ ہمیں اب آئی ایس آئی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہ نیٹ ورک 2011ء تک مضبوط اور مستحکم ہو چکا تھا۔

اگر سی آئی اے کا طریق کار پوری دنیا کے ممالک میں دیکھ لیں اور خصوصاً مسلم ممالک میں تو بات واضح ہو جائے گی کہ آج ہم جس عذاب میں مبتلا ہیں اس کی وجہ یہی نیٹ ورک ہے۔ لبنان میں ساٹھ کی دہائی میں سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر بنا اور اس کے بعد لبنان میں شیعہ سنی اور عیسائی ایک دوسرے کی لاشیں گرانے لگے۔ بحرین اور یمن میں یہ لوگ داخل ہوئے اور قتل و غارت گری کا آغاز ہوا۔ عراق میں شیعہ سنی ایک محلے میں ساتھ ساتھ رہتے تھے لیکن آج وہاں مسلم امہ کی سب سے بڑی شیعہ سنی جنگ برپا ہے، جہاں دنیا بھر سے لڑنے مرنے والے اکٹھا ہو رہے ہیں۔ سی آئی اے کا پاکستان میں نیٹ ورک تنہا نہیں بلکہ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی را، افغان ایجنسی خاد اور اسرائیلی ایجنسی موساد کی سرپرست کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔اس حقیقت سے پاکستان کی ہر خفیہ ایجنسی آگاہ ہے، ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان سے کس طرح نوجوان دبئی جاتے ہیں، وہاں سے بھارتی قونصل جنرل ان کا بھارت کا ویزا جاری کرتا ہے، وہ ٹریننگ لے کر واپس آتے ہیں، افغانستان میں کس طرح انہیں پناہ ملتی ہے۔ یہ انٹیلی جنس کی دنیا میں ایک خبر نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت کا CIT-X پلان کس قدر تفصیل سے پاکستان میں دہشت گردی کا سرچشمہ ہے اور اسے یہاں موجود سی آئی اے کے نیٹ ورک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کیا یہ سب کچھ پاکستان کے دہشت گردی کے خلاف نیشنل ایکشن پلان میں ایک دفعہ بھی زیر بحث آیا۔ کسی نے کہا کہ تباہی کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ نصاب بدلو، لاؤڈ سپیکر پر پابندی لگاؤ، لٹریچر ضبط کرو، سکولوں کی دیواریں بلند کرو، یہ سب پانی کے ڈول ہیں جو کنویں سے نکالے جا رہے ہیں۔ جبکہ کتا تو کنویں میں موجود ہے، اسے نکالے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، نہ امن، نہ سکون اور نہ خوشحالی۔

KitaabPoint.blogspot.com

مگر وہ علم کے موتی......

حرف راز
اوریا مقبول جان
orya.maqbool@dunya.com.pk

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کا ایک صدی قبل تحریر کردہ وہ نوحہ شدت سے یاد آ رہا ہے جو انہوں نے یورپ کے کتب خانوں میں مسلمان مفکرین، سائنس دانوں اور علماء کی کتابیں دیکھ کر اپنے دل کے زخمی ہونے پر کیا تھا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

یہ نوحہ صرف ان کتابوں یا علمی ذخیرے کا یورپ کی لائبریریوں میں موجودگی پر اظہار درد نہیں بلکہ انہیں اصل صدمہ اس امر کا تھا کہ مسلم امہ کے نوجوانوں کو اس حقیقت کا احساس تک نہیں رہا کہ ''وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ''۔ انہوں نے امت کے نوجوان کو اس ٹوٹے ہوئے تارے سے تشبیہ دی ہے جسے ادراک تک نہیں کہ وہ جس آسمان سے ٹوٹا' اس نے کئی صدیاں دنیا میں علم کی سلطنت پر راج کیا ہے۔ یہ المیہ اچانک ہو گیا یا دانستہ طویل عرصہ تک ہماری نصابی کتابوں اور علمی ذخیروں سے ہمارے آباؤ اجداد کے ذکر کو کھرچ کھرچ کر نکال باہر کیا گیا۔ برصغیر میں انگریز کی آمد کے بعد اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے کے لیے جس طرح فورٹ ولیم کالج میں محاوروں کی ایک طویل فہرست مرتب کی گئی اور پھر اسے زبان زد عام کرنے کے لیے نصابی کتب میں شامل کیا گیا وہ المناک ہے۔ مثلاً انتڑیوں کا قل ہو اللہ پڑھنا، ایک عظیم آیت کی تضحیک، چار یاری کرنا یعنی دھوکہ دینا، چاروں خلفاء کا تمسخر، کسی ہم نوالہ اور ہم پیالہ شخص کو یار غار کہہ کر سیدنا ابوبکرؓ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار ثور کی رفاقت کا مذاق اڑانا، ٹام، ڈک اور ہیری کی جگہ عالی مرتبت صحابہ کرامؓ کا نام زید، بکر اور عمر کا محاورہ بنا کر تمسخر اڑانا۔ ایک طویل فہرست ہے جس نے ہمارے نوجوانوں کو بچپن ہی سے اپنے ماضی سے برگشتہ کیا۔ انہی محاوروں میں ایک فارسی زدہ محاورہ عام کیا گیا۔ یہ محاورہ میں نے ایران میں نہیں سنا، لیکن میرے ملک بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کے ماضی کو گزرا ہوا زمانہ ثابت کرنے کے لیے کہا گیا ''پدرم سلطان بود'' یعنی میرا باپ بادشاہ تھا' جس کا مطلب ہے ان کا ذکر چھوڑو، تم بتاؤ، تم کیا ہو؟

حیرت کی بات ہے کہ یہ محاورہ ان انگریز حکمرانوں نے یہاں عام کیا جنہوں نے اپنے ماضی کی ایک ایک نشانی کو ایسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے جیسے کوئی خزانہ۔ صرف انگریز نہیں ہر مہذب ملک کا دستور اور خاصہ ہے کہ وہ اپنے بچوں اور آنے والی نسلوں کے ذہنوں میں ماضی کی عظمت کے ایسے نقوش ثبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آباؤ اجداد پر فخر ہی زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے قوت عطا کرتا ہے اور وہ ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان سے آگے بڑھنے کے لیے تگ و دو کرنے لگتے ہیں۔ آپ لندن اور پیرس کی گلیوں میں گھومیں، ہر دوسرے قدم پر آپ کو کسی عمارت پر تختی نصب نظر آئے گی کہ یہاں فلاں ادیب، شاعر، سائنس دان اور مفکر قیام پذیر رہا ہے۔ ان کے ہاتھوں سے لکھے مسودے، خطوط، ان کے استعمال میں آنے والی چیزیں، سب عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ برسوں فرانس میں سب سے عظیم فرانسیسی شخصیت کے بارے میں پوچھا گیا تو عوام نے یہ اعزاز وکٹر ہیوگو کو دیا جو ایک ناول نگار تھا۔ شیکسپیئر کے گاؤں سٹرٹ فورڈ چلے جائیں، پورا گاؤں ایک عجائب گھر کا نقشہ پیش کرے گا۔ امریکہ' جس کی تاریخ صرف دو سو سال ہے، اس کے ہر شہر میں آپ کو وہاں کی علمی، ادبی اور سیاسی شخصیت کے حوالے سے لائبریری یا عجائب گھر ضرور ملے گا۔ یہاں تک کہ میمفس کے شہر میں ایلوس پریسلے جیسے گلوکار کے لباس سے لے کر گاڑیوں تک محفوظ ہیں۔ اسی شہر میں سیاہ فاموں کے حقوق کے علمبردار مارٹن لوتھر کنگ کو جس ہوٹل میں قتل کیا گیا تھا اسے عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔

لیکن میرے آباؤ اجداد کے ساتھ انہوں نے ایسا ظلم روا رکھا کہ ان کے علم کے موتی تو اپنے پاس محفوظ کر لیے لیکن ان کے ناموں کو اس طرح اپنے رنگ میں رنگا کہ آنے والی نسلیں جب پڑھیں تو وہ انہیں یورپ کا شہری ہی سمجھیں، جیسے مشہور مفکر اور سائنس دان اور طب کے امام بوعلی سینا کو ایوی سینا بنا دیا گیا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ میں ملکہ وکٹوریہ پر کتاب لکھتے ہوئے اسے بار بار ''مائی وکی'' لکھوں' تو لوگ اور آنے والی نسلیں یہی خیال کریں گی کہ یہ چیچہ وطنی کا کوئی کردار تھی۔ دوسرا بڑا ظلم جو پوری دنیا کے علم کے ساتھ کیا گیا، یہ ہے کہ نصابی کتب میں انسانی ترقی اور علوم کی ارتقاء کی تاریخ میں سے مسلمانوں کی چھ صدیاں کھرچ دی گئیں۔ آپ اپنے ملک کی نصابی کتب سے لے کر دنیا کے کسی بھی ملک کی کتابیں اٹھالیں؛ آپ کو تہذیب و ترقی اور علم و فن کا آغاز یونان سے نظر آئے گا اور پھر اس کے بعد سیدھا یورپ کے احیائے علوم کے زمانے کے لوگ ملیں گے۔ سائنس میں لیونارڈو ڈاونچی کے بعد چھلانگ لگاتے ہوئے ارشمیدس اور گلیلیو آ جاتے ہیں۔ فلسفہ میں سقراط اور افلاطون کے بعد کانٹ' ہیگل یا نطشے ہیں۔ طب میں بقراط کے بعد لوئی پاسچر کی پنسلین آتی ہے۔ یونان کے مفکرین عیسائی نہیں تھے۔ اس وقت تک تو حضرت عیسیٰؑ نے جنم بھی نہیں لیا تھا لیکن انہیں ایک ترتیب کے ساتھ تاریخی ارتقا کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ارسطو سے گلیلیو پھر کوپر نیکولس، نیوٹن اور آئن سٹائن کی ایک لڑی بنائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو بالکل علیحدہ کر کے کبھی ''وزڈم آف ایسٹ'' یعنی مشرق کی علمی روشنی یا پھر سائنس میں 'مسلمانوں کا حصہ' جیسے ابواب مرتب کیے جاتے ہیں' یہ سب بھی اگر کوئی یونیورسٹی یا کالج کی سطح پر جا کر پڑھے۔ بچوں کو بس اتنا ہی علم ہے کہ علم کا ایک مرکز یونان تھا، پھر روم ہوا اور پھر یورپ کے مختلف شہر۔ سائنس میں کوپر نیکولس، نیوٹن اور ڈالٹن کے تمام نظریات کو آئن سٹائن نے جھوٹ کا پلندہ قرار دیا اور کہا کہ تم سائنس کے نام پر تین سو سال جھوٹ پڑھاتے رہے ہو لیکن آج بھی ان کا ذکر کتابوں میں ارتقائی منازل کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

وہ چھ صدیاں جو مسلمانوں کی تھیں ان کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا؛ حالانکہ ان تمام علوم کا آغاز ان چھ صدیوں میں ہوا۔ کوئی جابر بن حیان کا نام نہیں لکھتا جس نے کیمسٹری کے علم کی ابتدا کی اور آٹھ صدیاں اس کی کتابیں دنیا کی ہر زبان میں پڑھائی جاتی رہیں۔ اس نے دھاتوں کے اجزائے ترکیبی بیان کیے۔ کوئی ابوعثمان جاحظ کا ذکر نہیں کرتا جس نے کتاب الحیوان لکھ کر بیالوجی کے مضمون کا آغاز کیا اور تمام حیوانوں اور حشرات الارض کے بارے میں علم جمع کیا۔ کوئی موسیٰ خوارزمی کا تذکرہ نہیں کرتا جس نے ریاضی میں صفر کا آغاز کیا اور ایک سے نو تک ہندسوں کو علیحدہ ترتیب دیا۔ اس نے پہلی بار Sine اور Tagent کی مقداریں درج کیں۔ کہیں ابن فرناس کا تذکرہ نہیں ملے گا جو ستاروں کی گردش کا ماہر تھا، جس نے گھڑیال اور Roch Crystal ایجاد کیے۔ اسحاق بن حنین کی طب، الماہانی کا الجبرا، سنان بن ثابت کی فلکیات، الحمدانی کا جغرافیہ، الجوسی جس نے شریانوں کا علم دریافت کیا اور پہلی دفعہ دندان کا علم دنیا تک پہنچایا، ابوالقاسم زہراوی جس نے سرجری کا آغاز کیا اور اس کے آلات بنائے۔ السنجری کی ریاضی، المقدسی کا جغرافیہ، ابن الہیثم جس نے بصارت کے عمل، کیمرہ اور کشش ثقل پر بحث کی جسے بعد میں نیوٹن کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ البیرونی، ابن رضوان، عمر خیام جو Trignometry کا بانی ہے' ابن زہر، الادریسی، ابن البیطار، الجزری جس نے اکاؤنٹنگ میں ڈبل اینٹری سسٹم سکھایا جو آج تک چل رہا ہے۔ ایک طویل فہرست ہے۔ یہ چھ صدیاں ہماری تاریخ، سائنس اور فلسفہ کی کتابوں سے خارج ہیں' جیسے یہ چھ سو سال انسانوں پر بیتے ہی نہیں۔ یہ ستاروں بھرا آسمان تھا جس کے ہم ٹوٹے ہوئے تارے ہیں۔

نوٹ: العلم ٹرسٹ ان تمام علوم پر ایک ویب سائٹ ترتیب دے رہا ہے جو اس کار خیر میں کام کرنے یا معلومات مہیا کرنا چاہتے ہیں وہ ML@ALILMTRUST.COM.PK پر رابطہ فرمائیں۔

نوٹ: فیصل آباد کا ایک شریف النفس انسان قرض کی دلدل میں جکڑا ہوا ہے، پریشان ہے۔ آسان قرض حسنہ کے لیے مدد کا خواہاں ہے۔ اس کی مشکل آسان کرنے کے خواہش مند 0324-6507213 پر رابطہ کر کے خود تصدیق فرما کر مدد کر سکتے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

حرف راز
اوریا مقبول جان
theharferaz@yahoo.com

موجودہ دور کی تین زنجیریں

آج سے تقریباً دو صدیاں قبل جب دنیا کو جمہوریت، قومی ریاست، عوام کی حاکمیت اور مذہب سے نجات کے تحفے دیئے جا رہے تھے تو دنیا بھر کے صاحبان حیثیت اور طاقت کے سرچشمے ایک بہت گہری چال چل رہے تھے۔ صدیوں سے انسان اس دھرتی پر آباد تھا۔ اس نے غاروں میں زندگی گزارنے سے لے کر بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے تک پوری انسانیت کو صرف اور صرف ایک قدر مشترک پر منظم رکھا تھا۔ انصاف کی حکمرانی پر۔ قبائلی زندگی میں بھی جس کسی کو قبیلے کا سربراہ بنایا گیا اس کی ذمہ داری صرف ایک تھی کہ وہ انصاف کرے۔ لوگوں کو علم تھا کہ وہ اپنی تمام ضروریات زندگی خود پوری کر سکتے ہیں۔ شکار کر کے، غلہ اگا کر یا تجارت کے ذریعے خوراک کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ اپنے معذوروں، بیواؤں اور یتیموں کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے درمیان پیشے بھی بانٹ لئے تھے۔ علاج کرنے والے، کپڑا بننے والے، ہتھیار بنانے والے، مکان تعمیر کرنے والے، فرنیچر بنانے، لباس اور جوتے مہیا کرنے والے۔ یہاں تک کہ لوگوں کا دل بہلانے والے خاندان قرن ہا قرن یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ ان سب کو احساس تھا کہ انہیں ایک ساتھ اسی وقت رکھا جا سکتا ہے کہ اگر ان میں کسی بات پر لڑائی ہو جائے، کوئی قتل یا زخمی ہو جائے، کسی کا حق مارا جائے تو کوئی ایک فرد یا افراد کا گروہ ایسا ہو جو انصاف کر سکے۔ قبیلے کے سربراہ، پنچایت کے ممبر یا کسی شہر کے راجہ کو اس لئے با اختیار بنایا گیا کہ وہ انصاف کرتے تھے۔ انسان نے جب بستیاں اور شہر آباد کئے تو دوسرا خطرہ اسے یہ تھا کہ کہیں کسی اور بستی یا شہر کے لوگ اس پر حملہ نہ کر دیں یا پھر ان کے اندر سے لوگ ہتھیاروں کے بل بوتے پر انہیں لوٹ نہ لیں؛ لہٰذا انہوں نے اسی انصاف کرنے والے قبیلے کے سربراہ یا شہر کے حاکم کو یہ ذمہ داری بھی دے دی کہ وہ بیرونی حملے اور اندرونی لوٹ مار سے ان کی حفاظت کرے۔ یہی دو ذمہ داریاں تھیں جن کی بنیاد پر قبیلے کا اقتدار اور بڑی سے بڑی سلطنت کا اختیار قائم تھا۔ جس طرح زمیندار، ترکھان، جولاہا یا لوہار اپنی آئندہ آنے والی نسل کو اپنے فن میں طاق بناتا، اسی طرح قبیلے کا سردار یا سلطنت کا بادشاہ اپنی نسل کو فن حکمرانی میں طاق کرتا۔ ایتھنز کی شہری ریاستوں کے حکمران اپنے بیٹوں کو فن حکمرانی سکھانے کے لئے سپارٹا کے دربار میں بھیجتے۔ جہاں وہ برسوں انصاف اور امن قائم کرنے کے گر سیکھتے۔ یوں تو سلطنت کو وسعت جنگوں سے ملتی، لیکن سلطنت کو قائم انصاف اور امن سے رکھا جاتا۔ عوامی نفرت کی صورت میں کسی دوسرے علاقے کے حاکم کو حملہ کر کے ملک پر قبضہ کرنے میں دیر نہ لگتی۔ پوری دنیا انسانوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔ 1920ء تک کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ قسمت آزمائی کے لئے، پناہ کے لئے یا حصول علم کے لئے کسی پاسپورٹ یا ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ بادشاہ معزول ہو یا عام آدمی ظلم سے تنگ آ جائے تو وہ اللہ کی سرزمین پر کسی بھی سمت نکل جاتا۔

وقت نے کروٹ لی، انسانوں نے اپنی خاندانی مہارتوں کو چھوڑ کر دوسری مہارتوں میں بھی قسمت آزمائی شروع کر دی۔ مدتوں زمین سے رزق کمانے والوں نے جوتوں کی فیکٹریاں اور ٹیکسٹائل ملیں لگانا شروع کر دیں۔ اسی طرح موچیوں اور لوہاروں کی اولادوں نے وہ مہارتیں سیکھنا شروع کر دیں جو فن حکمرانی کے کام آتی تھیں۔ فن سپہ گری میں طاق لوگوں نے اقتدار پر قابض ہونے کے طریقے ڈھونڈنے شروع کئے اور ایک عام سپاہی شیر شاہ سوری حکمرانی کے ایسے جوہر دکھانے لگا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں ہر کسی کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ بھی حکمرانی کا فن سیکھ کر اقتدار کی کرسی پر بیٹھ سکتا ہے اور لوگوں کو انصاف اور تحفظ بھی فراہم کر سکتا ہے۔ بادشاہ، سردار یا حکمران کے لئے کسی نسل یا خاندان کا وارث ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی یہ مہارت سیکھ لے، وہی حکمران۔ یہ وہ دور تھا جسے اقبال نے خود شناس و خودنگر ہونے کا دور کہا ہے۔ اب وہ لوگ جو صدیوں سے اقتدار کے مسکن کے مکین تھے، انہیں اندازہ ہو گیا کہ اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو پھر ان کے ہاتھ میں کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہیں سے پوری انسانیت کو جمہوریت کا لولی پاپ دیا گیا۔ اقبال نے کہا تھا:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب کبھی آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

عوام کو ایک ووٹ یا رائے دینے کی اجازت کے بعد یہ تاثر دے دیا جائے کہ یہ حکمرانی تم کر رہے ہو۔ پھر اقتدار حاصل کر کے جو چاہے کیا جائے۔ اس کے لئے دو کام ضروری تھے، ایک یہ کہ مذہب کو کاروبار زندگی سے باہر نکالا جائے اور دوسرا دنیا میں بسنے والے لوگوں کو علاقوں کی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے۔ پہلے بادشاہ اپنی حکومت کی سرحدوں کی حفاظت کرتے تھے۔ اب یہ تصور دیا گیا کہ یہ تمہاری مادر وطن ہے، اس کے ایک ایک انچ کا تحفظ تمہاری ذمہ داری ہے۔ مذہب کو نکالنا اس لئے ضروری تھا کہ کہیں اس بنیاد پر لوگ ملکی سرحدوں کے علاوہ بھی اکٹھے نہ ہو جائیں۔ ایسا نہ کیا جاتا تو پوری عیسائی دنیا میں جنگ عظیم اول اور دوئم کیسے برپا ہوتیں اور کروڑوں لوگ کیسے لقمۂ اجل بنتے۔ بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں بنیں۔ سیاست اور حکمرانی اربوں روپے کا کھیل بنا دی گئی جسے چند اہم لوگ سرمائے کی بنیاد پر اپنے قابو میں رکھتے۔ عوام بس اسی بات پر خوش رہتے کہ ان کے ووٹ نے اقتدار قائم کیا ہے۔ یہ ان کی اپنی حکومت ہے۔

ان دو صدیوں میں دنیا تقریباً دو سو ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئی۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ؛ انسانوں کو تقسیم کرنے کے لئے یہ چار نعرے کافی تھے۔ لیکن اس دنیا کے نقشے پر پہلی جنگ عظیم کے بعد جو ملک بھی معرض وجود میں آیا اس کے لئے تین چیزیں لازم بنا دی گئیں۔ ہر ملک کا ایک آئین ہونا چاہئے۔ دنیا کے تمام ممالک کے آئین چند ایک شقوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی نقل ہیں۔ پھر اس آئین کو مقدس کتاب کا نعم البدل قرار دے دیا گیا۔ یعنی ایک مسلمان قرآن پاک سے انحراف کرے اور اس کی سزا تجویز کی جائے تو یہ انسانی جبر ہے، حقوق کی پامالی ہے۔ لیکن ''مقدس کتاب'' آئین کی خلاف ورزی کرنے والا ہر ملک میں موت کا سزاوار ہے۔ دوسری یہ چیز ہر ریاست کے لئے لازم تھی کہ اس کی ایک کرنسی ہونی چاہئے۔ ہر ملک کی ایک پہچان ہے۔ میرے نوٹ پر قائداعظم کی تصویر ہے اور امریکہ والوں کے نوٹ پر واشنگٹن کی۔ یہ قومی علامت تھی اور آج بھی ہے۔ کاغذ کا یہ نوٹ اس سودی نظام کو تحفظ دینے کے لئے تھا جو آج اس دنیا کا اصل حکمران ہے۔ جس کی دولت سے جمہوریت چلتی ہے اور جس کی بنیاد پر ملکوں کو امیر اور غریب بنایا جاتا ہے۔ کاغذ کی کرنسی سے پہلے ایک ملک کے سکے دوسرے ملک میں بھی چل جاتے تھے کہ سونے اور چاندی کی مالیت میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ تیسری چیز جو ان ریاستوں کے لئے لازمی قرار دی گئی وہ یہ کہ ہر ملک کا ایک سٹیٹ بنک ہونا چاہئے جو یہ کرنسی جاری کرے اور ہر ملک کا ایک قومی قرضہ ہونا چاہئے جسے National Debt کہا جاتا ہے۔ یہ غلامی کی وہ بدترین شکل ہے جو کسی فرعون کے زمانے میں بھی نہ تھی۔ یعنی میں رات کو سویا ہوں اور صبح اٹھ کر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے پوچھے بغیر مجھے ایک ہزار روپے کا مقروض کر دیا گیا ہے۔ اس جمہوری نظام اور قومی ریاستوں سے پہلے قوموں کا قرضہ نہیں ہوتا تھا جسے ہر شخص کو ادا کرنا لازم ہو۔ یہ وہ جال تھا جس میں اس دنیا میں سانس لینے والے ہر شخص کو باندھ دیا گیا۔ امریکہ جیسا ملک بھی چودہ ٹریلین ڈالر کا مقروض ہے، جسے امریکی قوم اتارنا بھی چاہے تو کئی صدیاں لگ جائیں گی۔ اسی بنیاد پر قوموں کو دیوالیہ قرار دیا جاتا ہے، ان کی معاشی ناکہ بندی ہوتی ہے۔ جو ان اصولوں پر کاربند نہ ہوا سے ظالم حکومت قرار دیا جاتا ہے۔ عراق پر حملہ کیا جاتا ہے، افغانستان پر حملہ کیا جاتا ہے، دونوں جگہ دس دس لاکھ سے زیادہ انسانوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ ایک ''مقدس'' ''کتاب'' ''آئین'' تحریر کی جاتی ہے، جمہوریت کا تحفہ یعنی الیکشن کرائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہم نے عوام کو اقتدار منتقل کر دیا۔ ثابت کیا جاتا ہے کہ جاہلو! دقیانوس خیالات کے امین لوگو! ملک ایسے بنائے اور چلائے جاتے ہیں۔ ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلاؤ گے تو ہم تمہارے ملک پر قبضہ کر لیں گے، تمہاری نسلیں برباد کریں گے اور تمہیں ملک چلانا سکھائیں گے۔

نوٹ: بہت سے لوگوں نے سلینہ کریم کی کتاب ''سیکولر جناح'' کے اردو ترجمے کا مطالبہ کیا ہے۔ ترجمہ ہو چکا ہے اور زیر طبع ہے۔ جیسے ہی چھپ کر تیار ہوا، میں آپ حضرات کو مطلع کر دوں گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

معاشی برتری اور فوجی بالادستی

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک نے معاشی برتری کا خواب اس وقت تک پورا نہیں کیا جب تک اس کے پاس ایک مضبوط فوجی قوت موجود نہ تھی جو دنیا بھر میں اس کے مفادات کا تحفظ کرتی۔ دنیا بھر کی معیشتوں کے استحصال کی کہانی عالمی سودی نظام، کاغذ کی جعلی اور فراڈ کرنسی کے ذریعے مصنوعی دولت کے بل بوتے پر فوجی طاقت میں اضافے کے گرد گھومتی ہے۔ 1694 میں جب بینک آف انگلینڈ کا چارٹر حاصل کیا گیا تو اسی سال اس بینک نے کاغذ کے نوٹوں کا اجراء کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا بھر میں سونا اور چاندی سرمائے کے معیار کے طور پر بازاروں میں استعمال ہوتے تھے۔ اس سے پہلے جولائی 1690ء میں برطانیہ کو Beachyhead کی جنگ میں بدترین شکست ہوئی تھی اور اس کے گیارہ بحری جہاز تباہ ہو گئے تھے۔ فرانس کا دوبارہ انگلستان پر تسلط ہو گیا تھا۔ برطانیہ کا پوری دنیا پر معاشی اور فوجی برتری کا خواب چکنا چور ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں ایک طاقتور بحری فوج ہی عالمی غنڈہ گردی کی علامت تھی۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ ایسے میں یہودی سود خوروں کے جتھے نے بینک آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی اور کاغذ کی جعلی کرنسی جاری کی، جس نے صرف بارہ دن کے اندر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ اکٹھا کر کے حکومت کے حوالے کیئے تاکہ وہ ایک مضبوط بحریہ ترتیب دے سکے۔ یہاں سے 8 فیصد اجتماعی سود کا آغاز ہوا جو پوری قوم کو ادا کرنا پڑا اور سالانہ آٹھ ہزار پونڈ سروس چارجز کے دھندے کا آغاز ہوا۔ اس طرح پوری قوم کو سود کے لالچ میں ڈال کر اس کے سرمائے کو حکومت کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ فوجی طاقت اور سود کے علاوہ ایک تیسری چیز معاشی برتری کے ضروری تھی اور وہ تھی آبادی۔ اس وقت آبادی کو کم کرنے کے نعرے نہیں لگائے گئے۔ یہ تو بعد میں محکوم قوموں کو مغلوب کرنے کے لیے بلند کئے گئے۔ 1721 تک برطانیہ کی آبادی 71 لاکھ سے ایک کروڑ بیالیس لاکھ ہو گئی، یعنی دگنی ہو گئی۔ عوام کے ہاتھوں میں جعلی کرنسی دے کر سود کے لالچ میں گرفتار کرتے ہوئے جو سرمایہ حاصل کیا گیا اس سے فوجی طاقت بڑھائی گئی اور صنعتوں کا جال بچھایا گیا جسے یہ لوگ صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ فوجی بحری جہاز افریقہ کے ساحلوں پر کھڑے ہوتے اور وہاں سے غلاموں کو جانوروں کی طرح پکڑ پکڑ کر اپنے کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لیے لایا جانے لگا۔ امریکہ کے مشرقی ساحلوں سے لے کر بنگال بنارس اور جارجیا تک برطانوی کاروباری کمپنیاں مال کمانے لگیں۔ ان تمام کے تحفظ کے لیے برطانوی جنگی جہاز موجود ہوتے۔ پورے بحر اوقیانوس اور بحر ہند میں ان جنگی جہازوں کا راج تھا۔ ان کی نگرانی میں ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی تجارتی کمپنیاں مقامی تجارت اور صنعت کو تباہ کر کے اپنے مال کی کھپت پیدا کرتیں۔ تیس لاکھ سے زیادہ افریقی لوگوں کو غلام بنا کر کھیتوں میں کام پر لگایا گیا۔ ان تمام کمپنیوں کو سرمایہ بینک آف انگلینڈ فراہم کرتا اور یہ کمپنیاں واپس اپنا منافع وہاں جمع کرواتیں۔ اس سرمائے سے حکومت کو کھل کھیلنے کا اختیار حاصل تھا۔

آج بھی کچھ نہیں بدلا۔ نئی نئی طاقتیں دنیا کے نقشے پر ابھر آئیں۔ ان کا کام اس سودی نظام اور اس سے جنم لینے والے کارپوریٹ کلچر کی برتری کا تحفظ کرنا، قوموں کو مغلوب کر کے ان میں اپنے لیے سرمایہ کاری اور منافع خوری کے منافع فراہم کرنا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں پنتالیس ہزار کارپوریٹ کمپنیاں ہیں، جن کو پانچ سو بنیادی کمپنیاں کنٹرول کرتی ہیں اور ان کو بیس بڑے بینک سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ سرمایہ لوگوں کے ہاتھ میں جعلی کاغذی نوٹ تھما کر سود کے لالچ میں گرفتار کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ جتنا فوجی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اتنی ہی مغلوب اور محکوم قوموں کی زندگیاں عذاب بنتی جا رہی ہیں۔ کہیں منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے زبردستی قرضوں میں جکڑا جاتا ہے تو کہیں وسائل کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے وہاں خون خرابے کرائے جاتے ہیں، قتل و غارت کا بازار گرم کیا جاتا ہے، اپنی مرضی کے حکمران مسلط کئے جاتے اور آخری کار کسی ملک میں اپنی فوجیں بھی اتار دی جاتی ہیں۔ افریقہ جیسے معدنی وسائل سے مالامال براعظم کی تباہی و بربادی اور قحط و بیماری اس مہذب دنیا کے منہ پر بدترین تھپڑ ہے۔ جنوبی امریکہ سے لے کر ویت نام اور پھر افغانستان و عراق تک معاشی برتری اور بالادستی کا یہ گھن چکر فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہی چلایا جاتا ہے۔

طاقت اور معیشت کا توازن بدلتا ہے تو پرانی طاقتیں سٹیج سے ہٹ جاتی ہیں اور نئی یہاں آ کر دھما چوکڑی مچاتی ہیں۔ انگلینڈ، جرمنی اور جاپان پیچھے ہٹے تو امریکہ اور روس آ گئے، پھر امریکہ ہی رہ گیا۔ مگر اب اس کھیل میں چین اور بھارت اپنے گھوڑوں پر زین کس رہے ہیں۔ ان دونوں ممالک کی ناآسودہ تمناؤں کا راستہ پاکستان سے ہو کر گذرتا ہے۔ چین تو اپنے مشرق کی سمت بھی اثر و رسوخ رکھتا ہے اور شمال کی جانب بھی، لیکن بھارت کا خواب برصغیر کی قدیم راجدھانی پر معاشی اور فوجی قبضہ مستحکم ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت بھارت دنیا کا اسلحہ درآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک بن چکا ہے۔ 2010 سے 2015 تک بھارت 80 ارب ڈالر کے اسلحے کی خریداری کے معاہدات کر چکا ہے۔ اس ضمن میں زمینی فوج سے زیادہ فضائی اور بحری افواج کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ نئے طیاروں کی خریداری ساڑھے تیس ارب ڈالر سے کی گئی ہے۔ اسی طرح بحری افواج کے ذریعے سے جس طرح پورے بحر ہند میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے کوشش اس سے اندازہ ہوتا ہے اس کے جہازوں اور فلیٹوں کی نظر جنوبی چین کے سمندر، بحر الکاہل اور بحیرہ احمر تک ہو جائے گی۔

دنیا کے تمام فوجی رسائل اس صورت حال کو جس تشویش سے دیکھ رہے ہیں، اس کا ایک فیصد بھی پاکستان میں نظر نہیں آتا۔ قومیں جب زوال کے آخری کنارے پر جا پہنچیں تو انہیں غفلت کے تالاب میں مزید دھکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود بخود پھسلتی ذلت کی گہرائیوں میں اترنے لگتی ہیں۔ معاشی برتری کا طریقِ کار آج بھی وہی ہے۔ پہلے اندرونی خانہ جنگی سے کسی ملک کو کھوکھلا کر دو، حکمرانوں کی حیثیت باج گذار اور مرعوب وظیفہ خواروں جیسی ہو جائے تو پھر ایسے میں کبھی عوام سر اٹھانے کی کوشش کریں تو امن اور تجارتی مفادات کے تحفظ کے نام پر فوجی کارروائی کر دو۔ سراج الدولہ سے ٹیپو سلطان تک اور پھر آخر میں 1857 کی مفلوک الحال اور باج گذار مغلیہ سلطنت کا خاتمہ، سارے ہتھکنڈے آج بھی ویسے ہی ہیں۔ معاشی برتری فوجی طاقت کے بل بوتے پر۔

لیکن اس دفعہ خواب بھارت دیکھ رہا ہے اور اس کا جنون اٹھارہویں صدی کے برطانیہ اور بیسویں صدی کے امریکہ جیسا ہے۔ لیکن بھارت کے اس جنون کے راستے میں پاکستان آتا ہے۔ وہ پاکستان جس کے رہنما بھارت سے دوستی کا خواب دیکھ رہے ہیں، جس کی عسکری قیادت گذشتہ تیرہ سال سے ایک ایسی جنگ لڑ رہی ہے جس کا سارا مفاد امریکہ کا ہے اور جس کی زد میں آ کر پورا ملک جہنم بنا ہوا ہے، اور جس کے عوام اپنے حال میں مست ہیں، کوئی غربت کے جہنم میں جل کر خاموش ہے اور کوئی بددیانتی اور لوٹ مار کی دلدل میں ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ایسے میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، یہ تو دفاعی اور سیاسی تجزیہ نگار لمبی لمبی بحثوں میں الجھ کر بھی ہی بتا سکیں لیکن صدیوں پہلے ایک درویش صفت شخص اور ولی کامل، نعمت اللہ شاہ ولی نے آج کے دور کا منظر نامہ اپنے اشعار کھینچا ہے۔ یہ وہی نعمت شاہ ولی ہیں جن کی پیش گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہونے پر انگریز سرکار ان کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی۔ ان کی تمام پیش گوئیوں میں سے پورا ہونے کے لیے اب اس آخری حصہ رہ گیا ہے اور وہ ہے غزوۂ ہند کے بارے میں ہے۔ وہ غزوہ جس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹھارہ احادیث منقول ہیں اور آپ نے اس میں فتح یاب ہونے والے لشکر کو جنت کی بشارت دی ہے اور اس کا وقت بھی بتایا ہے کہ جب یہ لوگ ہند کو فتح کر کے لوٹیں گے تو اپنے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پائیں گے۔ جو کچھ دنیا میں اس وقت برپا ہے، جس طرح مصر سے پاکستان تک آگ اور خون کا کھیل جاری ہے۔ نعمت اللہ شاہ ولی کے کہے گئے شعروں کا مطلب واضح ہوتا جا رہا ہے۔ ان شعروں کا ترجمہ یوں ہے۔ "ترکی والے، عرب، ایران والے دیوانہ وار آئیں گے، پہاڑوں جنگلوں سے اعراب آئیں گے، آگ کا سیلاب ہو گا۔ چترال، نانگا پربت، چین اور گلگت میدان جنگ ہو گا۔ ہندوستان میں شورش برپا ہو گی اور اسلام کے غازی اعلان جہاد کر دیں گے، اہل کابل کافروں کو قتل کرنے نکلیں گے، سرحد کے غازیوں سے زمین قبر کی طرح کانپے گی۔ دریائے اٹک تین بار خون سے بھر کے بہے گا۔ پنجاب، لاہور، کشمیر، گنگا، جمنا اور ب حنور پھر مسلمانوں کے غالبانہ قبضے میں ہوں گے" یہ سب ہو گا، یا نہیں ہو گا، کب ہو گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ کہ وہی عالم الغیب ہے۔ لیکن معاشی برتری اور فوجی بالادستی کے اس مرحلے پر اس ملک کے حکمرانوں کی حالت شاہ عالم ثانی اور محمد شاہ رنگیلے جیسی ہے "مرہٹے" قابض ہیں۔ کوئی احمد شاہ ابدالی کو پکار رہا ہے تو کوئی دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ اہل نظر کہتے کہ جنگ کا آغاز ہو چکا۔ کون لڑے گا، کس کے سر پہ یہ تاج سجے گا، اللہ بہتر جانتا، لیکن فتح کی بشارت اسی کے ساتھ ہے جو اس معاشی ترقی اور فوجی بالادستی کے سامنے کھڑا ہو گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

مجھے اس شہر میں رہنے سے خوف آتا ہے

سیلاب کے اس موسم میں پاکستان کے کسی بڑے شہر کی رنگارنگی اور مصروف زندگی سے نکل کر اگر آپ ان علاقوں کی جانب جائیں جہاں وہ غریب و بے آسرا کسان اور دیہاتی اپنے گھربار لٹ جانے کے بعد بے سروسامان کھلے آسمان تلے پڑے ہیں اگر آپ واقعی دل رکھتے ہیں تو آپ کے بے اختیار آنسو نکل آئیں گے۔ یہ پاکستان کی وہ بے زبان مخلوق ہے جو ہر سال لٹتی ہے۔ پہلے وہاں اخباروں کے چند فوٹوگرافر پہنچا کرتے تھے اب چوبیس گھنٹے نشریات والے ٹیلی ویژن چینلز کے کیمرہ مین اور رپورٹرز ان کے آنسو‘ آہیں اور سسکیاں‘ ریکارڈ کرتے ہیں‘ رپورٹیں بناتے ہیں اور لمحہ بہ لمحہ نشر کرتے ہیں۔ حکمران انہی کیمروں کی چکاچوند میں ان مفلوک الحال لوگوں کے سامنے چہروں پہ کرب کے تاثرات لا کر تصویریں اور ویڈیو بنواتے ہیں اور پورے ملک میں اپنی انسان دوستی کی دھوم مچواتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ سب کچھ گزشتہ ساٹھ سالوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ شہروں کی پر آسائش زندگی گزارنے والوں کو اندازہ تک نہیں کہ دیہات میں رہنے والے یہ لوگ اگر گرم تپتے پانیوں میں کھڑے ہو کر چاول کی پنیری نہ لگائیں‘ نازک پھولوں کی طرح کپاس کے گالوں کو نہ چنیں تو یہ ملک زرمبادلہ سے محروم ہو جائے۔ یہ وہی زرمبادلہ ہے جس سے اس ملک میں پٹرول درآمد ہوتا ہے‘ ہوائی جہاز اڑتے ہیں‘ ٹرین فراٹے بھرتی ہے اور گاڑیاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ اب تو اس ملک میں میسر بجلی بھی اسی پٹرول سے بن رہی ہے۔ انہی دیہاتوں سے بیرون ملک پاکستانی مزدوروں کی اکثریت ہے جو اپنے خون پسینے کی کمائی زرمبادلہ کی صورت اس ملک میں بھیجتی ہے۔ اس سے گاڑیاں‘ جہاز‘ ٹرینیں خریدی جاتی ہیں۔ موٹروے تعمیر ہوتے ہیں۔ چمکدار سڑکیں‘ شاندار ایئرپورٹ دورویہ پھولوں سے آراستہ بلیوارڈ اور موجودہ فیشن کی میٹرو بس سروس شہر کے رہنے والوں کی زندگی پر آسائش‘ خوبصورت اور ترقی یافتہ بناتی ہے۔ بہترین تعلیم ہے تو یہاں‘ شاندار صحت کی سہولیات میسر ہیں تو انہیں‘ روزگار کے مواقع یہیں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کپاس دیہات میں پیدا ہو لیکن ٹیکسٹائل مل یہاں۔ یہ شہر ہیں جہاں زندگی ہر سال بدلتی ہے۔ ان کو ملانے کے لئے جو موٹروے بنتی ہے اس کے دونوں جانب زندگی ہزار سال پرانی ہے۔ نہ بجلی ہے نہ صاف پانی‘ نہ تعلیم ہے اور نہ بیمار پڑنے پر دوائی‘ دیواروں پر اوپلے نظر آئیں گے اور گندے پانی کے جوہڑ۔ ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ پورے ملک کو پر تعیش زندگی فراہم کرنے والے ساگ اور پیاز سے روٹی کھا کر میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔ نہ گلہ‘ نہ شکایت۔ شہر آتے ہیں تو اسے حیرت سے تکتے ہیں اور اپنی قسمت پہ شاکر ہو کر کچی مٹی کے گھروندے میں واپس چلے جاتے ہیں۔

یہ خانماں برباد لوگ جن کی بربادی پر اہل اقتدار ہر سال ماتم کرتے ہیں‘ ٹسوے بہاتے ہیں اور سیلاب کو قدرتی آفت قرار دے کر اپنی نااہلیوں کے لیے بہانے تراشتے ہیں۔ کیا اللہ نے آفات اور مصیبتوں‘ بیماریوں سے بچنے کے لئے انسان کو ذہن عطا نہیں کیا۔ سیدالانبیاء ﷺ کے پاس ایک عورت آئی کہ اس کے بیمار بچے کے لئے اللہ سے دعا فرمائیں آپؐ نے فرمایا اسے دوا دو‘ کہنے لگی آپؐ دعا فرمائیں اللہ سے۔ آپؐ نے فرمایا دوا بھی اللہ نے ہی پیدا کی ہے۔ ہم عذاب اور آفت میں فرق نہیں کرتے۔ استغفار اور دعائیں ہماری تدبیروں کو کامیاب کرتی ہیں اور اللہ ہم پر رحم کرتے ہوئے آفت کو عذاب میں نہیں بدلتا۔ لیکن تدبیر پر مکمل بھروسہ اور فخر ہماری ساری کوششوں کو خاک میں بھی ملا دیتا ہے۔ ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جو نہ تدبیر کرتے ہیں اور نہ استغفار و دعا۔ بس ہمیں ذاتی نمود و نمائش اور فخر و غرور کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ہمارے اس بدترین رویے کی قیمت وہ مسکین دیہاتی ہر سال اٹھاتے ہیں۔ کیا ہمیں علم نہیں کہ سیلاب پر قابو کیسے پایا جاتا ہے؟ کیا ہمارے پاس وسائل نہیں کہ ہم اس سیلاب کو زحمت سے رحمت میں بدل دیں؟ دنیا بھر کی لائبریریوں میں پڑی دریائے سندھ اور اس سے ملحقہ دریاؤں کی سرزمین کے بارے میں لکھی جانے والی رپورٹوں کو دیکھتا ہوں تو حکمرانوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ رپورٹیں 1958ء سے لکھی جا رہی ہیں اور ہمارے پلاننگ کے محکموں کی الماریوں میں پڑی گرد آلود ہو رہی ہیں۔ 1955, 1973, 1976, 1988, 1992, 2010 اور 2011ء میں آنے والے بدترین سیلابوں اور ہزاروں انسانی جانوں کے نقصان اور اربوں کی جائیداد اور فصلوں کی تباہی کے بعد کیا کبھی کسی حکمران نے ان رپورٹوں میں موجود ان تجاویز کو کھول کر بھی دیکھا؟ جو ملک 1873ء کے ایریگیشن ایکٹ کے تحت چل رہا ہو اور وہ بھی ہر صوبے کا مختلف اور جس کی سیلاب کی صورت حال سے بچاؤ کے لئے کوئی قومی پالیسی ہی موجود نہ ہو وہاں ماتم کرنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ آج کل ویسے بھی ماتم کا زمانہ ہے۔ آئین کی مقدس کتاب لہرا کر پارلیمنٹ میں روز ماتم ہوتا ہے اور کوئی شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتا کہ ہماری بے حسی ہر سال لاکھوں انسان پر قہر بن کر ٹوٹتی ہے۔ 1970ء کے بدترین سیلاب کے بعد جب بنگلہ دیش علیحدہ ہوا تو انہوں نے ورثے میں ملنے والی انہی رپورٹوں کو کھولا اور بڑے بڑے تالابوں (RetentionPonds)‘ سیلابی علاقوں کی درجہ بندی‘ سیلابی پانی کے لیے متبادل راستوں کی تعمیر‘ ڈیموں اور بیراجوں کی توسیع اور پورے ملک کو ایک اجتماعی حکمت عملی میں ایسے منظم کیا کہ 1998ء میں وہاں سیلاب کی تباہی دس فیصد سے بھی کم رہی۔ ہمارے ملک میں صوبوں کا پانی جھگڑا مستقل دریائی پانی پر ہے۔ سیلابی پانی پر کوئی حق ملکیت نہیں جتاتا۔ اسے تو ہم نے انسانوں کو نقصان پہنچانے اور سمندر کی نذر کرنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ بھارت نے جب راوی پر تھین‘ ستلج پر بھاکرا اور ننگال اور بیاس پر پانڈو اور پونگ ڈیم بنائے تو ان میں سیلابی پانی کے لئے علیحدہ گنجائش بھی رکھی۔ عام حالات میں یہ تینوں دریا ایک قطرہ پانی بھی پاکستان نہیں آنے دیتے لیکن سیلابی پانی کو کافی حد تک ذخیرہ کی جانب باقی پاکستان پر چھوڑ دیتے ہیں جہاں نکمے اور بے حس حکمران صرف اس کی تباہ کاریوں پر ماتم کرتے ہیں۔ ہارورڈ کے پروفیسر گورڈن میکے GordonMakey کی رپورٹ سے لے کر 2012ء کی عدالتی کمیشن رپورٹ تک ہزاروں قابل عمل تجاویز موجود ہیں۔ کیا 1968ء کی Lieftinch کی وہ رپورٹ چیخ چیخ کر نہیں کہہ رہی کہ پاکستان کو ہر دس سال میں تربیلا کی سائز کا ایک ڈیم بنانا ہوگا۔ کیا وہ نہیں بتاتا کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ محکمہ انہار کی ڈیموں‘ نہروں‘ پشتوں اور بندوں کی مستقل بہتری اور نگرانی میں ناکامی ہے۔ جنگلوں کے کٹنے اور درختوں کے بکنے کا ذکر کرنے والے تو ہر جگہ نظر آتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ یہ درخت سیلاب کا پانی روکنے میں سب سے بہتر ذریعہ ہیں لیکن سرکاری جنگل کاٹنے میں ہر کسی نے اپنی حیثیت کے مطابق حصہ ڈالا۔ جس ملک میں راولپنڈی کا سرکاری جنگل کاٹ کر ہاؤسنگ کالونی بنائی گئی ہو وہاں کون آواز بلند کرے گا۔ میں تجاویز پڑھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اگر 1955ء کے پہلے سیلاب کے بعد ان پر عمل شروع ہو جاتا تو آج ہم انسانی جانوں کے ضیاع اور اربوں کے نقصان سے بچ جاتے۔ کیا یہ تجاویز ناقابل عمل ہیں۔ 1- پورے ملک کو سیلاب کے حوالے سے ایک یونٹ قرار دیا جائے۔ 2- سیلابی پانی کے بہاؤ کے لیے متبادل راستے بنائے جائیں۔ 3- ڈیموں‘ بیراجوں‘ ہیڈ ورکس اور ویئرز کی اپ گریڈیشن کی جائے۔ 4- واٹر پارک اور بڑے بڑے تالابوں کے ذریعے سیلابی پانی کو جمع کیا جائے۔ 5- پشتوں اور بندوں کے اندر آبادکاری ختم کی جائے۔ 6- درخت لگائے جائیں اور بیش بہا لگائے جائیں۔ 7- سیلابی پانی کے چڑھتے ہی Wetting اور Loop بندوں کے ذریعے پانی کا رخ ایک طرف موڑا جائے تاکہ اس بہاؤ میں کمی آئے۔ یہ صرف چند ایک تجاویز ہیں ورنہ صرف ایک دن کی محنت سے ان تمام اقدامات کی تفصیل مرتب کی جا سکتی ہے جو ماہرین نے بار بار تجویز کیے ہیں۔

لیکن کیا کریں ان اقدامات سے فائدہ تو ان غریب دیہاتیوں کا ہوگا جن کے ہسپتالوں میں دوائی نہیں‘ سکولوں میں استاد نہیں۔ جن کی سڑکیں گزشتہ چھ سالوں میں مرمت نہیں ہو سکیں۔ جن کے جانور بیماری سے مر جاتے ہیں اور کوئی ویکسین میسر نہیں ہوتی۔ جن کے محکمہ انہار کے گوداموں میں پتھر تک موجود نہیں کہ پشتے مضبوط کر سکیں۔ ہم انہیں سیلاب میں موت پر 16 لاکھ دے کر خوش ہو جاتے ہیں اور ان تک راشن پہنچا کر تصویر بنا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں اپنے بڑے شہر خوبصورت بنانے ہیں۔ جہاں لاہور شہر میں آرائشی پودے لگانے کے لئے ماہرین کو تھائی لینڈ اور سنگاپور ٹریننگ کے لئے بھیجا جائے۔ جہاں اسلام آباد جیسے شہر کو جہاں ٹریفک کوئی مسئلہ نہ ہو‘ وہاں اربوں روپے سے سڑکیں چوڑی کی جائیں‘ انڈرپاس بنائے جائیں اور اب میٹرو بس کی آمد ہو۔ جہاں اربوں روپے قومی یادگاروں پر خرچ ہو جائے جہاں ایک سیکرٹری کے جی او آر ون کے گھر کی مرمت پر نوے لاکھ روپے تک خرچ ہوں‘ وہاں غریب بستیوں میں ایسے ہی سیلاب آتے ہیں‘ گاؤں دریابرد ہوتے ہیں‘ لوگ مرتے ہیں اور ایک اشکوں‘ آہوں اور سسکیوں کا سیلاب آتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اب لاہور میں رہنے سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ شہر جس کے باسی اپنی تزئین و آرائش پر خوش ہوتے ہوں‘ اتراتے پھر رہے ہوں اور انہیں اسی بات کا احساس تک نہ ہو کہ یہ سب خوبصورتی غریبوں کی موت خرید کر بنائی گئی ہے تو ایسے شہر اللہ کی ناراضگی‘ قہر اور غضب سے زیادہ دیر تک نہیں بچ سکتے۔

KitaabPoint.blogspot.com

مجرمانہ اخلاقیات

اسے اپنے علاقے فلورنس سے نکال دیا گیا۔ وہ اسی غریب الوطنی میں اپنے دوست کو خط میں اپنی کیفیات تحریر کرتا ہے: ''جب رات آتی ہے تو میں اپنے گھر میں داخل ہو کر سیدھا اپنی سٹڈی میں چلا جاتا ہوں۔ اپنے جسم سے دن بھر کے کام کاج والا لباس جو کیچڑ اور غلاظت سے لتھڑا ہوتا ہے، اتار پھینکتا ہوں اور سفیروں، شاہزادوں جیسے کپڑے زیب تن کر لیتا ہوں۔ اس شاندار لباس میں ملبوس میں قدیم بادشاہوں کے ایوانوں میں جا نکلتا ہوں جہاں میرا گرم جوشی سے استقبال ہوتا ہے، بہترین کھانوں سے میری تواضع کی جاتی ہے۔ مجھے ان سے گفتگو کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی اور میں ان سے ان کے دور میں کیے گئے اقدامات کے بارے میں سوال کرتا ہوں، وہ انتہائی شفقت سے مجھے جواب دیتے ہیں۔ گھنٹوں ایسے گزر جاتے ہیں، کسی اضطراب اور پریشانی کے بغیر۔ میں غربت اور موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں نے عمر بھر انہیں کے درمیان زندگی گزاری ہے۔'' یہ اس شخص کے الفاظ ہیں جو دنیا کی موجودہ سیاست میں ایسے اصولوں کی بنیاد رکھ گیا ہے کہ آج تک دنیا کے کسی بھی خطے کا حکمران، آمر ہو یا جمہوری طور پر منتخب اسی پر عملدرآمد کرتا ہے۔ 3 ستمبر 1469ء میں پیدا ہونے والا نکولو میکاؤلی جو 58 سال زندہ رہنے کے بعد 21 جون 1527ء کو فوت ہو گیا اور اپنے ہی شہر فلورنس میں مدفون ہے۔ اس کے مرنے کے پانچ سال بعد یعنی 1532ء میں اس کی مشہور کتاب ''پرنس'' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب نے آنے والی صدیوں میں سیاست اور حکمرانی کی اخلاقیات بدل کر رکھ دی۔ یوں تو اس شخص سے پہلے بھی حکمران ہوتے تھے اور لوگ ان سے خوش اور ناراض بھی ہوا کرتے تھے لیکن طرز حکمرانی اور اصول جہانبانی میں اخلاقیات کو بلند مرتبہ حاصل تھا۔ بادشاہ اپنے طور پر انصاف، خیر خواہی، عوام کی فلاح و بہبود اور سچائی پر عمل کریں یا نہ کریں' لیکن دانشوروں، ادیبوں، قصے کہانیاں بیان کرنے والوں اور شاعروں کے ہاں اسی شخص کی عزت و آبرو کو دوام حاصل ہوتا تھا' جو ان اخلاقیات کا حامل ہوتا تھا۔ ظالم حکمران اور منصف بادشاہ، دو علیحدہ علیحدہ اصناف تھیں۔ کسی کے ظلم پر تحسین کے ڈونگرے نہیں برسائے جاتے تھے اور نہ ہی کسی کی انصاف پسندی پر اسے لعن طعن کی جاتی تھی۔ لیکن میکاؤلی نے دنیا بھر کے قدیم بادشاہوں کی کامیابیوں، ان کے غلط یا صحیح اقدامات اور ان کی ناکامیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس دنیا کو ایک نیا فلسفہ اور نیا نعرہ دیا۔ اس کا یہ نعرہ اب ہماری دنیا کا محاورہ بن چکا ہے۔ "End Justifies means" یعنی انجام خود بخود طریق کار کو درست ثابت کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دھوکہ، فریب، بے اصولی، دھونس اور دھاندلی سے اگر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے تو پھر خود بخود یہ سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک سچا، اخلاق پر عمل کرنے والا، دھوکے اور فریب سے دور شخص عمر بھر ناکام رہتا ہے تو پھر یہ ساری اخلاقیات بے معنی اور بے مصرف ہے۔ یہیں سے اس نے ایک مشہور زمانہ اصطلاح دنیا کو دی "Criminal Virtue" مجرمانہ اخلاقیات۔ اس دن سے لے کر آج تک شیکسپیئر کے اوتھیلو سے شروع ہو جائیں اور موجودہ دور کے کسی بھی کامیاب حکمران کی سوانح عمری پڑھ لیں۔ آپ کو ہر شخص بڑے فخر سے یہ بیان کرتا نظر آئے گا کہ میں نے کیسے دھوکہ اور فریب سے اپنے مدمقابل کو شکست دی' کس طرح میں نے عوام کو بے وقوف بنایا' کیسے میں نے جھوٹ بول کر خود کو پارسا' نیک' رحم دل اور سخی ثابت کیا اور کس طرح میں نے جھوٹے الزامات سے اپنے مدمقابل کی ساکھ کو کمزور کیا۔ یوں اس دنیا میں وہ محاورہ اصول بنتا چلا گیا کہ Every thing is fair in love and war ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے'' اور پھر آج تک نہ ہم جنگ میں اخلاقیات واپس لا سکے اور نہ ہی محبت کرنے کا وہ خوبصورت چلن جس میں شیریں فرہاد' مجنوں لیلیٰ اور ہیر رانجھا جیسے کردار جنم لیا کرتے تھے، ہمیں میسر آ سکا۔ پاکستانی سیاست یا برطانیہ اور امریکہ کی جمہوریت سب جگہ یہی اصول حکمرانی کی بنیاد بنتے رہے۔ یہی مجرمانہ اخلاقیات ہے جس نے سیاست جیسے مقدس اور پیغمبرانہ فعل کو اس دنیا میں مکاری' عیاری اور چالبازی کا ہم پلہ بنا دیا۔ ''میرے ساتھ سیاست مت کرو''۔ یہ فقرہ تو ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ سیاست اور اصول حکمرانی تک ہی یہ معاملہ محدود نہ رہا بلکہ ہمارے کاروبار' گھر بار' خاندانی زندگی اور عدل کے ایوانوں میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ پاکستان کے سب سے متنازع چیف جسٹس نے قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے ان کے انٹرویو اور تقاریر میں اپنے جملے اپنی مشہور منیر رپورٹ میں شامل کر دیے۔ اسی جسٹس منیر احمد نے ایوب خان کے مارشل لاء کو درست قرار دینے کے لئے میکاؤلی کے اس فقرے سے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا Successful Revolution is Legitimate ''کامیاب انقلاب قانونی طور پر درست ہوتا ہے''۔ یوں اس نے مسلم امہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اس بنیادی اصول کو رد کر دیا کہ قانونی طور پر صحیح وہ ہے جو اللہ کے بنائے اصولوں پر حکومت قائم کرے۔

میکاؤلی نے اپنی کتاب ''پرنس'' میں بادشاہوں کو حکمرانی کے بہت سے گر بتائے ہیں جیسے دکھاوے کے لئے خیرات کرنا۔ اسی کتاب میں اس نے حکمرانوں کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک بہت بڑا نسخہ بھی دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے، تم کسی بھی طریقے سے حکمرانی حاصل کرو، اقتدار پر قابض ہو جاؤ، لوگوں کو خوش کر لو، لیکن اگر تم نے ایک چیز پر قابو نہ پایا تو پھر زوال تمہارا مقدر ہو جائے گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ ''کسی غیر ملکی طاقت کو اپنے ملک میں پسندیدگی کا مقام حاصل نہ کرنے دو'' پھر اس نے تاریخ میں ایران اور روم کے بادشاہوں کی مثالیں دی ہیں کہ جب بھی کسی ایک ملک میں دوسرے ملک کے کلچر، تہذیب اور طرز حکمرانی نے عزت و توقیر اور اعلیٰ سطح کا مقام حاصل کر لیا تو سمجھ لو اس معاشرے اور حکومت کا زوال مقدر ہو گیا۔ بادشاہ کی عزت خاک میں مل گئی، لوگوں کا اعتماد اور اپنی زمین پر فخر چکنا چور ہو گیا۔ پھر جس دن اور جس وقت کوئی طاقت چاہے اس پر قبضہ کرے اور اسے اپنا زیرِ نگیں بنا لے۔ آج پوری دنیا کی سیاست میں وہ اصول کارفرما ہیں جو میکاؤلی نے مرتب کیے تھے اور وہ اپنے علاقے سے محبت' اپنی تہذیب پر فخر اور اپنی اخلاقیات پر ناز بھی کرتے ہیں۔

لیکن ہم اس بدقسمت ملک کے باسی ہیں جنہیں روز یہ پڑھایا جاتا ہے کہ تم ذلیل و رسوا اور کم تر ہو اور تم سے بہتر فلاں قوم ہے۔ ایران اور سعودی عرب دو ایسے ملک ہیں جن میں حکومت کے بارے میں منہ سے ایک لفظ نکالنا بھی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ دونوں ملکوں میں خوف کا یہ عالم میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' لیکن میرے ملک میں ان دونوں ممالک کے مدح سرا موجود ہیں۔ بھارت جہاں غربت کا یہ عالم ہے کہ اڑیسہ میں رات کو سفر کرتے میں نے دیکھا کہ عورتیں اور بچیاں ہر میل پر لالٹینیں لے کر کھڑی تھیں کہ کوئی ٹرک ڈرائیور وغیرہ آ جائے اور ہمیں ہمارے جسم کی قیمت دے جائے، لیکن ہمارے ہاں اس کو بھی عظیم ملک بتایا جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں خاندان جس تباہی اور بربادی کا شکار ہیں اور ایسا اخلاقی انحطاط وہاں موجود ہے کہ خود وہاں کے لوگ چیختے ہیں' لیکن ہمارے ہاں ان کی مدح کرنے والے بھی ہیں۔ قوموں کو پہلے ذہنی طور پر کمزور، لاچار اور معذور بنایا جاتا ہے، پھر اسے جو چاہے، جب چاہے فتح کر لے۔ میرے ملک میں یہ زمین کیسے ہموار کی گئی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

مسلماناں بخویشاں در ستیزند

سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا کی جھیل کے کنارے امریکی اور اس کے پانچ اتحادی مارچ کے آخری ہفتے میں ایرانی قیادت کے ساتھ ایٹمی پروگرام پر مذاکرات کر رہے تھے اور دوسری جانب عراق کے تیل کی دولت سے مالامال شہر تکریت سے اسلامی ریاست کا قبضہ چھڑوانے کے لئے امریکہ' عراق اور ایران کے پاسداران شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ اس دوران امریکی "عادت" کے مطابق ایک دوستانہ ڈرون حملہ ہوا جس میں ایرانی پاسداران کے دو اہم ارکان علی یزدانی اور ہادی جعفری مارے گئے۔ ایرانی میڈیا ایک دم سیخ پا ہو گیا اور اپنے اتحادی امریکہ کے خلاف زہر اگلنے لگا۔ تکریت کے خلاف کارروائی کا آغاز عراقی حکومت کی مرضی سے 21 مارچ کو شروع ہوا اور اسی دن سے امریکی طیاروں اور ڈرونز نے تکریت پر اپنی پروازیں شروع کیں۔ ایرانی پاسداران کمانڈروں کے جسد خاکی تہران پہنچے تو جنازے پر ایک جم غفیر امڈ آیا۔ امریکی ایئر فورس کی سنٹرل کمانڈ نے اعلان کیا کہ 22 مارچ سے 24 مارچ 2015ء کے دوران تکریت پر کوئی فضائی حملہ نہیں کیا گیا' بلکہ پہلا حملہ 23 مارچ کی رات کو ہوا۔ تکریت پر زمینی حملہ عراقی افواج اور ایران کے تحت منظم کردہ ملیشیا کے باہم اشتراک سے شروع ہوا جس کی سربراہی ایرانی پاسداران کا سربراہ جنرل قسیم سلیمانی کر رہا تھا۔ عراقی فوج نے امریکہ کو ایران کی مرضی سے اپنے ساتھ ملایا تاکہ فضائی مدد حاصل کی جا سکے۔ امریکی افواج کی سنٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل لائڈ آسٹن نے سینٹ کو بتایا کہ یہ حملے دونوں کی مرضی سے شروع کیے گئے۔ تکریت کی یہ لڑائی جو تیل کے ذخائر کے قبضے کی لڑائی ہے' اسے اب مکمل طور پر سنی شیعہ تنازعے میں بدل دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حملے کے بعد تین گروہ جو ایرانی مدد سے وہاں لڑ رہے ہیں ان کے ترجمان نعیم ال عبیدی نے کہا کہ امریکی ہمارے لوگوں پر "غلطی" سے بم برسا رہے ہیں اور اسلامی ریاست کے لوگوں پر "غلطی" سے امداد۔ یہ وہی عبیدی ہے جس نے بدر ملیشیا' قدس ملیشیا اور اخوان حزب اللہ ملیشیا کے ساتھ مل کر امریکی افواج سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ تکریت کو آزاد کروانے کے لئے ان کی فضائی مدد کرے۔ یہ وہی ملیشیا ہے جو وہاں موجود اسلامی ریاست کے خلاف لڑ رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بانکی مون نے ان لوگوں کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ملیشیا جس علاقے میں داخل ہوتے ہیں وہاں لوگوں کو پکڑتے ہی قتل کر دیتے ہیں' عمارات کو بلڈوز کر دیتے ہیں اور اپنے علاقوں میں لوگوں کو اغوا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے الزامات ایرانی اور عالمی میڈیا کی طرف سے اسلامی ریاست کی طرف بھی لگائے جاتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ میں یہ سب کب سے ہو رہا ہے اور کون اس جنگ کو مسلک کی جنگ میں تبدیل کر کے مسلمانوں کا خون بہا رہا ہے۔ یہ بہت تکلیف دہ موجودہ تاریخ ہے۔ دیگر عرب ممالک کی طرح جب شام کے اقلیتی ڈکٹیٹر بشار الاسد کے خلاف وہاں کی اکثریت اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی آمریت کو بچانے کے لئے ایران اور حزب اللہ نے صرف اسلحہ نہیں بلکہ افرادی قوت تک وہاں پہنچانا شروع کی۔ دوسری جانب سعودی عرب نے وہاں کے لڑنے والوں کو سرمایہ اور اسلحہ دینا شروع کیا۔ محمد علی مرادی جو ایک 45 سالہ افغان تھا' ایران کے ایک قید خانے میں منشیات سمگل کرنے کے جرم میں قید کاٹ رہا تھا' اسے اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ شام میں جا کر بشار الاسد کی فوج کے ساتھ لڑے گا۔ شام میں ایران کے پاسداران نے ایک ملیشیا ترتیب دیا تھا جسے "لیوا فاطمیون" کہا جاتا ہے۔ محمد علی مرادی کو 600 ڈالر ماہانہ دیئے جاتے تھے۔ مرادی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو بتایا کہ اسے ایران میں مختصر ٹریننگ دی گئی اور بتایا گیا تمہیں سیدہ زینب' سیدہ رقیہ اور حجر بن عدی کے مزارات کے تحفظ کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں وہ ان افغان ہزارہ لوگوں کے ساتھ شریک ہو گئے جو شام میں آباد تھے اور اب بشار الاسد کی حکومت کے ساتھ مل کر باغیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اسی جولائی 2014ء میں ایرانی میڈیا پر ایک پاکستانی نوجوان جاوید حسین کا جنازہ دکھایا گیا جسے قم کے شہر میں میں دفن کیا گیا۔ یہ پاکستانی نوجوان شام میں باغیوں کے خلاف لڑنے گیا تھا۔ اسی جولائی میں ایرانی میڈیا پر ایرانی پائلٹ شجاعت علمداری مورجانی کی نماز جنازہ بھی دکھائی گئی جو عراق میں "باغیوں" سے لڑتا مارا گیا تھا اور اسے شیراز میں دفن کیا گیا۔ اس وقت فارسی زبان میں کئی سو ویب پیجز ایسے ہیں جو نوجوانوں سے یہ اپیل کر رہے ہیں کہ شام میں جا کر لڑو۔ "لیوا فاطمیون" کے ویب پیج پر ایسے افغان افراد جو ہزارہ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں' ان کی تصاویر ہیں جو شام میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ گزشتہ ایک سال سے شام کی اس جنگ میں بہت تیزی آ گئی ہے۔ جہاں مغرب سے ہزاروں لوگ اسلامی ریاست کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے وہاں پہنچے ہیں' وہیں ایران کے ذریعے شام اور عراق کی حکومتوں کا ساتھ دینے والے دیگر ملکوں کے لوگ بھی وہاں جا رہے ہیں۔ گیارہ اپریل کو ایرانی میڈیا اور عالمی پریس میں سات پاکستانیوں کے جنازوں کی خبر بھی نشر ہوئی جو شام میں مارے گئے اور ان کا جنازہ قم میں پڑھا گیا۔

500 اس جنگ میں پڑوسی ملکوں کی مداخلت کا آغاز اس وقت ہوا جب ایران نے قدس فورس کے نام پر پاسداران کو سامرا' بغداد اور کربلا کی حفاظت کے لئے بھیجا' آج اس نے پورے مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب اس جنگ کے دو بنیادی میدان ہیں' ایک تکریت اور دوسرا یمن۔ دونوں میں لڑائی کی وجہ نہ شیعہ تعصب ہے اور سنی تعصب بلکہ دونوں کی وجہ تیل کی دولت اور تیل کی سپلائی لائن ہے۔ لیکن ایران ہو یا سعودی عرب دونوں اس امت کے نوجوانوں کو مقدسات کے نام پر اس جنگ میں کودنے کو کہہ رہے ہیں۔ اس وقت تک ایران کے گیارہ اعلیٰ افسران عراق میں جنگ کے دوران مارے جا چکے ہیں۔ کیپٹن علی رضا موشجاری (جون 2014ء سامرا)' کرنل کمال شیر خانی (جون 2014ء سامرا) کرنل شجاعت علمداری مورجانی (جولائی 2014ء سامرا)' بریگیڈر جنرل حامد تقاوی (28 دسمبر 2014ء' سامرا)' کمانڈر مہدی نورزئی (10 جنوری 2015ء' سامرا)' حسین شاکری' (23 جنوری 2015ء سامرا)' کمانڈر رضا حسین مقدم (7 فروری 2015ء سامرا)' محمد ہادی ذلفگاری (15 فروری 2015ء سامرا)' کمانڈر قدس فورس صادق ہادی گولدارہ (20 مارچ 2015ء تکریت) اور علی یزدانی اور ہادی جعفری جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ مارچ 2015ء کے ڈرون حملے میں مارے گئے۔ اسی طرح جولائی 2014ء میں حزب اللہ کا کمانڈر ابراہیم الحج شام میں مارا گیا جو وہاں شامی فوج کے ساتھ بغاوت کو کچلنے کے لئے حزب اللہ کو شریک کر رہا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے مرنے کا سوگ اور ان کی قربانیوں کو اجاگر خود ایرانی' عراقی' شامی اور دیگر میڈیا نے خود کیا ہے۔ کتنے مزید ایسے ہوں گے جو دیگر مسلمان ملکوں سے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور شوق شہادت سے سرشار ہو کر عراق اور شام کی سرزمین پر پہنچے ہوں گے' دل میں یہ مقصد لئے کہ ہم نے وہاں کربلا' نجف' دمشق اور کاظمین کا تحفظ کرنا ہے۔ لیکن اب کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یمن میں کونسے مقدسات ہیں جن کے تحفظ میں لوگ وہاں لڑنے جا رہے ہیں۔ تکریت میں کس کا مزار ہے جس کو بچانا مقصود ہے۔

اس امت کی موجودہ دور میں بدقسمتی یہ ہے کہ اس پر حکمران اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے مقدسات کا نام استعمال کرتے ہیں۔ ایک جانب یہ آواز بلند کی جاتی ہے کہ حرمین شریفین کی تحفظ کے لئے امت اکٹھی ہو جائے اور دوسری جانب مزارات کے نام پر دوسرا گروہ دنیا بھر سے لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ سید الانبیاء ﷺ نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "اے کعبہ تو دنیا میں سب سے مقدس اور محترم مقام ہے لیکن ایک مسلمان کی جان اس کعبے سے بھی زیادہ محترم اور مقدس ہے"۔ اقبال نے آخری عمر میں رسول اکرم کے حضور بہت سی رباعیاں تحریر کیں جو انہوں نے حج کے ارادے سے لکھی تھیں کہ یہ توشہ وہ رسول اکرمؐ کے حضور پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان رباعیات میں اپنی عرضداشت کے ساتھ انہوں نے اس امت کا حال بھی لکھا ہے۔ اقبال نے فرمایا

مسلمان بخویشاں در ستیزند
بجز نقش دوئی در دل نہ ریزند
بنالند ارکسے خشتے بگیرد
ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

(مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں' ان کے دلوں میں اختلاف کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کوئی مسجد کی ایک اینٹ اٹھا کر لے جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن اس مسجد میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے)

KitaabPoint.blogspot.com

مٹھی بھر لوگوں سے نجات کی دعا

قوموں کی ذلت وپستی مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے جنھیں قومیں اپنا رہنما تسلیم کر لیتی ہیں۔ وہ ان کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنے لگتی ہیں۔ انھیں ان کی برائیاں، خامیاں ظلم اور زیادتیاں برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ لوگ ان کی محبت میں ایسے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ان کی ہر غلط بات پر ان کا دفاع کرتے ہیں اور ان کے خلاف اٹھنے والی حق کی آوازوں کے مقابل آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے جہاں بھی بستیوں پر اپنے عذاب کا ذکر کیا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی مٹھی بھر لوگ قرار دیئے ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں اس قوم کی قیادت کر رہے ہوتے ہیں اور وہ قوم بلا چون وچرا ان کی ہر بات مان رہی ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ نے ایک جگہ تو ان مٹھی بھر لوگ کی تعداد بھی بتا دی ہے۔ یہ قوم ثمود تھی۔ جن پر حضرت صالح علیہ السلام مبعوث کیئے گئے۔ اللہ فرماتا ہے "اور شہر میں نو (9) شخص ایسے تھے جو ملک میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے۔ النمل 48)۔ یہ آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے کا ذکر ہے، جب دنیا کی آبادی آج کے مقابلے میں انتہائی قلیل تھی۔ سات ارب کے قریب اس دنیا میں آج آپ کو ہر بستی میں ایسے نو افراد ضرور مل جائیں گے جن کا اس بستی پر کنٹرول ہوتا ہے۔ جو فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح سے کام نہیں لیتے۔ پانچ ہزار کی آبادی کے گاؤں میں پانچ چھ ایسے زور آور لوگ ضرور موجود ہوتے ہیں جن کی دھونس اس گاؤں پر مسلط ہوتی ہے۔ یہ خاندانی طور پر وڈیرے، جاگیردار بھی ہو سکتے ہیں، یا پھر قتل وغارت کرنے، منشیات کا اڈا چلانے والے یا جرائم پیشہ افراد بھی، جن کے خوف سے پورے کا پورا گاؤں تھر تھر کانپ رہا ہوتا ہے۔ پوری بستی ان کے ہاتھوں میں یرغمال بنی ہوتی ہے۔ ان پانچ ہزار لوگوں میں سے اگر کوئی ایک بھی ان مٹھی بھر لوگوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو تو اسے عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے اور باقی ساری کی ساری بستی خوف سے سہم جاتی ہے۔ یہ خوف آخر کار ان لوگوں کے اندر ان چند لوگوں کے ساتھ وفاداری کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور پھر ایک دن اس پانچ ہزار لوگوں کی بستی اور چند مٹھی بھر لوگوں کے مفاد مشترک ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب یہ لوگ ان کے ہر اچھے اور برے میں ساتھی بن جاتے ہیں۔ وہ مٹھی بھر لوگ جن کا منصب اصلاح ہوتا ہے وہ فساد پیدا کرتے ہیں اور باقی سب ان کے ساتھ۔ نہ کوئی برائی سے روکتا ہے اور نہ ہی اچھائی کا حکم دیتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ کا اٹل فیصلہ آجاتا ہے۔ عذاب مسلط کرنے کا فیصلہ۔

عذاب کے فیصلے سے قبل اللہ اپنے مبعوث پیغمبروں کے ذریعے لوگوں کو بار بار ڈراتا ہے، وارننگ دیتا ہے تاکہ لوگ سنبھل جائیں، باز آجائیں۔ لیکن سیّدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد نبوت نہیں بلکہ مبشرات رہ جائیں گی۔ صحابہ نے سوال کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچے لوگوں کے سچے خواب۔ پھر فرمایا سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ انبیاء اپنی امتوں کو ڈراتے اور وہ اکڑ جاتیں تو عذاب کی مستحق ہوتیں۔ لیکن پورے قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک قوم کا ذکر اسقدر محبت اور دوسری امتوں سے اس روّیے کی امید کے ساتھ کیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا کہ اللہ کے عذاب سے نبچنے کا اس سے تیر بہدف اور کوئی نسخہ ہی نہیں ہے۔ یہ قومِ یونس تھی اللہ۔ "پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو، سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے اور جب وہ یقین لے آئی تو ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں ذلت رسوائی کا عذاب ٹال دیا اور ان کو ایک مدت زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے دیا تھا۔" (یونس 98)۔ یہ تقریباً تین ہزار سال قبل کا واقعہ ہے، اسے 860 قبل مسیح سے 784 قبل مسیح کے درمیان کا بتایا جاتا ہے۔ موجودہ عراق کے شہر موصل کے عین سامنے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اشوری رہتی تھی جن کا مرکز نینویٰ کا مشہور شہر تھا۔ اس کے کھنڈرات آج بھی دریائے دجلہ کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ اس قدر بڑی قوم تھی کہ ان کا دارالسلطنت نینویٰ تقریباً 60 میل یا 100 کلومیٹر کے قطر پر محیط تھا۔ اس قوم کا حال بالکل ہماری طرح تھا جو حضرت یونس کے سامنے ایسے سوال کیا کرتی تھی، "کہاں ہے"، "کدھر ہے"، "کیسا ہے تمہارا عذاب"۔ آپ ان کے تمسخر پر ہمیشہ یہ جواب دیتے کہ اللہ کا عذاب مانگنے میں جلدی مت کرو۔ اور ایک دن اللہ نے عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کو اس عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ سے اجازت لیے بغیر شہر سے چلے گئے۔ اشوریوں نے جب دیکھا کہ پیغمبر ہمارے درمیان موجود نہیں تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب عذاب آئے گا۔ پوری کی پوری قوم اجتماعی طور پر گڑگڑا کر اللہ کے حضور استغفار کرنے لگی اور معافی کی طلب گار ہوئی اور اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے نہ صرف عذاب کو ٹالا بلکہ ان کی مہلتِ عمر میں بھی اضافہ کر دیا اور انہیں ایک عرصے تک زندگی کا لطف اٹھانے دیا۔ یہ مدت تقریباً دو سو سال بنتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس اشوری قوم سے عذاب ٹلا تو وہ پھر مست ہو گئی۔ حضرت یونس کے بعد "ناحوم" نبی آئے جو 720 قبل مسیح سے 698 قبل مسیح کے زمانے میں آئے تھے۔ انہوں نے ڈرایا، کوئی اثر نہ ہوا، پھر 640 قبل مسیح میں صفنیاہ نبی آئے، وہ 612 قبل مسیح تک رہے۔ یہ قوم جو یہ سمجھتی تھی اب ہمیں طویل مہلت مل چکی ہے، اپنے حال میں ہی مست رہی۔ لیکن اب آگیا عذاب کا اٹل فیصلہ۔ نینویٰ، تہذیب کا مرکز، عظیم قوم، عیش وعشرت سے رہنے والی، لیکن اللہ نے ان کے پڑوس میں رہنے والی 'میڈیا' قوم کو ان پر مسلط کر دیا۔ میڈیا والے اس قوم پر چڑھ دوڑے، اشوری شکست کھا کر نینویٰ شہر میں محصور ہو گئے، میڈیا والوں نے محاصرہ کر لیا۔ لیکن اب اللہ کی نصرت نہیں اللہ کا عذاب سامنے تھا۔ دریائے دجلہ میں ایک دن طغیانی آئی اور نینویٰ شہر کی مضبوط فصیل دھڑام سے گر گئی۔ میڈیا والے اس شہر پر چڑھ دوڑے اور انہوں نے پورے کا پورا شہر جلا کر راکھ کر دیا۔ اشوری قوم کا بادشاہ اپنے محل میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس سلطنت اور تہذیب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور آج موصل کے سامنے ان کے کھنڈرات نظر آتے ہیں جو آتش زدگی کے نشان لیے ہوئے ہیں۔ وہ قوم جس کے آباؤ اجداد نے اجتماعی استغفار کر کے اللہ سے مہلت لے لی تھی، اس کی اگلی نسلوں نے نافرمانیوں سے اپنے آپ عذاب کا مستحق بنا لیا۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے۔

ہمیں بھی بار بار مہلت ملی، ہم سے بار بار مصیبتیں اور پریشانی، عذاب اور ابتلا ٹالے گے۔ دوبارہ زندگی گذارنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی مہلت بھی دی گئی۔ وہ اہل نظر جن کو سچے خوابوں سے اور مبشرات کے ذریعے اللہ نے خبر دے دی تھی کہ اللہ ہم سے ناراض ہے۔ یہ صاحبانِ نظر گذشتہ پانچ سالوں سے اس قوم کو حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی طرح اجتماعی استغفار کی استدعا کرتے رہے۔ ان کا پانچ سال تمسخر اڑایا جاتا رہا۔ عذاب گہرا ہوتا چلا گیا۔ اللہ اپنے عذاب کی ایک شکل معیشت ضنکا" بھی بتاتا ہے۔ یعنی میں تمہاری گذران مشکل کر دوں گا۔ "ہماری گذران مشکل ہو چکی ہے۔ ہم اذیت ناک کیفیت میں ہیں لیکن ہم نے اللہ سے رجوع کر کے معافی طلب نہ کی۔ ان مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ہم پر آج جو عذاب مسلط ہوا وہ شدید تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن قوم استغفار کرتی تو شاید ٹل جاتا تھا۔ اللہ کی ناراضی کی ایک اور علامت بدترین حکمرانوں کا مسلط ہونا بھی ہے۔ یہ مٹھی بھر لوگ جن کی وجہ سے عذاب آتا ہے۔ ایسے میں اس بدنصیب قوم کے پاس دعا کے سوا ہے ہی کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق "ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مومن کے پاس دعا کے سوا کوئی ہتھیار نہ ہوگا"۔ یہ ہتھیار کب استعمار کرنا ہے، کیسے استعمال کرنا ہے۔ مایوس قوم کے لیے شاید اور کوئی راستہ باقی ہی نہیں۔ ایک صاحب نظر تشریف لائے۔۔ کہنے لگے، کتنے سالوں سے لکھ رہے ہو اجتماعی استغفار کا، کوئی مانا، نہیں، مت لکھو، لوگوں سے کہو رمضان کی ستائیسویں شب ساڑھے بارہ بجے کے بعد اللہ سے گڑگڑا کر ظالموں سے نجات کی دعا مانگیں۔ کہنے لگے ان سے کہو وہ دعا کرو جو حضرت نوح نے کی تھی "اے میرے رب! ان میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑنا، اگر تو نے چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے بھی جو پیدا ہوگا وہ بدکار اور سخت کافر ہوگا (نوح 26)۔ اللہ سے ان مٹھی بھر لوگوں سے نجات کی درخواست کرو۔ اگر اس رات لوگوں نے آنسوؤں سے روتے ہوئے اتنا بھی کہہ دیا "ربِّ اِنی مَغلوب" ف انت ص رٖ"۔ (اے اللہ میں مغلوب ہوں اب تو ہی میرا بدلہ لے)، پھر دیکھنا کیسے نجات کی گھڑیاں آتی ہیں اور کیسے ظالم اور ان کی نسلیں اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ شرط یہ کہ اس مقدس رات کے اس پہر، صرف ظالموں سے نجات کی دعا، آنسوؤں سے تر آنکھوں اور دل کی خشیت کے ساتھ۔

KitaabPoint.blogspot.com

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں ان نمود اس کی

کسی قوم کی ترقی اور عروج کی داستان تحریر کرنا ہو تو اس کا کمزور ترین پہلو بھی یوں اجاگر کیا جاتا ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگ جائیں کہ اگر صرف یہی ایک خاصیت ہم پیدا کر لیں تو ترقی ہمارے قدم چوم لے گی۔ لیکن اگر زوال کی تاریخ مرتب کرنا ہو تو اس قوم کی شاندار خصوصیت کو بھی اس کا جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ زوال میں سخاوت بے وقوفی بن جاتی ہے اور عروج میں ایک اعلیٰ انسانی قدر۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال سے جدید مؤرخین اور تجزیہ کاروں نے یہ فیشن اختیار کر لیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی قوم کے زوال میں اہم ترین محرک، مذہب کو ثابت کیا جائے۔ یوں تو براہ راست مذہب کو برائی کا سرچشمہ نہیں کہا جاتا، لیکن اس کے نمائندہ افراد کو تضحیک کا نشانہ بنا کر مقصد پورا کر لیا جاتا ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ، اسلام میں تو کوئی برائی نہیں، اصل میں ملا، مولوی، عالم اور آخر کار سارے مسلمان ہی نکمے، ناکارہ اور بے کار ہیں۔ سیکولر، جمہوری، قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد علمی سطح پر یہ نظریہ راسخ کروا دیا گیا ہے کہ دنیا میں دراصل قتل و غارت گری کا منبع اور ماخذ صرف اور صرف مذہب ہے۔ ہر مؤرخ، تجزیہ کار اور دانشور یہی دلیل زور و شور سے دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی سوال اٹھائے کہ جدید سیکولر جمہوری اور قومی ریاستیں وجود میں آنے کے بعد ان قوموں نے دو عالمی جنگیں لڑیں اور کروڑوں لوگوں کو قتل کیا تو تاریخ کے اس سب سے بڑے قتل عام کے وقت مذہب ریاست کے کاروبار سے بہت دور تھا اور مذہبی رہنماؤں کا تو وجود ہی بے ضرر کیڑے مکوڑوں کی حیثیت تک محدود ہو چکا تھا، ایسے میں قتل کا ذمہ دار کون تھا۔ تو جواب گول کر دیا جاتا ہے۔

جنگ عظیم اوّل جس کے بعد مسلم امہ ٹکڑوں میں بانٹ دی گئی اور صرف خلافت عثمانیہ ہی نہیں بلکہ لفظ خلافت بھی مسلمانوں کی روزمرہ لغت سے خارج ہو گیا۔ اس کے غبار سے ایک شخصیت ابھری جسے مصطفےٰ کمال المعروف اتاترک کہتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک مسلم امہ کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور ترکی کو جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا اسے ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان اپنی مرکزیت یعنی خلافت کی بقا کے لیے پریشان تھے۔ برصغیر جو خود انگریز کا غلام تھا، وہاں سے پہلی منظم سیاسی تحریک ابھری تھی جسے تحریک خلافت کہا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں گاندھی جیسے لیڈر نے بھی کہا تھا کہ اگر اسے اپنی زندگی میں کسی تحریک پر فخر کرنا پڑے تو میں تحریک خلافت پر کروں گا، کہ اس نے یہاں کے رہنے والوں کو سیاسی شعور عطا کیا تھا۔ ایسے دور میں خلافت کے ادارے کو مذموم قرار دینے، امتِ مسلمہ کے تصور کے مقابلے میں ترک قومیت کا تصور اجاگر کرنے اور یورپ کی تہذیبی اساس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کو ترقی کی معراج سمجھنے والے اتاترک کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا رہا اور آج بھی کبھی کسی کی طبیعت میں انگڑائی اٹھتی ہے تو وہ اتاترک کی عظمت کے گیت گانے کے ساتھ ساتھ خلافت عثمانیہ کے زوال کو مذہبی طبقے کی بالادستی اور مذہب کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔ دراصل اس خلافت عثمانیہ کے خلاف نفرت مسیحی یورپ کے رگ و پے میں ازل سے رچی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس کے بطن سے صلاح الدین ایوبی نے جنم لیا تھا۔ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت یعنی "خلافت" کو متنازعہ بنانے کیلئے ایران کے صفوی حکمران شاہ اسمٰعیل سے جنگ کرائی گئی۔ لیکن جنگ چلدران میں شکست کے بعد مصر میں خلافت عثمانیہ مستحکم ہوئی تو 1453 سے 1683 تک پوری دنیا میں خلافت عثمانیہ کے ہم پلہ کوئی اور طاقت وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ ایک ایسی بحری طاقت جس کا مقابلہ کرنے کی کسی میں تاب نہ تھی۔ ایک ایسا اقتصادی نظام جو کارپوریٹ استحصال سے پاک تھا۔ جس کے بارے میں تمام ماہر معاشیات متفق ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا بازار آزاد معیشت کا آخری بازار تھا جو سود اور "مڈل مین" کے تسلط سے آزاد تھا۔ "مجلّہ عدلیہ" وہ انصاف کا نظام جس میں چیف جسٹس جسے شیخ الاسلام کہتے تھے، اس کے سامنے سلطان تک جوابدہ تھا اور بادشاہ کی معزولی کے لیے بھی چیف جسٹس کے فیصلے کی ضرورت تھی۔ خلافت عثمانیہ کی فضائیہ کی بنیاد 1909 میں رکھ دی گئی تھی یعنی جہاز ایجاد ہونے کے پانچ سال بعد۔ اور اس کی بحریہ تو بہت قدیم تھی۔ یہ تھی وہ خلافت عثمانیہ جس کی خلافت کے خلاف پہلے مشرقی یورپ کے علاقوں میں قوم پرستوں کو اکسایا گیا اور آسٹریا نے ان قوم پرستوں کی مدد کر کے بلقان کی ریاستوں کو علیحدہ کروا لیا اور پھر اسی قوم پرستی کی لہر کو لارنس آف عربیہ کے ذریعے عربوں تک پھیلا دیا گیا اور جنگ عظیم اوّل میں شکست کے بعد خلافت عثمانیہ مصطفےٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ختم کر دی گئی۔ شکست تو جرمنی کو بھی ہوئی، جنگ عظیم دوم میں جاپان اور اٹلی کو بھی ہوئی، لیکن کوئی وہاں شکست کی وجہ مذہب کو نہیں بتاتا۔ وہاں تو ترقی بھی ہوئی تھی۔ تمام دنیاوی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ پرنٹنگ پریس تو گٹن برگ نے قائم ہی جرمنی میں کیا تھا۔ اسے کسی مولوی نے نہیں روکا تھا۔ وہاں تو لاؤڈ سپیکر کا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ کفر کے فتوے بھی نہیں لگتے تھے لیکن پھر بھی جرمنی، اٹلی اور جاپان کو ذلت آمیز شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی شکست کے اسباب لکھتے ہوئے تو کسی کو اس رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ وہ تمام کی تمام ریاستیں سیکولر قوم پرستانہ ریاستیں تھیں۔ اور خلافت عثمانیہ رنگ و نسل سے بالاتر مسلم امہ کی مرکزیت کی علامت تھی۔ اسی لیے اسے مردود قرار دیتے ہیں اور پھر اس کی ناکامی کو مذہبی طبقوں کے ساتھ منسلک کرنے سے اصل مقصد اسلام کو بدنام کرنا ہوتا ہے۔

کیا خلافت کا نظام ہی خلافت عثمانیہ کے زوال کا سبب تھا جسے اتاترک نے تبدیل کیا۔ خلافت عثمانیہ کا زوال عین اس دن شروع ہو گیا تھا جب یورپ کی دیکھا دیکھی سلطان محمود ثانی نے 1839 سے لے کر 1876 تک آئین اور آئینی اصلاحات کے راستے کا آغاز کیا۔ اس نے مغربی طرز پر ایک جدید فوج مرتب کی۔ 1856 میں خط ہمایوں کے ذریعے آرمینیاء کے عیسائی دانشوروں کی مدد سے 150 شقوں پر مرتب کردہ ایک قانون بنایا گیا جسے "نظام نامہ ملت آرمینیان" کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کو خصوصی حقوق دیئے گئے۔ 1860ء میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان کرتے ہوئے سودی بینکاری کا آغاز کیا گیا۔ مغربی جامعات میں پڑھنے والے چند افراد کے ایک گروہ نے ایک اساسی آئین مرتب کیا جس کے تحت خلافت عثمانیہ نہیں بلکہ حکومت کو آئینی بادشاہت کا درجہ دے دیا گیا جو ماڈرن سیکولر ریاست کی طرز پر تھی۔ اس آئین کے مطابق مسائل کا حل آئینی بادشاہت میں تھا، جیسے برطانیہ، بلجیم، ڈنمارک، سویڈن وغیرہ میں ہوتی ہیں۔ بادشاہ مراد پنجم ذہنی معذور تھا۔ اس کو عہدے سے ہٹایا گیا تو اس کے جانشین عبدالحمید ثانی کو اس شرط پر بادشاہت سنبھالنے کی دعوت دی گئی کہ وہ آئینی بادشاہت کو قبول کرے گا، جس پر اس نے 23 نومبر 1876 پر عمل شروع کیا اور ایک مغربی طرز کی پارلیمان بھی بنا دی۔ خلافت سے آئینی بادشاہت کے سفر کے بعد جو خلافت عثمانیہ پر بیتی وہ ایک تاریخ ہے۔ روس اس پر چڑھ دوڑا، جنگ میں شکست پر قبرص کو پٹے پر برطانیہ کو دینا پڑا۔ اس کے بعد اتحادی افواج نے پوری کی پوری سلطنت عثمانیہ کو ایسے تقسیم کیا جیسے میز کو کیک پر رکھ کر کاٹا جاتا ہے۔ ہر نسل رنگ اور علاقے کی بنیاد پر مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ ایسے میں ترک قومیت کے نعرے پر اتاترک نے بھی اپنے لیے یا پھر ترک قوم کے لیے ایک ماڈرن سیکولر قومی ریاست تشکیل دے دی۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکا جب تقریباً پچاس سال پہلے خلافت عثمانیہ اپنے اصل رستے سے بھٹک کر آئینی بادشاہت، جمہوریت، سیکولرزم اور نسلی برتری کی بھول بھلیوں میں کھو گئی تھی۔ اتاترک خلافت نہیں آئینی بادشاہت ختم کر سکا، اور اسے پورے مغرب نے ہیرو بنا کر پیش کیا اور کوشش کی کہ مسلم امہ اس سے اپنی امیدیں وابستہ کر لے۔ اسی لیے تو اقبال نے کہا تھا۔

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں ان نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

رُوحِ شرق جس بدن کی تلاش میں ہے، وہ اتاترک کا نعم البدل نہیں بلکہ وہ امام مہدی ہے جو اس امت کو ایک بار پھر متحد کرے گا جس کے بارے میں اس امت کا ہر مسلک متفق ہے۔ جس کے بارے میں میرے آقا سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ خلافت علی منہاج النبوہ قائم کرے گا اور کوئی جھونپڑی ایسی نہ ہو گی جس میں اسلام داخل نہ ہو جائے (مفہوم حدیث) اس امت کو کسی اتاترک کی نہیں اسی مہدی کا انتظار ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

پیکیج ڈیل

پاکستان سے جاکر برطانیہ میں آباد ہونے والے افراد اپنے ساتھ یہاں کے سیاسی اختلافات اور مذہبی تعصبات بھی لے کر گئے ہیں۔ سیاسی اختلافات کی گہرائی اتنی شدید نہیں، اس لیے کہ وہاں پر موجود پاکستانی بڑی آسانی سے اپنے لیڈر اور پارٹی کو بدل لیتے ہیں۔ کوئی توقعات پر پورا نہ اترا تو دوسرے سے امیدیں لگالی جاتی ہیں۔ نہ وہاں برداری کا اثرورسوخ اتنا موجود ہے اور نہ ہی کسی پارٹی کی ہارجیت کے ساتھ علاقے میں چودھراہٹ وابستہ ہے اسی لیے وہاں سیاسی چپقلش گہری نہیں ہے۔ لیکن مذہبی تعصبات تو ایسے لگتا ہے، وہاں جاکر انہیں مہمیز لگ جاتی ہے۔ جو کچھ وہ یہاں نہیں کر پاتے برطانیہ کی اظہارِ رائے کی آزادی کے پرچم تلے کر گزرتے ہیں۔ ہر فقہ اور ہر مسلک کی مسجد آپ کو وہاں نظر آئے گی۔ ہر پیر کا ایک آستانہ بھی برطانیہ کے کسی شہر میں ضرور موجود ہوگا بلکہ بعض کے آستانے تو کئی شہروں میں ملیں گے۔ علمائے کرام بھی سب کے سب پاکستان سے درآمد کئے جاتے ہیں اور خطبہ بھی اردو، پشتو، سندھی یا پنجابی میں دیا جاتا ہے۔ مجمع گرمانے اور مسلکی اختلاف سے لوگوں کے جسموں میں بجلی دوڑانے کا جو فن ان علماء نے یہاں سیکھا اور استعمال کیا ہوتا ہے اس کا مکمل اور پُرجوش اظہار برطانیہ کی ان مساجد میں ہوتا ہے۔ برمنگھم جیسے شہر میں ڈیڑھ سو سے زیادہ مساجد ہیں اور کسی کا مولوی دوسرے کے مولوی سے ہم آہنگی نہیں رکھتا۔ یہ مسلکی اختلاف اسقدر وسیع ہے کہ پورے برطانیہ میں ہر سال دو سے تین عیدیں ہوتی ہیں اور کوئی آپس میں متحد ہونے، اتحادِ علماء کا گروہ بنانے یا آپس میں مل بیٹھ کر اس اختلاف کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ برطانیہ میں ہر مسلک نے اپنا ایک ٹی وی چینل بھی کھول رکھا ہے۔ ان چینلوں پر ہونے والے پروگرام اسقدر بے باک ہوتے ہیں کہ اگر پاکستان میں ان میں سے ایک پروگرام بھی نشر ہوجائے تو آگ لگ جائے۔ ان پروگراموں کا سب سے خطرناک حصہ وہ لائیو کالز ہیں جو لوگ وہاں پر بیٹھے علماء کرام سے سوالات کی صورت پوچھتے ہیں۔ دوسری جانب سے ٹیلیفون پر بات کرنے والا پوری آزادی سے جس کسی فرقے کی مقدس ہستی کو جو کچھ کہہ کر فون بند کرتا ہے یا عجیب و غریب لہجے میں سوال کرتا ہے۔ ایسا بارہا اور بار بار ان چینلوں میں ہوا جس کی ریکارڈنگ یوٹیوب پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہاں لاکھوں کے قریب پاکستانی رہتے ہیں جو اپنی کمائی سے ان علمائے کرام اور انکی مساجد کا خرچہ اٹھاتے ہیں، بلکہ ان علماء کے پاکستان میں مراکز، مساجد اور مدرسوں کیلئے بھی رقم مہیا کرتے ہیں۔ وہاں رہنے والے پاکستانی گرم جوش اور ایمان افروز تقریر سنتے ہیں، کفر کے فتوے اور الزامات بھی ان کے کانوں سے ٹکراتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں کوئی سپاہ محمد اور لشکر جھنگوی نہیں بن سکا۔ کسی نے جتھوں کی صورت منظم ہوکر اپنے مخالف کو قتل کر کے جنت کمانے کی نہیں سوچی، وہاں کسی کو لاؤڈ سپیکر ایکٹ نافذ کر کے مساجد میں صرف عربی میں خطبہ دینے کی پابندی عائد نہیں کرنا پڑی۔ کبھی کسی نے ایک لمحے کیلئے بھی غور کیا ہے کہ اگر مسالک کی لڑائی اور فرقہ واریت کے مواد کی فراہمی قتل و غارت کی بنیاد ہوتی تو یہ لٹریچر سب سے آزادانہ طور پر برطانیہ میں ملتا ہے اور ہر کوئی انٹرنیٹ کے ذریعے گھر بیٹھے وہ تمام مواد پڑھ بھی سکتا ہے اور تمام تقریریں سن بھی سکتا ہے۔ پھر وہاں سے اگر کوئی جہادی پیدا بھی ہوا تو اس کا تعلق فرقہ واریت سے ہرگز نہ تھا بلکہ وہ تو خود برطانیہ اور امریکہ بلکہ پورے مغرب کے خلاف جہاں کہیں بھی مسلمان لڑ رہے تھے ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے کیلئے پہنچ گیا۔ یورپ، جہاں سے لوگ جہاد کرنے افغانستان، عراق اور شام جاسکتے ہیں اور جذبۂ ایمانی سے سرفروشی بھی سینوں میں موجود ہے، وہاں فرقہ وارانہ قتل و غارت کیوں نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جو ہمارے ملک میں انتظامیہ نے کبھی بھی اپنے سامنے نہیں رکھا، اس لیے کہ اس کا صرف اور صرف ایک ہی جواب ہے کہ انتظامیہ مکمل طور پر ناکام ہوچکی۔ برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے ایک محفل کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے جسے مناظرہ کہتے ہیں۔ یہ مناظرے اب مکمل طور پر ختم تو نہیں ہوئے لیکن بہت محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان میں ایک مسلک کا عالم دوسرے مسلک کے عالم کے آمنے سامنے بیٹھ کر لاکھوں لوگوں کے سامنے گرما گرم بحث کرتا اور پھر ہار جیت پر مناظرے کا فیصلہ ہوتا۔ انگریز نے بھی عیسائی پادریوں کو برطانیہ سے بلایا اور مناظروں کا اہتمام کروایا۔ پہلا مسلمان عیسائی مناظرہ کلکتہ میں 1815ء میں ایک عیسائی مشنری سکول میں منعقد ہوا۔ پیر مہر علی شاہ صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مناظرے تو مشہور ہیں۔ اس دور میں کفر کے فتوے لگانے والے بھی زندہ تھے اور گرم جوش تقریریں بھی کرتے تھے۔ ان کی کتابیں بھی موجود تھیں جن کو آج کے مولوی اٹھا اٹھا کر دکھاتے ہیں کہ یہ دیکھو کیا لکھا ہے، کیسی دلآزاری کی باتیں ہیں۔ لیکن ان سو ڈیڑھ سو سالوں میں کیا کبھی ایسے جتھے بنائے گئے کہ ایک دوسرے فرقے کے لوگوں کو قتل کیا جائے اور جنت حاصل کی جائے۔ حالانکہ جتھے اس وقت بھی بنتے تھے، مسلح جدوجہد بھی ہوتی تھی، آزاد ہند فوج بھی بنتی تھی اور بھگت سنگھ بم دھماکے بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ سب جتھے انگریز حکمرانی کے خلاف آزادی کی جدوجہد کے لیے بنائے جاتے تھے، مسلکی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے نہیں بنتے تھے۔ فرقہ وارانہ فساد تھے لیکن وہ بھی کبھی کبھار اور وہ بھی کسی موقع پر شرارت کی وجہ سے لیکن ان پر حکومت چند گھنٹوں میں قابو پالیتی تھی۔ کبھی لٹریچر پر پابندی یا لاؤڈ سپیکر پر صرف عربی خطبہ دینے کی پابندی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ مناظرے ہوتے رہے، لوگ لاکھوں کی صورت اپنے اپنے مسلک کے علماء کا ساتھ دینے ایک ہی پنڈال میں جمع ہوتے رہے۔ کبھی کسی نے یہ سوال کسی اعلیٰ سطح کا اجلاس اور ایکشن پلان بناتے وقت اپنے سامنے رکھا کہ اس فرقہ وارانہ شدت پسندی اور جہادی تصورات کے مقبول ہونے کی وجہ جمعہ کا خطبہ، لاؤڈ سپیکر کا استعمال یا لٹریچر نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔ اس "کچھ اور" کو اہلِ اقتدار خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں۔ اس "کچھ اور" کو وہ تمام علماء کرام بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور انہیں علم ہے کہ یہ سب کیوں، کس نے اور کب شروع کروایا۔ کون اس کو سرمایہ فراہم کرتا ہے، کون پناہ گاہیں مہیا کرتا ہے، کہاں سے اسلحہ آتا ہے، کس کس ملک میں جاکر قاتلوں کو پناہ ملتی ہے۔ لیکن ان سب نے جو جن بنائے تھے، وہ بوتل سے باہر آچکے ہیں، اور انہی علماء اور اسی انتظامیہ کی گردن پر سوار ہوچکے ہیں۔ اب ان جتھوں کی قیادت علماء کے ہاتھ میں نہیں بلکہ علماء کی قیادت ان کے ہاتھ میں آچکی ہے۔ رہا مسئلہ انتظامیہ کا تو جب بندوق کسی گروہ کے فرد کے ہاتھ میں تھمادی جاتی ہے تو پھر اس بات کا ذمہ کوئی نہیں لے سکتا کہ وہ آپ کی جانب رخ نہیں کرے گی۔

کوئی اس "کچھ اور" وجہ پر غور کرنے کو تیار نہیں۔ کوئی یہ الزام لگاتا ہے کہ جمعہ کا خطبہ گمراہ کرتا ہے اور دوسرا یہ کہتا ہے عدالتیں فیصلہ نہیں کرتیں۔ کیسے کیسے "عظیم عقل و فہم" کے مالک دانشور، انتظامی آفسر ایسے ممالک کی مثال لے کر آتے ہیں جن کا نفرت سے نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے اور یہ دلیل دیتے ہیں، کہ دیکھو وہاں ایک ہی جمعہ کا خطبہ ہوتا ہے جو سرکاری طور تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان صاحبانِ علم کو مشورہ دیتے ہوئے کم از کم ایک بار یہ سوچ لینا چاہئے تھا کہ ان ممالک میں پابندی صرف جمعہ کے خطبہ پر نہیں ہے بلکہ ہر ذریعہ اظہار پر ہے، صرف علماء پر نہیں ہر کسی پر ہے۔ سعودی عرب، ایران اور متحدہ عرب امارات کی مثالیں جس زور شور سے دی جارہی ہیں اور جس طرح صرف خطبہ جمعہ پر پابندی کو خالصتاً علیحدہ کر کے پیش کیا جارہا ہے اس سے اگر کوئی گروہ اپنا خاص مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اندازہ تک نہیں کہ وہ کیا بیج بو رہا ہے جس کی فصل بہت تلخ بھی ہوسکتی ہے۔ جن ملکوں میں مسجد کے مولوی کا گلا گھونٹا گیا ہے وہاں ہر آواز کا گلہ بھی ساتھ ہی گھونٹا گیا ہے تاکہ معاشرے میں سختی کی کوئی تفریق نہ ہو۔ سعودی عرب، ایران، اور دیگر عرب ممالک میں کوئی صحافی کسی اخبار یا ٹیلی ویژن پر حکومت سے پوچھے بغیر ایک لفظ بھی بول سکتا ہے، کوئی سیاسی پارٹی حکومتی مرضی کے بغیر بنائی نہیں جاسکتی ہے یہ ایک پیکیج ڈیل ہے۔ یہ پابندی معاشرے کے ہر طبقے پر لگتی ہے تو قابل قبول بنتی ہے ورنہ ایک طبقہ اپنے لیے اس امتیازی سلوک کا ردِعمل ضرور دکھاتا ہے۔ اگر جمعے کے خطبوں، لٹریچر، مسلکی نعروں اور تقریروں سے قتل و غارت برپا ہوتا تو برطانیہ میں لوگ ایک دوسرے کو مسلسل قتل کر رہے ہوتے، وہاں سے عراق، افغانستان اور شام میں جاکر نہ لڑتے۔ دنیا میں جہاں بھی دہشت گردی پر قابو پایا گیا وہاں قوت بازو کے ساتھ اس بات پر بھی غور کیا گیا کہ ہم کہاں غلطی کر رہے ہیں۔ کیا ہماری غلطیوں سے لوگ نفرت کے الاؤ میں تو نہیں جل رہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

پرانے شکاری نیا جال لائے

آج سے چالیس سال پہلے امریکی اسی طرح ایران کی وکالت کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو خطے کا امریکی پولیس مین کہا جاتا تھا۔ لیکن انقلاب ایران کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ امریکی اسی لہجے اور اسی زبان میں ایران کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آرہے جیسی وہ شاہ ایران کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ ایرانی بھی پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں امریکہ کے ساتھ اپنی گرم جوش محبتوں کی یاد میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا حال اس جوڑے کا سا ہے جو ساری دنیا میں اپنے خراب تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائے اور پھر حالات و واقعات انہیں خفیہ میل ملاپ پر مجبور کرتے رہیں لیکن دوبارہ ملنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن اب لوگوں کی باتوں کی پرواہ کرنے کا وقت گزر گیا۔ خطرہ بہت بڑا آن پڑا ہے۔ اب دونوں نے کھل کر پرانی محبتوں کو ایک بار پھر سے زندہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

دونوں کے خفیہ معاشقے اور از سر نو میل ملاپ کا آغاز افغانستان میں ملا محمد عمر کی سربراہی میں طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد ہوا تھا۔ ایران پر معاشی پابندیاں تھیں کہ 1998ء میں ایرانی حکومت نے تیل اور گیس کے شعبے میں سرمایہ کاری کیلئے لندن میں کانفرنس بلائی جس کے نتیجے میں ایک فرانسیسی کمپنی نے ایران کے ساتھ دو ارب ڈالر کا معاہدہ کیا۔ امریکی صدر بل کلنٹن پہلے بہت چیخا اور پھر اس نے کمپنی کے لئے پابندیاں ختم کر دیں۔ پھر تو تانتا بندھ گیا' ہالینڈ، ناروے' اٹلی اور ملائشیا کی کمپنیاں ایرانی تیل اور گیس میں سرمایہ کاری کرنے لگیں۔ ایسی ہی ایک کانفرنس اب فروری 2015ء میں دوبارہ لندن میں ہونے جا رہی ہے۔ لیکن اس کانفرنس سے ایک سال پہلے ہی (P5+1) یعنی فرانس' امریکہ' روس' چین' برطانیہ اور جرمنی گزشتہ جنوری میں ایران کو سات ارب ڈالر کی تجارت پر سے پابندیاں اٹھا چکے ہیں اور اس سال نومبر میں اس معاہدے کو مستقل شکل دے دی گئی ہے۔ یہ امریکہ اور ایران کے گزشتہ پندرہ سالہ خفیہ معاشقے اور میل ملاپ کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ اگر ایران افغانستان میں امریکی جارحیت کو مستحکم کرنے کے لئے طالبان مخالف شمالی اتحاد کا ساتھ نہ دیتا تو امریکہ شاید ہی زمینی طور پر افغانستان میں داخل ہونے کا سوچتا۔ یہی صورت حال عراق میں بھی تھی۔ عراق کی افواج کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں کوئی قابل ذکر فوج موجود نہ رہے' جبکہ دوسرا مقصد ایران کو ایک کمزور' دست نگر اور ایران کا محتاج عراق مہیا کرنا تھا تاکہ ایران سے شام تک ایک پٹی ایسی تخلیق کر دی جائے جس سے بوقت ضرورت کام لیا جاسکے۔ اسی لیے شدید عراق کی جنگ اور گرم گرم تقریروں کے باوجود بھی ایران پر سے پابندیاں بھی نرم ہوتی رہیں اور کاروبار بھی چلتا رہا۔

انعامات کی بارش کا ایک اور دھماکہ ہونے جا رہا ہے۔ امریکہ ہر سال اسرائیل اور امریکہ کے تعلقات پر ایک خصوصی اجلاس بلاتا ہے جسے بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس سال اس اجلاس کا نام تھا

NationalSummittoRe-asses

TheUS-Israel:SpecialRelationship

اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسرائیل کو اس بات پر قائل کرنا کہ اگر ایران ایٹمی پروگرام جاری بھی رکھے تو دنیا اور خصوصاً اسرائیل کیلئے خطرہ نہیں ہے۔ امریکہ اسرائیل تعلقات کے اہم ترین فرد پال پلر PaulPiller نے اپنا طویل مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا CanWeLiveWithNucelearIran۔ پال پلر 1978ء سے سی آئی اے سے وابستہ ہے اور وہ ان چند امریکیوں میں سے ہے جن پر اسرائیلی اعتماد کرتے ہیں۔ اس مضمون کے علاوہ اس کی گفتگو ایرانی مزاج اور وہاں کے رہنماؤں کے رویے پر بیش بہا عبور سے پُر تھی۔ جس نے بھی ایران میں چند دن یا سال گزارے ہوں اسے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایرانی اپنی گفتگو کے آغاز اور انجام میں بہت سے مرصع اور مسجع فقرے استعمال کرتے ہیں اور نیا نیا آدمی ان سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ ایسے تمام فقرے رسمی ہوتے ہیں اور ان کا کوئی مطلب نہیں لینا چاہیے۔ وہ کہتا ہے ایرانی مزاج کو سمجھو۔ پال پلر نے اسرائیلیوں کو قائل کرنے کیلئے ایک مخصوص لفظ کا بھی استعمال کیا کہ ایرانیوں کو حالات کے مطابق اپنے خیالات چھپانے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ پال پلر نے پاکستان اور بھارت کی بھی مثال دی ہے اور کہا کہ ان دونوں کے ایٹمی پروگرام زیادہ خطرناک ہیں۔ خصوصاً پاکستان کا پروگرام کیونکہ اس کے ساتھ کئی گنا بڑی طاقت بھارت ہے اور وہ خطرے میں بھی ہے جب کہ ایران کا کوئی پڑوسی بھارت جیسا نہیں۔ اس نے ایران کے اسرائیل کے خلاف بیانات کو ان کے اسلامی انقلاب کی داخلی مجبوری قرار دیا ہے اور کئی ایسے مواقع بتائے جب عالمی سطح پر ایران نے اسرائیل کے معاملے میں خاموشی اختیار کئے رکھی۔ یہ اچانک تعلقات میں گرم جوشی اور محبتوں کا سر عام اظہار کرنے کی ضرورت کیسے آن پڑی۔ صدام حسین کی حکومت ختم کرنے کے بعد امریکیوں نے اربوں ڈالر خرچ کر کے 8 لاکھ افراد پر مشتمل ایک وفادار عراقی فوج بنائی جسے وہ اپنا سرمایہ خیال کرتے تھے۔ لیکن داعش کے بیس سے پچیس ہزار افراد اس قدر پیش قدمی کریں کہ چالیس فیصد عراق اور شام کا کافی علاقہ ان کے قبضے میں آجائے اوباما اور امریکیوں کے لئے یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے جس نے ان کے تمام عزائم چکنا چور کر دیئے ہیں۔ سی آئی اے کی جانب سے تمام میڈیا پر ایک پراپیگنڈہ جنگ کا آغاز کیا گیا۔ پہلے کہا گیا داعش امریکی ہیں' پھر کہا گیا اسرائیل نے بنائی ہے۔ ادھر اسرائیل نے الزام لگایا کہ سعودی عرب ان کو تین سو بلین ڈالر دے چکا ہے' ترکی پر الزامات کی بوچھاڑ ہے کہ وہ انہیں مدد فراہم کرتا ہے لیکن اب یہ پراپیگنڈہ ناکام ہو گیا۔ اسے ناکام کرنے میں ان لوگوں کا بہت بڑا کردار ہے جو امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا اور یورپ کے ممالک سے جوق در جوق عراق اور شام میں لڑنے چلے آئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس منفی پراپیگنڈے کی اصلیت جانتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ایسی سازشی تھیوریاں کہاں بنتی ہیں' کون بناتا ہے اور کیسے انہیں مقبولیت ملتی ہے۔ اب امریکہ کے لئے کوئی اور راستہ باقی نہ تھا۔ مقابلہ کرنا ہے تو کھل کر سامنے آنا ہوگا۔ اس کے لئے امریکہ کو سب سے قابل اعتماد ملک ایران نظر آیا۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستیں بھی ساتھ ہیں لیکن مسلکی حوالے سے ان کے عوام کی ہمدردیاں داعش کے ساتھ ہو سکتی ہیں اس لئے کسی ایسے ملک کی تلاش تھی جہاں مسلک مختلف ہو اور جو داعش کیلئے خطرناک حد تک مہلک ثابت ہو سکے اور اس کے عوام بھی اس کا ساتھ دیں۔ اس کیلئے لبنان کے حزب اللہ' شام کے بشار الاسد' عراق کی امریکی پٹھو حکومت اور ایران ایک ایسا مضبوط اتحاد بنتا تھا جس کو داعش کے خلاف مسلکی سپورٹ بھی حاصل ہو گی اور حکومتی بھی جبکہ سعودی عرب اور دیگر خلیجی حکمران اپنی کمزور حکومتوں کو بچانے اور اس پھیلتے ہوئے طوفان کو روکنے کیلئے ان کے ساتھ اکٹھا ہو چکے ہیں۔ ایران کے خلاف پابندیاں نرم کرنے کیلئے سعودی وزیر خارجہ نے اہم کردار ادا کیا۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس ایجنسی موساد کے سابق سربراہ افرائیم ہیلوی (EfraimHalevy) اور موجود سربراہ تیمر پارڈو Pardo Tamir نے مشترکہ طور پر کہا ہے کہ اگر ایران ایٹم بم بنا بھی لے تو وہ اسرائیل کے لئے خطرہ نہیں' جبکہ موساد کے مشہور زمانہ سربراہ میئر دیگان MierDegan نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے احمقانہ بات نہیں سنی کہ اسرائیل' ایرانی تنصیبات پر حملہ کرے۔ یہ بدلتی صورت حال ہے۔ ایران سے محبتوں کا وہ عالم جو مشرق وسطیٰ اور بحیرہ عرب میں ساٹھ کی دہائیوں میں تھا۔ مشرق وسطیٰ اور بحیرہ عرب میں امریکہ کے پرانے پولیس مین کو پھر تاج وفاداری پہنایا جا رہا ہے۔ ایسے میں مجھے وہ دن بہت شدت سے یاد آرہا ہے جب میں 2008ء میں ایرانی بندرگاہ چہار بہار پر بیٹھا ایک بلوچ ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ ان چالیس لاکھ کے قریب بلوچوں میں سے چند پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھا ورنہ باقی سب بلوچ تو ایرانی قومیت کے محکوم۔ اس نے بھارت کے ان انجینئروں اور اعلیٰ سرمایہ داروں کو بتایا جو اس بندرگاہ سے افغانستان اور وسطیٰ ایشیا تک سڑک بنا چکے تھے۔ کہنے لگا یہاں تو بلوچستان یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی حیدر آباد دکن کا ایک بھارتی ہے۔ آنے والے کل میں ہم کہاں کھڑے ہوں گے۔ اس امریکہ کے ساتھ جو ہم پر بھروسہ نہیں کرتا یا اس بھارت سے تجارتی معاہدے کر رہے ہوں گے جس نے ایسے ہی معاہدوں سے بنگلہ دیش کو کنگال کیا۔ ہمیں احساس تک نہیں کہ داعش کے 25 ہزار لوگ اتنا بڑا خطرہ نہیں جتنا بڑا خطرہ ہمارا ایٹمی پروگرام ہے اور ہمارے حق میں اسرائیل کی موساد کا کوئی سربراہ کبھی بیان نہیں دے گا......اور بھارت......

KitaabPoint.blogspot.com

قبضہ گروپ اور عوامی احتجاج

آئین کی کتاب کو مقدس الہامی کتاب کی طرح لہرا کر اس کے ورق ورق کے تحفظ کی کیوں قسم کھائی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ جلا دو‘ سپریم کورٹ جلا دو‘ کیبنٹ سیکرٹریٹ جلا دو‘ بس ایک فقرہ رہ گیا‘ پورے اٹھارہ کروڑ عوام کو جلا کر خاکستر کر دو، لیکن یہ چند مقدس اوراق بچا لو۔ انہیں ضرور بچانا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ ان لوگوں نے تحریر کئے ہیں‘ یہ اس نسل کے ذہن رسا کا نتیجہ ہیں جنہوں نے انگریز کی غلامی میں آنکھ کھولی اور جن کی اکثریت خود اور ان کے آباؤ اجداد انگریز سرکار سے وفاداری اور اپنی قوم سے غداری کے صلے میں بڑی بڑی جائیدادیں‘ اعلیٰ نوکریاں اور شاندار مراعات لینے کے بعد اس مملکت کے عام اور سادہ لوح غریب عوام پر مسلط ہو گئی تھی۔ آئین کے خالق جن لوگوں کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے‘ ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی اکثریت کے حسب نسب اور اچانک اپنے علاقوں میں انگریز سرکار کے طاقتور نمائندہ ہونے کی تاریخ آج بھی ڈسٹرکٹ گزیٹیئرز اور ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر میں موجود فائلوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر کسی کی قیمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور وفاداریوں کی داستان بھی۔ نہ کوئی میر بچتا ہے نہ پیر‘ نہ وڈیرا پیچھے رہتا ہے اور نہ سردار‘ نہ چوہدریوں کا دامن صاف اور نہ ہی خانوں کا۔ تاریخ کے اس حمام میں بہت سے ننگے ہیں اور جس نے اپنے کپڑے بچائے وہ آج بھی اقتدار کی راہداریوں سے کوسوں دور ہے۔ آئین کے یہ خالق خوب جانتے تھے کہ کس طرح اس قوم کو حصوں بخروں میں بانٹ کر محکوم رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ جب تک محکوموں کے گرد مختلف لائنیں نہ بنائی جائیں، وہ آپس میں دست و گریباں نہیں ہوتے۔ سندھی‘ پنجابی‘ پشتونوں اور بلوچ مزدوروں اور کسانوں کے پسینے کی بو اور ہاتھوں میں پڑے گٹے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسے جہاں‘ جس جگہ مزدوری ملے‘ وہ رزق کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔ چار اکائیاں آسمان سے نہیں اتری تھیں‘ انہیں انگریز نے اپنے مقاصد کیلئے تخلیق کیا تھا اور پھر ان اکائیوں پر حکمرانی کرنے کیلئے یہ ”جمہوری“ خاندان پیدا کئے تھے۔ جس طرح کسان‘ ہاری‘ مرید اور ملازم ان کی رعایا ہیں اسی طرح جمہوریت بھی ان کے گھر کی ”لونڈی“ ہے۔ ایسی لونڈی کہ جو آقا کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ یہ مقدس چار اکائیاں اس قدر بالاتر ہیں کہ اس ملک میں ہر کوئی پاکستان کے ٹوٹ جانے کے خواب دیکھتا ہے، لیکن انگریز کے بنائے ہوئے ان چار صوبوں کو‘ ان کھینچی گئی لکیروں کا آپ تذکرہ کر کے دیکھیں‘ ہر کوئی خون کی ندیاں بہانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انگریز نے ان چاروں اکائیوں کا ایک ایک مرکز اقتدار بنایا تھا اور ان پر ان خاندانوں کو قابض کر دیا تھا۔ کیا کراچی‘ کوئٹہ یا پشاور جیسے شہر انگریز سے پہلے اقتدار کا مرکز تھے۔ لاہور بھی اکبر کے چند سال یا رنجیت سنگھ کی حکومت کے سوا اقتدار سے بہت دور رہا، لیکن کبھی لڑائی ہوتی ہے تو انہی چاروں مراکز اقتدار پر قبضے کی لڑائی ہوتی ہے۔ قبضہ گروپ یہ قبضہ چھوڑنا نہیں چاہتا اور آئین کی مقدس کتاب ہاتھ میں لہرا کر کہتا ہے اس میں لکھا ہے۔ ہم اس کے ورق ورق کی حفاظت کریں گے۔ اگر یہ ختم ہو گیا تو پھر دوبارہ ایسا آئین تحریر نہیں کر سکو گے۔ یقیناً ایسا آئین دوبارہ تحریر نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ زمینی حقائق بدل چکے ہیں۔ وہ نسل اب مملکت خداداد پاکستان میں اکثریت سے ہے جس نے انگریز کی غلامی کا طوق کبھی نہیں پہنا تھا۔

ان اقتدار کے مراکز پر قبضے کیلئے اور مخصوص لوگوں کو حکمرانی پر مسلط کرنے کیلئے انگریز نے ویسٹ منسٹر جمہوریت کا پارلیمانی نظام متعارف کروایا۔ اس نظام کے تحت ہر علاقے میں مخصوص نسل‘ رنگ‘ زبان اور برادری کی بنیاد پر کچھ لکیریں کھینچی گئیں۔ بار بار کے انتخابات نے اس قبضہ گروپ کو اس قدر کامیاب اور تجربہ کار بنا دیا کہ سوائے چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر کہ جہاں آبادی میں تیزی سے ردوبدل ہوتا ہے‘ باقی ہر انتخابی حلقہ کو انتہائی مہارت سے تخلیق کیا گیا ہے۔ ان حلقوں کو اگر ایک بڑے نقشے پر لکیریں کھینچ کر دکھایا جائے تو ایسی آڑھی ترچھی لکیریں وجود میں آئیں گی کہ ہنسی آئے گی۔ گوادر سے گلگت تک سب ایسا ہے۔ کراچی میں لسانی گروہ بڑھے تو کس شاندار طریقے سے ہر کسی نے ٹیڑھی ترچھی حد بندیاں بنا کر اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔

اس کے بعد جمہوریت کا وہ خوفناک کھیل شروع ہوتا ہے جسے اکثریت کی آمریت کہتے ہیں۔ دنیا بھر میں مفکرین اور سیاسی دانشور Tyranny of Mojority سے نجات پر لکھتے آرہے ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک حلقے میں اگر ایک لاکھ ووٹ ہیں تو اکیاون ہزار والا اسمبلی کا رکن اور 49 ہزار لوگ اس اسمبلی میں اپنی رائے سے محروم۔ پاکستان میں تو اس قبضہ گروپ کے لوگوں کو گروہ در گروہ تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک لاکھ ووٹوں میں سے پانچ پانچ دس دس ہزار کے چند گروہ پورے حلقے کو نسل‘ رنگ‘ زبان اور عقیدے کی بنیاد پر تقسیم کر دیتے ہیں اور 15 ہزار ووٹ لینے والا اسمبلی کا رکن۔ یوں 85 فیصد لوگوں کی اسمبلی میں آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ یہ سب انتہائی ہوشیاری‘ چالاکی اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے اور پھر دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا متبادل بتاؤ۔ متبادل سے پہلے ایک سوال کہ کیا پوری دنیا بھی برطانوی طرز انتخاب کی طرح کی پارلیمانی جمہوریت ہے۔ ہر ملک نے اپنے حالات کے مطابق اپنا نظام وضع کیا ہے۔ کیا کبھی کسی نے سوئٹزرلینڈ کے آئین اور انتخابی نظام کا مطالعہ کیا۔ پورا ملک چار زبانیں بولنے والوں میں تقسیم ہے۔ وہ اگر ہماری طرح حلقہ جاتی سیاست میں پڑتے تو وہاں بھی آج خونریزی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ وہاں کے کینٹن میں متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور ایک اسمبلی ممبر کئی اضلاع کے ووٹوں کی اکثریت سے اسمبلی تک پہنچتا ہے۔ ہر وہ سیاسی پارٹی جس کے چند ہزار ووٹ بھی ہوں اسمبلی میں اس کا نمائندہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ حلقہ بندیوں کی پاکستانی سیاست کا کمال یہ ہے کہ عوام کی اکثریت کی رائے اسمبلی تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ بار بار ہونے والے الیکشنوں میں سچے، کھرے اور ایماندار شخص کو ووٹ دیتے رہتے ہیں اور ان کے ووٹ تین سو سے زائد حلقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اگر پورے ملک کے ووٹ اکٹھے کر لیے جائیں، حلقہ بندیاں ختم کر دی جائیں، ہر پارٹی یا فرد کو کوئی کسی بھی جگہ سے ووٹ دے اور پھر ان ہی ووٹوں کی بنیاد پر اسمبلی کی رکنیت عطا ہو تو اسمبلی میں سو فیصد افراد کی آراء کی نمائندگی ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ ٹی وی پر بولنے والا ایک ہارا ہوا سیاستدان پورے ملک میں اتنے مداح ضرور رکھتا ہو گا کہ ایک سیٹ کے برابر ووٹ لے سکے۔ لیکن اس کے مداح پورے ملک میں تقسیم ہیں، اس لیے وہ قبضہ گروپ کی بنائی ہوئی حد بندیوں میں الیکشن نہیں جیت سکتا۔ ایسا ہو تو پھر عوام کی وہ اکثریت کسی پارلیمنٹ میں نمائندگی سے محروم رہ جاتی ہے اور وہاں قبضہ گروپ دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ قبضہ گروپ اور عوام کے ساٹھ سالہ غصے کا مقابلہ اور بدترین نظام سے نجات کی آوازیں ہیں۔ یہ آوازیں اس ننانوے فیصد عوام کی نمائندہ بن جایا کرتی ہیں جنہیں تھانے، پٹوار خانے، کسی سرکاری دفتر یا ادارے سے انصاف نہیں ملتا، جو ہسپتالوں سے محروم اور بنیادی سہولیات سے ناآشنا رہے ہوتے ہیں۔ ہر کسی کا اپنا غصہ اور غم ہوتا ہے۔ انہیں اس بات کی پروا تک نہیں ہوتی کہ ہجوم کی قیادت کون کر رہا ہے۔ وہ اپنی انتقام کی آگ لیے ہوتے ہیں۔ اسی آگ کے شعلوں کو دیکھ کر قبضہ گروپ کو جب اپنا بنایا ہوا تاج محل مسمار ہوتا لگتا ہے تو انہیں آئین اور قانون کی کتابیں یاد آتی ہیں۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ لیکن غصے میں بپھرے ہجوم کو یقین ہوتا ہے کہ آئین اور قانون کی کتابوں سے ہی تو انہیں ساٹھ سال انصاف اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔

تحریکوں کی سیاست اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں یہ گنتی کی سیاست نہیں ہوتی۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان سے لے کر عدلیہ کی بحالی تک لوگوں کا ہجوم ہزاروں کی گنتی میں تھا۔ لیکن یہ ہزاروں لوگ تاریخ کا پہیہ موڑ دیتے ہیں۔ قبضہ گروپوں کی چالیں ان کے منہ پر مار دیتے ہیں۔ یہ ایک دفعہ کچلے جائیں تو کچھ عرصے بعد پھر نکل آتے ہیں اور زیادہ زور و شور سے نکلتے ہیں۔ دنیا کی کوئی جمہوریت قبضہ گروپوں سے زبردستی اقتدار چھیننے کے بغیر مستحکم نہیں ہو گی، خواہ وہ فرانس میں بادشاہ لوئی اور ساتھیوں کا خون بہا کر ہوئی ہو یا انگلینڈ میں چارلس اول کو عوامی پارلیمنٹ سے سزائے موت دے کر۔

KitaabPoint.blogspot.com

راہِ نجات

دنیا کے ادب میں تین سفرنامے عالمِ بالا کی خبر لاتے ہیں۔ یہ سفر عالمِ حیرت کے ہیں اور روحانی تجربات سے لبریز۔ ان میں سے آخری علامہ اقبال کا جاوید نامہ ہے۔ اس سے پہلے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اس طرزِ تحریر کے بانی محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہؔ ہے۔ ابنِ عربی دنیائے اسلام کا وہ فرزند ہے جسے عرفاء شیخ اکبر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قرطبہ جس کی علمی روایت پر یورپ نے تحریک احیائے علوم کی بنیاد رکھی، ابنِ عربی اسی سرزمین میں پیدا ہوا۔ عقلیت، فلسفہ اور منطق کی گتھیوں کو سلجھاتا ہوا، روحانی سفر کا راہی بن گیا اور بغداد و دمشق کی خاک چھانی۔ اُس کی کتاب فصوص الحکم تصوف کے راستے کے مسافروں کے لئے ان چند کتابوں میں سے ایک ہے، جنہیں پڑھنے سے پہلے تزکیہ، تقویٰ اور ایمان کی پختگی کی معراج حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس میں کائنات کے ایسے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا گیا ہے، جنہیں چھپانے میں ہی صوفیاء عافیت سمجھتے تھے کہ ایسا صرف ان آنکھوں پر آشکار ہونا چاہیے جو اللہ کے خوف سے مدتوں بھیگی رہی ہوں اور جنہیں یقین کی حد تک ایمان کی دولت میسر ہو۔ محی الدین ابن عربی، قرآن کے علوم کا غوآص اور تعلیماتِ بحرِ رسالت میں غوطہ زن رہتا اور قرآن و سنت سے آبدار موتی چن چن کر لاتا۔ ابن عربی کا ایک رسالہ آج کے دور کے بارے میں پیش گوئیوں پر مشتمل ہے۔ وہ مغربی دنیا کے ناسٹروڈمس سے بہت پہلے ان باتوں کا ذکر کر چکا ہے۔ یہ پیش گوئیاں آج حرف بحرف سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی اُس حدیث کے مطابق کہ ''مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے'' آنے والے زمانوں کے دھندلکے میں جھانک رہا تھا۔ ابن عربی کی ان پیش گوئیوں کو دیکھئے اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیجئے کہ تقریباً سات سو سال قبل پیدا ہونے والے شخص کو اللہ نے کس علم کی دولت سے سرفراز کیا تھا:۔

1۔ ''اگر تم مشرقی ہو تو تمہارا مغربی حصہ اچھا ہے' اگر تم مغربی ہو تو مشرقی سمت اچھی ہے' تم فاتح ہو تو ذمیوں اور مفتوحوں سے حالت بدتر ہے اور محکوم ہو تو حاکم قابل رشک و حسد بنا ہوا ہے۔ تم اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ قرب قیامت میں ایسے دن آئیں گے کہ مشرق والے مغرب کی تعریف کریں گے اور اس کی خوبیوں پر فریفتہ ہوں گے اور مغرب والے مشرق کے محاسن پر شیفتہ ہوں گے۔ دولت مند مفلسوں کو بہتر سمجھیں گے اور مفلس دولت مندوں کو حسرت سے دیکھیں گے۔ غرض ایک دوسرے کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلتے ہوں گے۔ لوگ اپنے اندر کی خوشیوں اور خوبیوں کو بھول جائیں گے۔''

2۔ ''اس دور میں خوشی شراب کے عوض خریدی جائے گی۔ انسان کو قدرے اطمینان و سکون صرف نیند کی نیم بے ہوشی میں میسر آ سکے گی۔''

3۔ ''اس زمانے میں عورتیں مردوں کے مراتب عقل و ہنر سے بڑھ جائیں گی اور مردوں کی مردانگی فقط رسمی رہ جائے گی۔''

4۔ ''چاندی اور سونے کی قدر گھٹ جائے گی اور لوہے کی قدر بڑھ جائے گی۔ چاندی اور سونے کی ہم شکل دھاتیں نکل آئیں گی اور ان کی اشیا گھر گھر رواج پائیں گی۔''

5۔ ''آخرت کے راستوں سے بے پروائی ہو گی اور شہروں کے راستے بہت خوبصورت بنائے جائیں گے۔''

6۔ ''بازاروں میں بیٹھ کر کھانا فخر سمجھا جائے گا۔ تم کھانا کھانے کے لئے بھی لوہے کے ہاتھ بناؤ گے۔ تمہارے دسترخوان سینے کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

7۔ ''لباس دامن بریدہ پہنایا جائے گا اور اس میں اتنی زیادہ قسمیں ہوں گی کہ آج ان کا خیال آنا بھی دشوار ہے۔''

8۔ ''ماں باپ کی عزت مثل ایک دوست کے ہو گی، بیویوں کو سجدہ کیا جائے گا۔''

9۔ ''مذہب کا نام لے کر حکومت کی جائے گی لیکن صحیح معنوں میں مذہب کی پابندی نہ ہو گی۔''

10۔ ''استادوں کی حرمت چھن جائے گی۔''

11۔ ''تمہاری جوتیاں زمین کی پشت ٹھکرانے والی اور چلنے میں تم کو مغرور بنانے والی ہوں گی۔ تم جوتیوں کے آگے سر جھکاؤ گے اور عماموں کو پامال کرو گے۔''

12۔ ''بازاروں میں بھی تم دیکھو گے کہ رات کے وقت سورج سوا نیزے پر نظر آتا ہے۔ یہ سورج جگہ جگہ ہوں گے اور تم کو سہانی روشنی دیں گے' مگر اس وقت تمہاری بصارت اور بصیرت میں خلل پڑ جائے گا۔''

13۔ ''خیرات لینے اور دینے کے نئے نئے ڈھنگ نکل آئیں گے، نفسی نفسی کی پکار ہو گی۔ کوئی کسی کے نیک اور بد سے سروکار نہ رکھے گا۔''

14۔ ''خدا کے نام کے بغیر کتابیں لکھی جائیں گی۔ تمہارا لکھنا بھی لوہے کا محتاج ہو گا اور تمہاری کتابیں بھی لوہے کی دستکاری سے تیار ہوں گی۔ اس زمانے میں آدمی اپنے خیالات دوسرے ملکوں اور شہروں کے باشندوں کو آن کی آن میں بھیج دیا کریں گے۔''

15۔ ''غریب اور مفلس امیروں کی برابری چاہیں گے۔ تم سے دس قسم کی زکوٰۃ لی جائے گی۔''

16۔ ''یہی وہ وقت ہو گا جب تلواریں نیاموں سے تڑپ تڑپ کر نکلیں گی اور آگ کی بارش ہو گی۔ اس بارش میں آگ کے بھاری بھاری اولے ہوں گے جو آدمیوں کو دم بھر میں تباہ و برباد کر دیں گے۔''

17۔ ''غور سے سنو! ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیں گے۔''

18۔ ''تمہاری عورتیں ہتھیار باندھ کر میدان میں جائیں گی، اس دن کے ہر باشندے کو جنگ کا بلاوا آئے گا' یہ جنگ دین اور ملک کے لیے نہ ہو گی بلکہ خدا کا قہر ہو گا جو بندوں پر نازل ہو گا۔ اس دن کسی خون کے قطرے میں عدل و انصاف کی بو نہ ہو گی۔ اس دن زمین بھی تمہاری لاشوں کو اپنے اندر نہ آنے دے گی۔ وہ بڑا ہولناک زمانہ ہے۔ تم اگر اس زمانے میں موجود ہو تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔ خدا کے حضور سجدے میں گر کر پناہ مانگو، خداوند تعالیٰ ہی تم کو اس تباہی و بربادی سے نجات دے سکتا ہے۔ خدا کے نیک بندوں کو اس وقت گھبرانا نہیں چاہیے جو اپنے خالق حقیقی کا دامن تھام لیں گے ان کو وہ عافیت دے گا۔''

19۔ ''قیامت سے پہلے ایک وقت ایسا آئے گا کہ عرب قبائل کی طرح جہالت تمام دنیا میں پھیل جائے گی۔ تیل اور خون اور کئی بنا پر لڑائیاں ہوں گی۔ نیک اور عقلمند چاہیں گے کہ یہ بے وقوفی کی ضد ختم ہو جائے۔''

20۔ ''بادشاہوں کے محل سرنگوں ہو جائیں گے' دولت مندوں کے گھروں میں فاقہ کشی ہونے لگے گی۔ عورتوں اور بچوں کی لاشیں جنگلوں میں پڑی سڑتی ہوں گی۔ اس جنگ کے بعد کوئی شخص بادشاہوں کی بات نہ مانے گا اور گھر گھر کی علیحدہ حکومت ہو گی۔''

ابنِ عربی کی اس نورِ بصیرت سے لکھی گئی پیش گوئیوں سے عام آدمی حیران رہ جاتا ہے' لیکن اگر کوئی اس علم کے سمندر میں اترنے کی کوشش کرے جو مخبرِ صادق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے عطا کیا ہے تو آج کے دور کے فتنہ و فساد، قتل و غارت اور بے چینی و بے سکونی کی تہہ تک پہنچنے اور ان سب کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے تو سب کچھ کھول کھول کر بتا دیا۔ فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں آدمی کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ احمق (پرانے خیالات والا) کہلائے یا بدکاری کو اختیار کر لے۔ جو شخص یہ زمانہ پائے اُسے چاہیے کہ بدکاری اختیار کرنے کی بجائے احمق کہلانا پسند کرے۔'' (کنز العمال) پھر فرمایا: ''تمہیں اس طرح چھانٹ دیا جائے گا جس طرح اچھی کھجوریں ردّی کھجوروں سے چھانٹ لی جاتی ہیں۔ تم میں سے اچھے لوگ اٹھتے جائیں گے اور بدترین لوگ باقی رہتے جائیں گے۔'' (ابن ماجہ) ایک جگہ فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دین پر ثابت قدم رہنے کی مثال ایسے ہو گی کہ کوئی شخص آگ کے انگاروں سے مٹھی بھرے۔'' (ترمذی) نجات کا راستہ وہی ہے جو میرے آقاؐ نے بتایا اور ابنِ عربی نے اس کو نقل کیا اور کوئی راہِ نجات نہیں: ''تم اگر اس زمانے میں موجود ہو تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو' خدا کے حضور سجدے میں گر کر پناہ مانگو' خداوند تعالیٰ ہی تم کو اس تباہی و بربادی سے نجات دے سکتا ہے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

ڈوبتا ڈوبتا رہا

درویش کی محفل میں سناٹا تھا۔ شاید اس قیامت کے دکھ کے بعد لوگ بات کرنا بھول گئے تھے۔ ہر کوئی صاحب اولاد ہوتا ہے اور ہر کسی کو بچوں میں اپنی اولاد کے چہرے نظر آتے ہیں۔ ایسا تو شاید ہی انسانی تاریخ میں کسی ہلا کو نے بھی نہ کیا ہو کہ بچوں کو علیحدہ کر کے' ان کے معصوم چہروں پر نظر پڑنے کے باوجود بھی ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی ہو۔ دنیا کی جنگوں کی تاریخ میں بم برستے رہے' شہر اجڑتے رہے' لوگ مرتے رہے لیکن ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ تاک کر بچوں کے سکول کو نشانہ بنایا جائے' یا پھر وہاں گھس کر یہ وحشیانہ کھیل کھیلا جائے۔ سنتے آئے تھے کہ منگول اور ایشائے کوچک سے آنے والے منگول نسل کے لوگوں سے پہلے دنیا میں بہت سی وحشیانہ سزاؤں کا رواج نہیں تھا' کھال میں بھس بھرنا' سلائیاں پھیر کر اندھا کرنا' ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کو موت کی جانب لے جانا' لیکن ان وحشیانہ سزاؤں کے موجدوں نے بھی کبھی بچوں کو علیحدہ کر کے نہیں مارا۔ بچے ماں باپ کی آغوش میں ایک ساتھ ضرور مارے گئے ہوں گے' بے خبری میں ان پر بم ضرور برسے ہوں گے' اچانک ان کو اکٹھے کسی افتاد کا سامنا ضرور کرنا پڑ گیا ہوگا جیسے ڈوبنا' آگ لگنا' یا سکول میں زلزلہ آجانا۔ ایسے میں موت کی آغوش میں جاتے ہوئے یہ ایک دوسرے کا ہاتھ ضرور تھام لیتے ہوں گے' ایک دوسرے کو تسلی کے لفظ ضرور بول لیتے ہوں گے۔ زندگی میں سب سے خوفناک منظر میں نے ان چھ تصویروں میں دیکھا تھا جو ایک فلسطینی بچے اور اس کے باپ کا منظر تھا۔ یہ منظر ایک فوٹوگرافر نے کیمرے کی آنکھ میں چند تصویروں کے ذریعے محفوظ کر لیا تھا۔ فلسطینی باپ اور بچہ اچانک اسرائیلی گولیوں سے بچنے کیلئے ایک دکان کے چھجے تلے پناہ لیتے ہیں دوسری تصویر میں بچہ سہا ہوا باپ سے لپٹا ہے' تیسری تصویر میں باپ اسے تسلی دے رہا ہے' چوتھی تصویر میں گولی بچے کو لگی ہے' پانچویں تصویر میں بچہ باپ کی گود میں درد سے کراہ رہا ہے اور چھٹی تصویر میں بچہ مر چکا ہے اور باپ بے بسی کی تصویر ہے۔ ان چھ تصویروں میں جو کیفیت تھی اس نے مجھے سالوں مضطرب اور بے چین رکھا' بلکہ آج بھی وہ تصویریں یاد آجاتی ہیں تو جی سنبھل نہیں پاتا۔ لیکن اس سانحے میں تو بچوں کو اپنے باپ کی گود بھی میسر نہ تھی کہ موت کے وقت اس آغوش کی گرمی اور محبت حاصل کر لیتے۔ اس المیے کا تصور ہی کیا' صرف اس بات کا سوچ میں لانا کہ چند لوگ اسلحے تانے ایک ہال میں داخل ہوتے ہیں جہاں بچے اپنے آپ میں مگن ہیں اور پھر اچانک سارا منظر خوفناک وحشت میں بدلنے لگتا ہے۔ اس پہلے لمحے کے آگے سوچنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ میں نے اب تک جو انسانی تاریخ پڑھی ہے' اس سے دردناک واقعہ نہیں پڑھا۔ خاندان کے خاندان قتل ہوئے' مارے گئے' ہلاک ہوئے' لیکن ایک ساتھ' ہر کوئی بے بس اور مجبور۔ لیکن یہاں تو بے بسی خاص طور پر ان معصوم بچوں کے مقدر میں آئی۔ بچے یرغمال بنائے گئے' ان کو اغوا برائے تاوان کیلئے لے جایا گیا' پھر سرمایہ نہ ملنے پر قتل کیا گیا۔ ان سارے معاملات میں بچوں کے دل میں ایک امید ضرور موجود رہتی ہے کہ شاید کوئی انہیں رہائی دلا دے۔ روس میں باسلان کے سکول میں جب چیچن گھس آئے تھے تو 280 کے قریب بچے مارے گئے تھے۔ مگر وہ سب روسی فوج اور چیچن جنگجوؤں کی لڑائی کے دوران مارے گئے۔ ایسے ماحول میں بھی ایک امید ضرور ساتھ چلتی ہے کہ جنگ ختم ہوئی تو ہم زندہ سلامت باہر نکل جائیں گے لیکن اس سانحے میں تو ان بچوں نے موت تک صرف موت ہی دیکھی' نہ کوئی آس' امید' نہ تسلی و تشفی اور نہ کسی مہربان کی گود۔ بس خوفناک آنکھوں اور شعلہ اگلتی بندوقوں کا سامنا تھا۔

درویش کی محفل میں سناٹا تھا۔ سب دم بخود تھے۔ کسی کو اس بات کا اندازہ تک نہیں تھا کہ انسان اس قدر خونخوار اور ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ اس سیدالانبیاء ﷺ کے ماننے والے جس نے اذیت دینے والے مشرکین مکہ کو جنگ بدر کے بعد جب قید کیا تو ان کو رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ رسیاں سخت تھیں' رات کو قیدیوں کی کراہنے کی آواز آئی تو بے چین ہو گئے' صحابہ سے کہا اگر تم کہو تو ان کی رسیاں ڈھیلی نہ کر دیں۔ اپنی دسترس میں آئے ہوئے لوگوں پر اسقدر رحم' دسترس میں بھی وہ لوگ جو چند گھنٹے پہلے جنگ لڑ چکے تھے' جو تیرہ سال مکے میں اذیتوں کے پہاڑ کھڑے کر چکے ہیں۔ محمد خراسانی کی ای میل جو اس ملک میں ہر صحافی کو بھیجی گئی۔ پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں' کیا پورے قرآن پاک اور سید الانبیاء ﷺ کی سیرت میں ان لوگوں کو کوئی رحم' عفوودرگزر اور بچوں پر شفقت کا ایک واقعہ بھی یاد نہیں آیا۔ اللہ اور اس کے رسول کا کونسا حکم ہے جو انتقام کی اجازت دیتا ہے۔ انتقام تو عصبیت اور قبائلیت کی صفت ہے جسے مٹانے کیلئے میرے آقاؐ اس دنیا میں تشریف لائے اور پھر حجتہ الوداع کے دن فرمایا ''تمہاری جاہلیت اور عصبیت کے بت میرے پاؤں تلے کرچی کرچی ہو چکے''۔ جس عصبیت کے بت میرے آقاؐ کے پاؤں تلے کرچی کرچی ہو جائیں' کیا اس عصبیت کے انتقام کا تمہیں آخرت میں اجر ملے گا۔ ہرگز نہیں۔ چلو تم نے پشتون روایات کے تحت بدلہ لے لیا ہے لیکن شاید بھول گئے' کیا پشتون روایات میں بچوں اور عورتوں سے کبھی بدلہ لیا گیا۔

درویش کی محفل کا سناٹا قائم تھا کہ میں نے سوال کیا' کب تک؟' فرمایا سورہ تغابن کی وہی آیت دہراؤ ''کوئی مصیبت آ ہی نہیں سکتی مگر اللہ کا اذن نہ ہو'' (تغابن 11)۔ پوچھا کیا یہ واقعی مصیبت ہے؟۔ بولے سورہ الانعام کی وہی آیت دہراؤ جو بار بار لکھتے رہتے ہو' ''کہہ دو' وہ قدرت رکھتا ہے اس پر کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے اور تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو آپس میں گروہوں میں بانٹ کر لڑا دے اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھا دے'' (الانعام 65): سوال کیا' بہت ہو گیا یہ عذاب' بہت چکھ لیا مزا ایک دوسرے کی طاقت کا' کوئی راہ نجات۔ بولے جب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس آیت کا نزول ہوا تو آپ نے ہاتھ دعا کیلئے بلند کر دیئے' اور کہا۔ اے اللہ' اے قادر مطلق' میں پناہ مانگتا ہوں ترے چہرے کے تقدس کی اس عذاب سے جو تو ہمیں گروہوں میں بانٹ کر ہمیں لڑا کر ہم پر نازل کرتا ہے''۔ فرمایا' تم لوگوں نے کبھی اپنے آقا کی اس صفت پر عمل کیا۔ کبھی پوری قوم گڑگڑا کر اللہ کے حضور روئی' سجدہ ریز ہوئی' معافی کی طلبگار ہوئی۔ کبھی کہا کہ اے اللہ ہم اس عذاب کے متحمل نہیں ہو سکتے' ہم پر رحم فرما۔ کبھی دیوانہ وار اللہ سے گڑگڑانے کیلئے باہر نکلے جیسے شمعیں روشن کرنے نکلتے ہو۔ ایک دفعہ نکل کے تو دیکھو' ایک دفعہ اسے آزماؤ تو سہی۔ وہ رب ہے' رحیم ہے' کریم ہے۔ اس کا دعویٰ ہے میں دلوں کو جوڑتا ہوں' اس کا دعویٰ ہے میں بھوک میں کھانا اور خوف میں امن بخشتا ہوں۔ وہ تو انتظار کرتے ہوئے پکارتا ہے کہ کوئی قوم یونسؑ کی طرح کی قوم کیوں نہ ہو گئی کہ ہم سے معافی مانگتی اور ہم اسے معاف کر دیتے''۔ میں درویش کے چہرے پر سناٹے سے دیکھتا رہا۔ باہر شمعیں روشن کرنیوالے اپنے دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں شمعوں کی لو ٹمٹمانے لگی' صرف پروردگار سے ایک التجا کی' اللہ ان شمعیں جلانے والے ہاتھوں کو اپنی بارگاہ میں ایسے اٹھنے کی توفیق دے جو تیری ناراضگی کو ختم کر سکے' جو اس خوف کے موسم میں امن واپس لا سکے۔ بیشک صرف تو ہی ہے جو خوف میں امن دیتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سازشی تھیوریاں۔ خوف اور میڈیا

دنیا بھر کا میڈیا جن تین بڑی کمپنیوں میں تقسیم ہے ان میں ایک کمپنی روپرٹ مرڈوک (RupertMurdoch) کی نیوز کارپوریشن ہے۔ اس شخص نے اپنے زیر سایہ کام کرنے والے افراد کو جو پالیسی گائڈلائن دی ہے اس کے چار نکات ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ دنیا بھر میں موسیقی کو الیکٹرانک اور ہیجان انگیز کر دو۔ اس لیے کہ دھیمے سروں اور روایتی سازوں سے مرتب کی جانے والی موسیقی سکون بخشتی ہے، انسان کو ایک ایسے کیف میں لے جاتی ہے جہاں وہ زندگی کا خوبصورت پہلو دیکھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جبکہ الیکٹرانک اور تیز سروں کی موسیقی ہیجان پیدا کرتی ہے اور آدمی کے اندر چھپے غصے، انتقام، جوش اور سفلی جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں کہیں پر بھی کوئی تحریک چلے، گروہ آپس میں لڑیں، جنگ چھڑ جائے، فساد برپا ہو، ان کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک سازشی تھیوری کے عنصر کو نمایاں کیا جائے۔ جسے عرف عام میں (Conspiracy) کہتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اگر کہیں عوام کی خواہشات سے کوئی تحریک جنم لیتی اور کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو لوگوں کے اندر یہ اعتماد کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے حالات کا رخ خود بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں بھی فساد برپا ہوتا ہے، تو لوگ اس کو ختم کرنے کے لیے اس لیے کوشاں نہیں ہوتے کہ وہ ہمت ہار چکے ہوئے ہیں۔ انہیں سازشی عناصر کی ریشہ دوانیوں کا درس اسقدر پڑھایا جاتا ہے کہ وہ یقین کر لیتے ہیں کہ اس میں لڑنے والوں کا تو کوئی قصور ہی نہیں، یہ تو امریکہ، برطانیہ یا ایجنسیاں پوری منصوبہ بندی سے لڑوا رہی ہیں۔ تیسری گائڈلائن یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں اگر کوئی ایسی قیادت ابھرے جسے لوگ پسند کرنے لگیں، اسے قبولیت کی سند حاصل ہو جائے تو اس کے کردار کو مشکوک کر دو۔ اسے کبھی کسی بیرونی طاقت کا ایجنٹ قرار دو یا کسی لابی کا پروردہ۔ اس کی اخلاقیات کے بارے میں معمولی سی بات بھی ملے تو اچھالو۔ اگر کوئی گروہ ایسا ہو جو عوام میں پذیرائی حاصل کر رہا ہو تو اس کے بارے میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور قتل و غارت کے افسانوں کو شہرت دو۔ جبکہ چوتھی بات یہ کہ خواہ فیشن ہو یا فلم و ڈرامہ، بڑے بڑے لوگوں کی کہانیاں ہوں یا سوشل لائف کے قصے ان سب میں جنس کو نمایاں کرو۔ جنسی بھوک اور ہیجان ایسی چیز ہے جو سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی سوچ کی جانب راغب نہیں ہونے دیتی۔

یہ چاروں اصول آپ کو دنیا کے اکثر میڈیا ہاؤسز میں پیش کیے جانے والے پروگراموں میں نظر آئیں گے۔ آج کے چوبیس گھنٹے چلنے والے الیکٹرانک اور اخبارات کے کالم نگاروں نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات اتاری ہی نہیں بلکہ دماغوں میں ٹھونس دی ہے کہ اس ملک میں جتنی بھی تحریکیں چلتی ہیں، جتنے فساد ہوتے ہیں، جو بھی قتل و غارت ہے وہ اوّل تو عالمی سازش کا حصہ ہیں یا پھر مقامی ادارے ان میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہ قصہ صرف میرے ملک کا نہیں دنیا میں جہاں کہیں بھی میڈیا کی گرفت میں آئے ہوئے انسان جاگنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ہاں کسی رہنما کے روپ میں امید انگڑائی لینے لگتی ہے تو عظیم دانشوروں، تجزیہ نگاروں اور سیاسی پنڈتوں کی فوج ظفر موج ایسے شاندار طریقے سے کہانی کے سکرپٹ بیان کرتی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ گلی میں ناراض ہو کر ٹائر جلانے والا شخص بھی براہِ راست امریکی سی آئی اے سے ہدایات لے رہا تھا۔ ایک زمانے میں کارپوریٹ دنیا کا چکا چوند چہرہ، یہی میڈیا جب کمیونسٹ دنیا کے ساتھ سرد جنگ لڑ رہا تھا تو ہر ملک میں جہاں کہیں ایسا لیڈر جنم لیتا جسے عوامی پذیرائی حاصل ہوتی تو اس کے ڈانڈے سی آئی اے اور امریکہ سے ملا دیئے جاتے۔ جہاں ایسی آزادی یا آمریت کے خلاف تحریکیں چل رہی ہوتیں ان کے گوریلوں کی انسانیت سوز مظالم کی داستانیں اس قدر خوفناک بنا کر پیش کی جاتیں کہ پورے مغرب کے عوام سہم کر رہ جاتے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ریاستی مظالم پر پردہ ڈالا جاتا، قتل ہونے، تشدد سے معذور ہونے اور لاپتہ افراد کا ذکر تک اخبارات میں نہ آتا۔ کمیونزم رخصت ہوا تو اب یہی انداز اسلام اور اسلامی دنیا کے بارے میں اپنایا گیا ہے۔ گزشتہ بیس سالوں سے جو مضامین اور سازشی تھیوریاں لکھی گئی ہیں ان سے اسلام اور مسلمان نکال کر کمیونزم اور کمیونسٹ شدت پسند لکھ دیا جائے تو نفس مضمون پر کوئی فرق نہ پڑے گا۔ یہ تھیوریاں خود خفیہ ایجنسیاں اپنے مخصوص لکھنے والوں کے ذریعے بھی پھیلاتی ہیں تاکہ لوگوں پر ان کا خوف اور دبدبہ قائم رہے۔

لیکن موجودہ تاریخ کے دو مواقع ایسے ہیں جب یہ سب کے سب ناکام ہوئے۔ پہلا انقلاب ایران تھا۔ اپریل 1978ء میں اٹھارہ خفیہ ایجنسیوں نے امریکی صدر جمی کارٹر کو یہ رپورٹ دی کہ ایران میں انقلاب کا دور دور تک کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اسی ماہ تہران یونیورسٹی سے چند سو طلبہ کے مظاہروں کا آغاز ہو گیا۔ ایک سال بعد جب ایرانی انقلاب آیا تو حیرت میں گم میڈیا کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا کہ ان انقلابیوں کو خونخوار بنا کر پیش کیا جائے۔ امریکی سفارت خانے کے محاصرے سے لے کر انقلابی عدالتوں کے تحت روزانہ قتل، "تودہ" پارٹی اور مجاہدین خلق کو منافقین کہہ کر قتل کرنا، اقلیتی فرقے بہائیوں کی نسل کشی اور ملک سے فرار، ایسے کتنے قصے تھے جو بڑھا چڑھا کر اخباروں کی زینت بنائے گئے۔ اس زمانے کے تجزیہ نگار ایک اور تھیوری بھی پیش کرتے کہ آیت اللہ خمینی کو دراصل امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے تاکہ ایران کو یورپی گروپ سے الگ کیا جائے اور ممکنہ مشرق وسطی کے تصادم کے دوران وقت آنے پر استعمال کیا جائے۔ لیکن وقت نے اس سارے افسانے کو اس لیے گرد میں دبا دیا کہ ریاست مستحکم ہو گئی۔

ایسی ہی کیفیت عراق اور شام میں ابھرنے والی قوت داعش اور قائم ہونے والی دولت اسلامیہ کی ہے۔ صدر اوباما بالکل صدر جمی کارٹر کی طرح اس گروہ کے بارے میں لاعلم تھا۔ گزشتہ ہفتے اس نے ایک ہفتہ وار ریڈیو انٹرویو میں کہا کہ ہماری کسی بھی خفیہ ایجنسی کو اندازہ تک نہ تھا کہ یہ گروہ اس قدر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اوباما نے قومی انٹیلی جنس سروس کے سربراہ جیمز آر کلیپر جونیئر (James R Clapper Jr.) کے اس اعتراف کا ذکر کیا کہ امریکہ کی کسی بھی خفیہ ایجنسی کو یہ ادراک تک نہ تھا کہ داعش اسقدر کامیابی حاصل کر لے گا اور دوسری حیرت یہ کہ اربوں ڈالروں سے تیار کردہ عراقی فوج اسقدر خوفزدہ اور کمزور ثابت ہو گی۔ اس کے بعد الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے جاش ارنسٹ (Josh Earnest)، ریڈیو CBS کے "ساٹھ منٹ" پروگرام میں غصے سے بول اٹھا، یہ تو سیاسی قیادت کی ناکامی ہے جو جنوری 2014ء میں جب داعش نے شام کے شہر رقاء پر قبضہ کیا تو عراق میں نوری المالکی کو کہتی رہی کہ اپنی حکومت میں سنیوں کو شامل کرو تاکہ داعش کے خطرے کا سدباب کیا جا سکے۔ لیکن نہ اوباما کو سنبھلنے کا موقع ملا اور نہ ہی نوری المالکی کو۔ دونوں کا اتحاد اس وقت حیران رہ گیا جب جنوری 2014ء ہی میں داعش نے فلوجہ، رمادی کے علاوہ ترکی کی سرحد کے قریب چند شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ابھی تک امریکہ اور عراق اسے معمول کی دہشت گردی سمجھ رہے تھے اور اسے ایسا گروہ تصور کرتے تھے جو دھماکے کر کے پناہ گاہوں میں چھپ جاتے ہیں۔ لیکن جون 2014ء میں جب موصل میں عراق کی عالمی معیار کی ایلیٹ فوج اپنی وردیاں اتار کر میدان سے بھاگی تو ایک دم پوری دنیا کے کان کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے قوم پرست کردوں کی تنظیم "پیش مرگا" کو ان کے خلاف اٹھایا گیا اور ان کے شہر کرکوک کو ان کے لیے یروشلم بنا کر پیش کیا گیا۔ داعش کو روکنے کے لیے قوم پرست افواج آگے بڑھیں تو دونوں جانب سے قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران داعش کی قتل و غارت اخبارات کی شہہ سرخیاں بن گئی۔ لیکن 23 اگست 2014ء کو "پیش مرگا" کا 25 عرب اور ترک باشندوں کو قطار میں کھڑے کر کے گولیاں مارنے کے واقعے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ابھی تو صرف الزامات چل رہے ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے اخبار میں روز کوئی نہ کوئی مضمون اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ غلطی کہاں ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کہ بقا کے قید خانے میں جب سنی اور شیعہ تقسیم کی بنیاد پر قیدیوں سے علیحدہ سلوک روا رکھا گیا تو یہ گروہ پیدا ہو گیا۔ کوئی نور المالکی کی اقلیت کُش پالیسیوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ لیکن میڈیا کا سب سے زیادہ زور دنیا کو خوفزدہ کرنے پر ہے۔ قتل و غارت، سر کاٹنے اور اقلیتوں پر ظلم کی داستانیں بیان ہو رہی ہیں۔ دوسری جانب ان کے ٹھکانوں پر حملے شروع کر دیئے گئے ہیں۔ خطرہ زیادہ ہے اس لیے کہ ایران کا انقلاب تو عالمی سرحدوں کو قبول کرتا تھا، لیکن یہ گروہ تو ان سرحدوں کو پامال کر چکا۔ تمام سازشی تھیوریاں اپنے جوبن پر ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ اسرائیلی موساد کے ایجنٹ ہیں، امریکہ نے انہیں بنایا ہے، القاعدہ کے توڑ کے طور پر بنایا گیا ہے۔ لیکن خوف بہت شدید ہے۔ مغرب، امریکہ، عرب ریاستیں اور ایران سب مشترک ہیں اس خوف میں۔ سب مشترک ہیں انہیں ختم کرنے کے لیے۔ اس خوف کے دو نتائج ہی نکلتے ہیں یا تو ایسے گروہ کی ریاست کامیاب ہو جاتی ہے جیسے ایران یا پھر یہ لوگ ایک مستقل دہشت گرد گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دنیا اگلی کئی دہائیاں ان کو بھگتتی رہتی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

شیطانِ بزرگ سے دوستی، مرگ بر امریکہ کی دشمنی (1)

ایران کے شہر طوس میں سنگلاخ پتھروں سے بنی دیواروں پر شاہنامہ فردوسی کے کردار رستم و سہراب مجسموں کی صورت تراشے گئے ہیں۔ یہ فردوسی کے مقبرے کی دیواریں ہیں۔ یوں تو اس شہر میں اسلامی تاریخ کے کتنے عظیم لوگوں کے مزار ہیں، لیکن فردوسی سے ایرانیوں کی خصوصی محبت نے باقی مزاروں کے نام و نشان تک باقی نہیں رہنے دیئے۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر رونا آتا ہے، جیسے امام غزالی کا مزار۔ وہ امام غزالی کہ جن کا اس امت پر ایک احسان اتنا بڑا ہے کہ اگلی کئی صدیاں اس کی زیرِ بار رہیں گئیں۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب تراجم کی وجہ سے مسلمانوں میں یونانی فلسفہ اور اس سے پیدا ہونے والی تشکیک نے راستے بنا لیئے تھے۔ ہر حکم، آیت، یا حدیث کو عقل، دلیل اور منطق کی کسوٹی پر رکھ پر کھا جانے لگا تھا۔ ایسے میں انہوں نے تہافتہ الفلاسفہ لکھی اور اسلامی فلسفہ میں الٰہیات کے باب کا اضافہ کیا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس امت کے علماء اور دانشور بھی مغرب کے فلسفیوں کی طرح صدیوں منطق کی گتھیوں میں الجھے رہتے۔ لیکن ایرانیوں کے نزدیک فردوسی محترم ہے کیونکہ اس کا احسان فارسی تہذیب و ثقافت، ادب و زبان پر بہت گہرا ہے۔ تمام مورخ مانتے ہیں کہ اگر فردوسی نہ ہوتا تو ایران میں فارسی زبان کا فروغ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا۔ جس طرح قدیم ایرانی سلطنت پر عربی معاشرت و تہذیب اثر انداز ہو رہی تھی، یہاں تک دجلہ و فرات کی سرزمین جہاں کبھی ایرانی بادشاہوں کا ہیڈ کوارٹر قادسیہ واقع تھا، اب وہاں کے لوگوں کی مادری زبان تک عربی ہو چکی تھی، ایسے میں بچے کھچے ایران میں فارسی زبان کو سنبھالے اور بچائے رکھنا، یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا کمال ہے، جن میں فردوسی سرفہرست ہے۔ پورے کا پورا شاہنامہ ایرانی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کی قصیدہ گوئی ہے۔ اس کا یہ مصرعہ ایرانی معاشرے کے ضرب المثل ہے "گر ایران نہ مانند تن من مابعد" (اگر ایران نہیں رہتا تو میرا وجود بھی باقی نہ رہے)

فارسی تہذیب و ثقافت سے محبت اور اس پر فخر کی جڑیں اسقدر مضبوط ہیں کہ جب 1979 میں ایران میں انقلاب آیا تو جہاں عورتوں کو حجاب پہننے کا حکم دیا گیا، وہیں ایران کے ہر چوراہے پر لگے مختلف مجسموں کو بھی گرانے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ لیکن ایرانی قوم نے حجاب تو پہن لیئے، داڑھیاں بھی رکھ لیں، لیکن مجسمے نہیں گرنے دیئے۔ اسی لیئے آپ کو ایران کے ہر شہر میں حافظ، سعدی، رومی، فردوسی، اقبال اور دیگر مشاہیر کے مجسمے چوراہوں میں نصب نظر آئیں گے۔ دنیا میں چند سفارت خانے ایسے ہیں کہ جو دوسرے ملکوں میں اپنی زبان سکھانے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ ان میں برطانیہ، فرانس، جرمنی اور ایران سرفہرست ہیں۔ فارسی شناسی ایرانی سفارت خانوں کا اہم ترین کام ہے جسے یہ سفارت خانے انقلابِ اسلامی سے پہلے بھی اور آج بھی انتہائی ذمہ داری سے ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ فارسی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے ایرانیوں کا یہ والہانہ عشق ہی تھا کہ یہ زبان اپنے اردگرد کے ممالک پر بھی چھائی رہی۔ مغل نسلاً ترک تھے، لیکن ان کے گھربار اور سرکار کی زبان فارسی رہی یہاں تک کہ رنجیت سنگھ کے دربار کی زبان بھی فارسی تھی۔ برصغیر پاک و ہند میں تمام مدارس میں دینی، سیاسی اور دیگر علوم کی کتابیں بھی فارسی میں لکھی جاتی رہیں۔

ایرانیوں نے بحیثیت قوم جس طرح خود کو عربی ثقافت اور تہذیب کے مقابلے میں اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھی، یہ انہی کا کمال ہے۔ ورنہ شام، مصر، اردن، عراق، لبنان، تیونس، مراکش، سوڈان اور لیبیا جیسے ممالک میں بھی عربی نہیں بولی جاتی تھی، لیکن آج یہ سب کے سب عرب دنیا کا حصہ ہیں۔ وہاں کے باسی بھول بھی گئے کہ صدیوں پہلے ان کی مادری زبان کیا ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام ایرانی بھی اپنی تہذیب و ثقافت پر اس قدر فخر کرتا ہے کہ اسے دنیا کی تمام تہذیبیں ہیچ لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی دوسرے ملک میں کوئی اچھا فارسی شاعر پیدا ہو جائے تو وہ اسے کھینچ تان کر ایران میں لے آتے ہیں۔ ہمدان کے شہر میں آپ چلے جائیں تو لوگ آپ کو ایک قصہ ضرور سنائیں گے کہ علامہ اقبال کے والد یہاں زرد چوبہ یعنی ہلدی کا کاروبار کرتے تھے اور اقبال یہیں پیدا ہوئے اور جوان ہونے کے بعد یہاں سے ہندوستان گئے۔ آپ ان سے بحث کریں کہ ایسا نہیں ہے، وہ تو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تو وہ کہیں گے کہ میں مان ہی نہیں سکتا کہ جس شخص نے اپنا بچپن ایران میں نہ گذارا ہو وہ اتنی اچھی فارسی شاعری کر سکے۔ ایران کے مفاد کو مقدم رکھنا، ایران تہذیب کی بالادستی اور قدیم ایرانی بادشاہت کے اثر و رسوخ کو قائم رکھنا، ہر ایرانی کا خواب ہے۔ انقلابِ ایران کے بعد اسے مذہب اور مسلک کا تڑکا ضرور لگا، لیکن معاشرت سے ایرانی تفاخر رخصت نہ ہو سکا۔

انقلابِ ایران ایک ایسا بڑا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں بہت کم نظیر ملتی ہے۔ انقلابِ ایران، فرانس، روس اور چین یہی چند انقلاب ہی تو ہیں۔ ایران پورے خطے میں امریکہ کا چوکیدار اور پولیس مین تھا اور کئی دہائیوں تک رہا۔ سرد جنگ کے زمانے میں کچھ دیر کے لیے کیمونسٹ انقلابیوں نے مصدق کی حکومت کو قائم تو کر لیا تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد امریکہ نے شاہ رضا پہلوی کو پوری طاقت اور قوت کے ساتھ واپس تخت پر بٹھا دیا۔ اپنا سب سے بڑا سفارت خانہ وہاں قائم کیا۔ سی آئی اے کی سب سے بڑی قوت یہاں پر بٹھائی گئی۔ شاہ کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی فوج کو بہترین جنگی ساز و سامان سے لیس کیا گیا۔ توانائی پیدا کرنے کے لیے ایٹمی ری ایکٹر قائم کیئے گئے، اور عوام کو دبانے کے لیے سی آئی اے نے ساواک جیسی ظالم خفیہ ایجنسی قائم کی۔ شاہ کے اقتدار میں آنے کے بعد دو قوتیں اس کے خلاف آواز بلند کرتی رہیں۔ ایک کیمونسٹ انقلابی اور دوسرے چند علمائے کرام، علماء میں ڈاکٹر شریعتی کے لٹریچر نے ایرانی نوجوانوں کو آتش فشاں بنا کر رکھ دیا تھا۔ کیمونسٹ انقلابی "تودہ" پارٹی جیسی خفیہ تنظیم کے تحت منظم تھے اور ظاہری طور پر مجاہدین خلق کے پرچم تلے نظر آتے تھے۔ علامہ اقبال کی انقلابی شاعری ایرانی نوجوانوں میں جوش و جذبہ بھر دیا تھا۔ ایرانی انقلاب کا سب سے مقبول نعرہ "مرگ بر امریکہ" تھا جسے "مرگ بر شاہ" کے ساتھ ملا کر لگایا جاتا تھا۔ مدتوں ساواک کے نشانے پر دو طرح کے لوگ آتے رہے، ایک وہ جو بال بڑھائے، جینز جاگر پہنے کارل مارکس کی گفتگو کرتے تھے یا پھر وہ جو مدرسوں اور امام بارگاہوں جنہیں ایرانی حسینیان کہتے ہیں وہاں جانا شروع ہو گئے تھے۔ ان دونوں قوتوں کا نعرہ مشترک تھا "مرگ بر امریکہ"۔ مذہبی قیادت شروع میں بٹی رہی۔ بہت سے علماء ایسے تھے جو اس بات پر ہی خوش ہو جاتے تھے کہ شاہ ایران نے خصوصی اہتمام کے ساتھ انتہائی قیمتی قالین مشہد میں امام رضا کی مسجد میں ڈلوائے ہیں۔ لیکن وہ جو انقلاب کی سوچ رکھتے تھے، وہ جلاوطن آیت اللہ خمینی کی قیادت میں جمع ہو چکے تھے۔ آیت اللہ خمینی اس وقت عراق میں تھے اور صدام حسین نے انہیں شاہ ایران کے مقابلے میں خصوصی پناہ دے رکھی تھی۔ ایرانی مذہبی قیادت اپنے اندر ایک شاندار تنظیم رکھتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی سیاسی پارٹی بلکہ حکومت بھی اتنی منظم ہو جتنی ایران کی مذہبی قیادت منظم ہے۔ ہر کوئی اپنے علم، صلاحیت اور کردار سے منزلیں طے کرتا مرجع کے مقام تک پہنچتا ہے۔ کتنے مرتبے ہیں جن پر لوگ راستے میں فائز ہوتے ہیں۔ لیکن سب کے سب مرجع کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی کسی ملک میں انارکی پھیلتی ہے، حکومت کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ہنگامے زور پکڑتے ہیں۔ شہر تشدد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، حکومتی اقتدار ڈولنے لگتا ہے، انتظامیہ کی گرفت ختم ہو جاتی ہے تو ایسے میں اقتدار پر صرف وہ گروہ قبضہ کر سکتا ہے جو منظم ہو۔ غیر منظم بکھرے ہوئے ہجوم کی طرح سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں۔ شاہ ایران کا زوال قریب ہوا تو ایران کی مذہبی قیادت نے منظم ہونے کی وجہ سے اس سارے انقلاب کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ آیت اللہ خمینی فرانس منتقل ہو گئے اور پھر جب ایک دن واپس ایران لوٹے تو لاکھوں کا جمِ غفیر تہران شہر میں "مرگ بر امریکہ" اور "مرگ بر شاہ" کا نعرہ لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ شاہ رخصت ہو گیا۔ اقتدار مذہبی قیادت کے ہاتھ میں آیا اور مجاہدین خلق اس میں برابر کی شریک ہوئی۔ آیت اللہ خمینی نے مذہبی قائد اور سربراہ ہونے کی حیثیت سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد پوری قوم کو ایک نعرہ دیا کہ امریکہ "شیطانِ بزرگ" ہے یعنی سب سے بڑا شیطان ہے۔ ادھر یہ نعرہ گونجا اور اُدھر انقلابی دستوں نے تہران کے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر کے عملے کو یرغمال بنا لیا۔

(باقی آئندہ۔۔۔)

KitaabPoint.blogspot.com

شیطان بزرگ سے دوستی مرگ بر امریکہ کی رخصتی (2)

آیت اللہ خمینی کی قیادت بہت جاندار' معاملہ فہم' دور بین اور اسلامی تصورات ریاست و حکومت کی امین تھی۔ انہوں نے اپنے روایتی فقہی پس منظر سے بلند ہو کر حکومتی کاروبار کو چلانے کی کوشش کی۔ ان کے کچھ اقدامات تو ایسے تھے کہ جن کی مثال ہماری ایک ہزار سال کی فقہی اختلافات کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہماری تاریخ تو یہ ہے کہ خانہ کعبہ میں چار مختلف مسالک کے چار مصلے بچھائے گئے تھے اور حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی امام علیحدہ علیحدہ جماعت کرواتے تھے۔ ان چاروں کو ایک امام پر شاہ فیصل مرحوم نے متفق کیا۔ لیکن آیت اللہ خمینی کا یہ فتویٰ کہ کسی بھی مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے' ایک بہت بڑا قدم تھا' یہی وجہ ہے کہ آج آپ کو سنی مسلک کے کچھ لوگ تو حرم میں علیحدہ نماز پڑھتے نظر آئیں گے لیکن شیعہ مسلک کا کوئی فرد اس اتحاد امت کا وہاں تماشہ نہیں بنتا' البتہ بوہری اپنی نماز علیحدہ کرواتے ہیں۔ ایران کے آئین کی ترتیب و تدوین کے لئے بھی مختلف ممالک اور مختلف مسالک کے علماء سے مشاورت کی گئی۔ آیت اللہ خمینی نے تین نعرے ایرانی عوام کو دیئے۔ دو نعرے عالمی سیاست پر مشتمل تھے۔ مرگ بر امریکہ' مرگ بر اسرائیل اور تیسرا نعرہ مسلکی تھا' مرگ بر ضد ولایت فقیہہ۔ عالمی سیاست کے یہ دونوں نعرے آیت اللہ خمینی کی دور بین نگاہوں اور اسلامی فکر سے جنم لینے والی بصیرت کا نتیجہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو جہاں پاکستان وہاں کے مہاجرین کا میزبان بنا' وہیں ایران بھی افغان مہاجرین کا بوجھ برداشت کرتا رہا۔ افغان مجاہدین کی قیادت بیک وقت پاکستان اور ایران سے رابطے میں رہتی۔ روس کے جانے کے بعد اور پھر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد جب آزاد ہونے والی چھ مسلمان ریاستوں' پاکستان' ترکی' افغانستان اور ایران پر مشتمل ایک تنظیم ای سی او بنی تو ایران اس میں سب سے زیادہ متحرک تھا' بلکہ اس کا ہیڈ کوارٹر بھی تہران میں تھا۔ امریکہ اور اسرائیل سے دشمنی ایرانی سیاست پر چھائی ہوئی تھی۔ ایرانی انقلاب' ایرانی قوم کی اسلامی شناخت بنانے کی طرف گامزن تھا۔ اس میں پہلی رکاوٹ وہ مجاہدین خلق کے کمیونسٹ تھے جو صرف شاہ ایران اور امریکی دشمنی کے تحت ملاؤں سے آن ملے تھے۔ وہ حکومت میں بھی شامل تھے اور پارلیمنٹ میں بھی۔ امریکہ کو آیت اللہ خمینی نے پورے ایران میں ایک گالی بنا دیا تھا۔ مجاہدین خلق سے جان چھڑانا مقصود تھی۔ ان کے بارے میں یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ ان کے روابط امریکہ اور عراق سے ہیں۔ پھر ایک دن فتویٰ آ گیا کہ یہ سب منافقین اور واجب القتل ہیں۔ ہزاروں قتل کر دیئے گئے۔ مسعود رجاوی کو عراق نے پناہ دے دی۔ بالکل اسی طرح جیسے بیس سال قبل اس نے آیت اللہ خمینی کو پناہ دی تھی۔ ایران نے اپنے انقلاب کو دوسرے اسلامی ممالک میں پھیلانے کی کوشش کی لیکن تھوڑے عرصے بعد اسے احساس ہو گیا کہ صدیوں سے قائم مسلک کی دیواریں کس قدر مضبوط ہیں۔ ایران' عراق جنگ شروع ہوئی تو اس آٹھ سالہ جنگ نے صدیوں پرانی عرب و عجم کی عصبیت کو زندہ کر دیا۔ ایران چونکہ یہ جنگ بالکل اکیلے لڑ رہا تھا' اس لئے ایرانیوں کے اندر اس جذبے نے شدت اختیار کر لی کہ عرب ایک دفعہ پھر ہم پر حملہ آور ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ دوسرے ملکوں سے کچھ رضاکار یہ جنگ لڑنے گئے جنہیں ایران کے ساتھ مسلک کی عقیدت تھی۔ لیکن جنگ میں مارے جانے کے بعد انہیں علیحدہ قبرستانوں میں دفن کیا جاتا۔ جھنگ کا ایک شخص اپنے بیٹوں کو جو عراق جنگ میں جاں بحق ہوئے تھے تہران کے قریب بہشت زہرا قبرستان میں دفن کرنا چاہتا تھا' اسے اس کی اجازت نہ دی گئی کہ تمہارے لئے وہ خارجی قبرستان ہے۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کی نعشیں پاکستان لے آیا۔ ایرانیت غالب آنے لگی۔ بلکہ مکمل طور پر سر اٹھا چکی تھی لیکن چونکہ قیادت مذہبی اور مسلکی تھی' اس لئے ایران کے اثر و نفوذ کو مسلک کے راستے بڑھانے کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ آیت اللہ خمینی کے زمانے میں ہونے والی تمام عالمی کانفرنسیں' سفارت خانوں کی تقریبات میں تمام مسالک کے افراد مدعو ہوتے' لیکن اب یہ اپنے مسلک تک محدود ہونے لگے۔ افغانستان میں مجاہدین کے درمیان خانہ جنگی کا آغاز ہوا' کئی سال خونریزی میں گزرے۔ اس خونریزی کے رد عمل میں طالبان نے عروج پکڑا۔ ملا محمد عمر نے نوے فیصد افغانستان بغیر لڑائی لڑے اپنے امن کے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ پاکستان نے طالبان کی حمایت کی' بلکہ ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ایسے میں ایران نے اپنے اثر و نفوذ کو قائم رکھنے کے لئے شمالی اتحاد کی ہر طرح سے مدد کی بلکہ شمالی اتحاد کی تمام قیادت ایران اور تاجکستان کے توسط سے بھارت کے ساتھ رابطے میں رہی۔ شمالی اتحاد سے تعلق کی جڑیں اسقدر مضبوط تھیں کہ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد جہاں ہر پڑوسی ملک نے امریکہ کی حمایت کا اعلان کیا' وہاں ایران نے درپردہ شمالی اتحاد کے ذریعے اپنے اثر و نفوذ کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہاں پاکستان یہ چاہ رہا تھا کہ شمالی اتحاد کی پاکستان مخالف حکومت نہ بنے' ایران نے پوری کوشش سے اس حکومت کے قیام کو ممکن بنایا۔ افغانستان صدیوں ایران کا حصہ رہا ہے اور پاکستان اس کا مستقل پڑوسی' لیکن خالصتاً ایرانی مفاد کے مطابق فیصلہ کیا گیا۔ اس دوران پاکستان گوادر بندرگاہ پر کام شروع کر چکا تھا تاکہ وسط ایشیا تک رسائی کا اہتمام ہو سکے۔ ایسے میں بھارت کو کئی ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے چاہ بہار بندرگاہ سے افغانستان کے صوبے ہلمند تک سڑک بنانے کی اجازت دی گئی تاکہ گوادر ایک بے معنی حیثیت اختیار کر جائے۔ ایرانی غلبے اور ایرانیت کے اثر و نفوذ کو اگلی رسائی اس وقت ملی جب امریکہ کے ہاتھوں صدام حسین کی شامت آئی۔ صدام کی فوج تو پل بھر میں غائب ہو گئی' لیکن عراقی عوام امریکہ کے خلاف لڑنے لگے۔ ایسے میں اپنے زیر اثر افراد کو اس جنگ سے دور کرنے کے لئے ایران نے مقتدیٰ صدر کو امریکہ مخالفت سے دور کر دیا۔ عراق میں امریکہ کے خلاف کسی جہاد کا اعلان نہ ہوا۔ یوں ساری جنگ سنی مسلک کے چند شہروں تک محدود ہو کر رہ گئی جنہیں امریکہ نے القاعدہ کہہ کر تباہ و برباد کر دیا۔ صدام کے زمانے میں ایران اور عراق کی فوجی طاقت برابر تھی۔ عراق تباہ ہوا' آئین رکھا گیا' نئی حکومت آئی جو ایران کی دست نگر تھی۔ اب تو ان کی فوج کے پاس چند ٹینک رہ گئے تھے اور ایئر فورس کے پاس تو ایک جہاز تک نہ تھا۔ یوں عراق میں ایرانی اثر و نفوذ بالکل اسی مقام پر آ گیا جیسا یزدگرد کے زمانے میں تھا یعنی دجلہ و فرات کے درمیان کا علاقہ اسے کے محلات پر مشتمل تھا۔ ایران کو شام' لبنان' بحرین اور کویت تک ایک محفوظ راستہ مل گیا جو عراق سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ گزشتہ دس سالوں میں اس کے امریکہ کے ساتھ درپردہ رابطوں کا نتیجہ تھا جسے ایرانی اسلامی انقلاب کے بانی آیت اللہ خمینی نے شیطان بزرگ کہا تھا۔ لیکن اس ساری کشمکش میں جو عرب و عجم کی لڑائی کے طور پر پیدا ہوئی تھی شیطان بزرگ امریکہ کا ایک بہت بڑا خواب پورا ہو رہا تھا۔ شیعہ سنی لڑائی۔ یہ خواب شیطان بزرگ امریکہ گزشتہ پچیس سال سے دیکھ رہا ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں عراق کی سنی اقلیت سے دولت اسلامیہ نے جنم لیا اور یمن کی زیدی اقلیت نے حوثی بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ دو ملک ایسے تھے جہاں اقلیت واضح اکثریت پر حکمران تھی' بحرین اور شام۔ دونوں جگہ اقلیت کی حکومت کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' اس ساری کشمکش اور لڑائی میں جہاں مسلم امہ کا خون بہہ رہا تھا' دنیا کی پانچ بڑی طاقتیں اور امریکہ مل کر ایران کے ساتھ مذاکرات کر رہی تھیں۔ یہ مذاکرات ایران کے ایٹمی پروگرام کو عالمی ضابطوں کے ماتحت کرنا تھا جس کے بدلے میں ایران کو پرامن توانائی کی ضروریات کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کا حصول آسان ہو جائے گا لیکن اصل مسئلہ وہ پابندیاں ہیں جو ایران سے اٹھیں گی تو وہ اپنی معیشت کو مضبوط کر سکے گا۔ یوں 38 سال بعد ایران' امریکہ اور مغربی قوتیں' مشرق وسطیٰ میں شانہ بشانہ کھڑی ہوں گی۔ یہ دراصل گزشتہ دس سالوں کا خفیہ معاشقہ تھا جو واضح اعلان کی صورت سامنے آیا ہے۔ اوباما کی تقریر کی سرخوشی بہت کچھ بتا رہی ہے۔ ایران کی قیادت محتاط ہے۔ یہ احتیاط اس لئے کہ گزشتہ چالیس سال سے ایرانیوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا "مرگ بر امریکہ" چار نسلیں اس نعرے کے سائے میں پل کر جوان ہوئیں ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس دلایا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑا شیطان امریکہ ہے اور اس سے شدید نفرت کی جائے۔ امریکی دوستی مشرق وسطیٰ میں ایرانی اثر و نفوذ بڑھانے میں مدد تو دے گی لیکن اندرون ایران' عام آدمی کے جذبات کیا ہوں گے اسے ایران کی مذہبی قیادت خوب جانتی ہے۔ انہیں خوف ہی اس بات کا ہے کہ وہ مرگ بر امریکہ کا نعرہ جو کل شاہ کے خلاف استعمال کرتے تھے' آنے والے کل یہ ان کے خلاف استعمال نہ ہونے لگے۔ ایرانیوں کو انقلاب کا تجربہ تو ہے۔ (ختم)

KitaabPoint.blogspot.com

شکست خوردگی کی علامت

ایک تمسخر ہے، ہر کوئی ہنسی اڑا رہا ہے۔ تمسخر اڑانے والوں میں ہر رنگ، نسل، زبان، علاقے اور مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہی ہو جنہوں نے کاغذ کے جعلی اور جھوٹے نوٹوں میں آنکھ کھولی ہو، اپنے اردگرد کرنسی کی گرتی، چڑھتی، سنبھلتی قیمتوں کو دیکھا ہو، سکول، کالج اور یونیورسٹی میں معاشیات کا مشکل اور محنت سے سمجھ میں آنے والا مضمون پڑھا ہو، افراطِ زر، ارتکازِ دولت، مارکیٹ فورسز جیسے گنجلک موضوعات کو سمجھنے میں برسوں لگائے ہوں۔ ان سب لوگوں کے لیے یقیناً یہ تمسخر، بلکہ ہنسی ٹھٹھے کی بات ہے کہ جب ایک ایسی ریاست، دولتِ اسلامیہ، جسے امریکہ، یورپ، چین روس اور بلا شرکت غیرے تمام مسلمان ممالک ایک دہشت گرد تنظیم کا غاصبانہ قبضہ سمجھتے ہوں، وہ سونے اور چاندی کی کرنسی کا اعلان کر دے۔ دنیا میں عالمی برادری کی گزشتہ دو تین ہزار سال کی تاریخ میں کسی ایک گروہ کے خلاف آج تک ایسے اکٹھا نہیں ہوئی کہ کوئی ایک ملک بھی اس کی مخالفت نہ کرے۔ مسلمانوں کی فرقہ بندی یا گروہ بندی کے آغاز سے لے کر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث، اقامتِ دین کی علمبردار اخوان المسلمون، حزب التحریر اور جماعت اسلامی سب کے سب اس گروہ کے خلاف متحد ہوں۔ آج سب اسے مسلمانوں کو رسوا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ تمام لوگ جو صبح چند خبریں اور شام کو چند تبصرے سن کر اپنے علم کی کمند عالمی سیاست پر ڈالتے ہیں تو انہیں دولتِ اسلامیہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ایک بہت بڑی سازش محسوس ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو، ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے کہ پوری امت کی حکومتیں اس ایک نکتے پر متفق ہیں۔ کبھی ایران اور سعودی عرب بھی کسی فتنے کے خلاف بیک وقت اکٹھا ہوئے ہیں۔ لوگ یقیناً حیرت میں گم ہیں کہ یہ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ کل تک یہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ریال اور تمن خرچ کر رہے تھے۔ اور اب یہ دونوں ملک اس ایک خطرے یعنی دولتِ اسلامیہ کے خلاف متحد ہی نہیں شیر و شکر ہو گئے۔ روس، چین، امریکہ، بھارت، اسرائیل سب کے سب اس گروہ کے خلاف ہیں۔

جہاں دنیا بھر کے میڈیا میں ان لوگوں کو ظالم، حیوان، مجرم، اغواکار اور لٹیرے ثابت کیا جا رہا ہے وہیں ایک تمسخر ان اصطلاحات کا بھی اڑایا جاتا ہے جو یہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ خلافت، امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کے الفاظ پہلی جنگ عظیم کے بعد پوری مسلم امہ کی لغت سے خارج ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسلامی جماعتیں جو اسلامی ملکوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ریاست مدینہ کی طرز کی حکومت کے نفاذ کے نعرے لگاتی ہیں ان کے اکابرین بھی خلافت، یا امیر المومنین جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ایسے شرماتے ہیں کہ کہیں اس مہذب اور ماڈرن معاشرے میں اس طرح کے الفاظ استعمال کر کے خفت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تمام اسلامی تحریکیں جو اسلامی ممالک میں جدوجہد کر رہی ہیں، وہ سب کی سب جمہوریت، پارلیمنٹ، آئین، وزارت عظمٰی اور صدارت جیسے الفاظ بول کر موجودہ جدید مغربی تہذیب کے ساتھ اپنا رشتہ مستحکم کر چکی ہیں۔ ان سب کے ہاں خلافت وغیرہ اب صرف ایک مثالیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کی تراکیب اور مغربی معاشرے سے اس قدر خوفزدہ ہیں یہ تمام قیادتیں کہ اگر ایران میں انقلاب بھی آ جائے تو صدر، وزیراعظم اور پارلیمنٹ جیسے الفاظ ہی گونجتے ہیں، مصر میں صدر مرسی کی صدارت، ترکی کی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی، تیونس کی النہضہ، سب کی سب اقتدار حاصل کرنے کے باوجود بھی خلافت اور امارت جیسی تراکیب اور اصطلاحات استعمال کرنے سے شرماتی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ ان کا تمسخر اڑایا جائے گا، انہیں دقیانوس، فرسودہ اور جمہوریت دشمن قرار دے کر مطعون کیا جائے گا۔ آپ فوجی طاقت سے برسراقتدار آ کر صدام حسین کی طرح صدر کہلائیں، آبادیوں پر زہریلی گیس پھینکیں، آپ دہشت گرد نہیں ہیں، آپ بشار الاسد کی طرح صدر کہلائیں، چار لاکھ معصوم شہریوں کو قتل کر دیں آپ دہشت گرد نہیں۔ آپ قاتل ہوں، آپ کے ہاتھ خون میں رنگے ہوں، آپ کو بھارت کے عوام وزیراعظم منتخب کر دیں، آپ دنیا کے باعزت ترین شہری بن جاتے ہیں۔ لیکن دہشت گردی اور قتل و وحشت صرف ایک لفظ کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے اور وہ ہے خلافت۔ لیکن جس تصور کا ان دنوں سب سے زیادہ مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ دولتِ اسلامیہ کے سونے اور چاندی کے دینار و درہم جاری کرنے کا فیصلہ ہے۔ دنیا بھر کے اخبارات ایسے کارٹونوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کہیں کبوتر کی چونچ میں لفافے دے کر دکھایا گیا ہے کہ یہ داعش کی میل سروس ہے اور کہیں گھوڑوں کو پر لگا کر جہاز بنایا گیا ہے۔ درہم و دینار کا تمسخر کیوں؟ اور سونے اور چاندی کے سکوں کی ہنسی کیوں اڑائی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ جدید مغربی تہذیب کی ترقی اور غلبے کا راز ایک جعلی اور جھوٹی کاغذی کرنسی میں پوشیدہ ہے۔ اس جعلی اور جھوٹی کرنسی کی بنیاد پر بینکاری کے سودی نظام کا محل تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک زمانے تک اس مصنوعی سرمایے کے بدلے میں حکومتوں کے پاس سونے کے ذخائر ضروری تھے۔ لیکن 1971ء سے اسے ملکوں کی ساکھ (Goodwill) کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ دنیا میں ایک بینک آف انٹرنیشنل سیٹلمنٹ بنایا گیا جو کرنسی کی حیثیت متعین کرتا ہے اور ان کاغذ کے جعلی نوٹوں کو اس قابل بناتا ہے کہ دنیا کی مارکیٹ سے جو چاہیں خرید لیں۔ اگر آج عرب دنیا اپنا تیل پاکستانی روپے میں فروخت کرنا شروع کر دے تو ایک روپے کے سو امریکی ڈالر ملنا شروع ہو جائیں۔ ان کاغذ کے نوٹوں پر عدم بھروسے کا عالم یہ ہے کہ اس وقت چین دنیا بھر سے دھڑا دھڑ سونا خرید رہا ہے تاکہ کل اگر یہ نوٹ بے کار ہوں تو سونا تو موجود رہے۔ یہی حال بھارت کا ہے۔ ایسے میں دولت اسلامیہ جو روزانہ 80 لاکھ ڈالر کا تیل فروخت کر رہی ہے اگر اس نے تیل کی قیمت سونے اور چاندی کے درہم و دینار میں طلب کر لی تو یہ ساری سودی عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔ ایسے میں سب کے سب اکٹھے ہیں، مشرق سے مغرب تک ہر کوئی، اس "فتنے" سے ڈرا رہا ہے۔ جبکہ مقابلہ کرنے والوں کا عالم یہ ہے کہ پیٹر گلبرتھ جیسے سفارتکار اور پینٹاگون، سی آئی اے کے افسران سمجھتے ہیں کہ ہم ان پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس لیے کہ عراق میں ان سے لڑنے کیلئے اربوں ڈالر لگا کر جو فوج منظم کی گئی تھی وہ دنیا بھر کی ان تمام افواج کی طرح بددیانت اور کرپشن کے الزامات لیے ہوئے ہے۔ نیویارک ٹائمز کے ڈیوڈ کرک پٹرک (DavidKirkpatrick) نے ان تمام جرنیلوں کی کہانیاں لکھی ہیں جو اپنا اسلحہ داعش کے لوگوں کو بیچ دیتے ہیں۔ امریکہ کا فراہم کردہ اسلحہ بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیا جاتا ہے جسے داعش کے لوگ خرید لیتے ہیں۔ پہلے نوری المالکی کے کمانڈروں نے کمایا اور اب عبادی نے اپنے جرنیل لگائے ہیں جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں۔ فوج کو دیا جانے والا آدھے سے زیادہ امریکی اسلحہ سپاہیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مارکیٹ میں فروخت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اب دولت اسلامیہ سے لڑنے کیلئے ایران، شام اور لبنان سے مختلف ملیشیا بلوائے گئے ہیں جو خالصتاً فرقہ وارانہ بنیادوں پر جنگ کر رہے ہیں۔ یہ جنگ کب تک چلتی ہے اور کہاں تک چلتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ کہاں تک پھیل سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ داعش ایک عراقی اور شامی ابال ہے جو سنی علاقوں سے برآمد ہوا اور نوری المالکی کی بدترین حکومت اور ظلم کی وجہ سے یہ ریاست قائم ہوئی انہیں اس طرف بھی غور کر لینا چاہیے کہ اس وقت یورپ کے 24 ممالک ایسے ہیں جہاں سے لوگ ان کے ساتھ آ کر شامل ہو چکے ہیں، اور یہ سب انتہائی پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ان میں اکثریت عربوں کی نہیں ہے۔ داعش آج سے سات سال پہلے جب وجود میں آئی تو اس نے اپنے ایک بریگیڈ کا نام غازی عبدالرشید بریگیڈ رکھا تھا اور اس کی تعارفی ویڈیو میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ پر کیے جانے والے آپریشن کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ جس داعش کو یہ سب ممالک دہشت گرد قرار دے رہے ہیں اس سے 80 ڈالر فی بیرل کا تیل سستے داموں 60 ڈالر فی بیرل خریدنے کیلئے مرے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر کی تیل کمپنیاں ان سے تیل خریدتی ہیں اور بریف کیسوں میں ڈالر پہنچاتی ہیں۔ ایک جانب دولت کمانے کی ہوس اور دوسری جانب کرپٹ اور بددیانت فوج، انجام صاف ہے اور نوشتۂ دیوار تو ہر کسی نے پڑھ لیا ہے۔ شکست خوردگی کی سب سے بڑی علامت تمسخر ہوتی ہے جو اڑایا جا رہا ہے۔

نوٹ: وہاڑی کے ایک صاحب اپنی مرحومہ بیٹی کے علاج کے سلسلے میں مقروض ہو گئے ہیں۔ وہ قرضِ حسنہ چاہتے ہیں جنہیں قسطوار واپس کر سکیں۔ فون نمبر تحریر کر رہا ہوں، خود تسلی فرما لیں۔ 03357657291

KitaabPoint.blogspot.com

صرف چند لمحوں کے لئے سوچیے

سرمائے کی ہوس اور اقتدار کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ وہ تمام ممالک جو اس وقت عراق اور شام میں قائم ہونے والی دولت اسلامیہ کے خلاف جنگ کے بنیادی ستون ہیں‘ جن کی سرحدیں اس نئی قائم ہونے والی ریاست کے ساتھ ہیں۔ ایک ایسی ریاست جسے دہشت گردی کی علامت اور دنیا بھر کی تہذیب کے لئے خطرہ قرار دیا جارہا ہے‘ یہی ممالک دولت اسلامیہ کے تیل کی فروخت میں سب سے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ دولت اسلامیہ نے جب عراق کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے اس تیل کو سستے داموں خریدنے کی ہوس ایرانی اور کُرد سمگلروں کے دلوں میں پیدا ہوئی۔ صرف چند دن کے بعد 6 نومبر 2013ء کو تیل سے بھرے ہوئے ہزاروں ٹینکروں کی قطاریں ایران کی سرحد پر پرویز خان کے علاقے میں موجود تھیں۔ اس کے بعد کُرد حکومتی اہلکاروں‘ ایرانی سمگلروں اور ایرانی حکومت کے کسٹم حکام اور پاسداران میں نجانے کیا سمجھوتہ طے پایا کہ کئی دنوں سے رکے ہوئے ان ٹینکروں نے اپنی منزلوں کی جانب روانگی اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ آغاز کے ان دنوں میں دولت اسلامیہ کو روزانہ دس لاکھ ڈالر تیل کی فروخت سے ملتے تھے جن کی تعداد میں اب کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پہلا آئل ٹینکر جون کے وسط میں ”توز فرماتو“ کے شہر پہنچا تھا۔ یہ ایک ترک اور کُرد آبادی کا شہر ہے۔ یہاں اس ٹینکر کو سمگلروں نے خریدا اور پھر آگے روانہ کر دیا۔ شروع شروع میں یہ ٹینکر بہت کم تھے لیکن جیسے ہی تعداد بڑھی کُرد انتظامیہ نے پابندیاں لگانا شروع کر دیں۔ اب دولت اسلامیہ نے براہ راست سمگلروں کو تیل بیچنا شروع کر دیا‘ اب سمگلروں نے کُرد انتظامیہ سے رابطہ کیا‘ معاملات طے ہوئے‘ انتظامیہ نے خود تیل خریدنا شروع کیا اور پھر اسے اربیل اور سلیمانیہ میں موجود دو غیر لائسنس یافتہ ریفائنری پلانٹ میں صاف کر کے اس کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ تمام کاروبار حکومت نہیں کر رہی بلکہ حکومتی اہلکاروں کی اشیرباد سے ہو رہا ہے جس سے سمگلر اور بددیانت حکومتی اہلکار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہوس زر کا کوئی مذہب اور کوئی نسل نہیں ہوتی۔ یہ سمگلر کُرد ہو گا لیکن تیل کسی ترک سمگلر کو بیچنے میں نہیں ہچکچائے گا۔ تیل دولت اسلامیہ کا ہے لیکن خریدار سب کے سب اس کے مخالف‘ اس سے جنگ کرنے والے۔ پیش مرگہ کے وہ کُرد جنگجو جو دولت اسلامیہ کے ساتھ لڑائی میں مصروف ہیں اور انہیں امریکہ اور مغرب کی مکمل حمایت حاصل ہے وہ بھی اس بہتے تیل کی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں اور ایران‘ اردن‘ شام کی حکومتیں بھی آنکھیں بند کر کے اس تیل کی ترسیل کو یقینی بنا رہی ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس تیل کو سمگل کرنے والوں کے نام پوری دنیا کو معلوم ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ دولت اسلامیہ کی معیشت کا دارومدار اسی تیل کی فروخت پر ہے۔ اس کے باوجود بھی دولت کمانے کی ہوس کسی بھی ملک کو یہ فروخت روکنے پر مجبور نہیں کر پاتی۔ کرکوک اربیل روڈ پر بے شمار چھوٹی ریفائنرز بن چکی ہیں جہاں یہ تیل پہنچتا ہے اور پھر آگے سمگل ہوتا ہے۔ سلیمانیہ کا باقی یٰسین اس سارے کاروبار کا بادشاہ تصور ہوتا ہے۔ اس کے گروہ میں کُرد اور ایرانی سمگلر شامل ہیں۔ ایرانی سمگلروں کو اپنے پاسداران کی حمایت حاصل ہے اور کُردوں کو اپنی تنظیم پیش مرگہ کی۔ یہ سارے ملیشیا کے لوگ ایک چیک پوائنٹ پر دولت اسلامیہ کے سپاہیوں سے جنگ میں مصروف ہوتے ہیں اور دوسرے چیک پوائنٹ پر ان کا تیل خرید رہے ہوتے ہیں۔ وہ تمام حکومتیں جو چیخ چیخ کر داعش کو دہشت گرد کہہ رہی ہیں انہی کی زمین پر اس کا تیل خریدنے اور انہیں سرمایہ فراہم کرنے کیلئے استعمال ہو رہی ہے۔

دوسری منافقت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب جس کے لئے دولت اسلامیہ کو سب سے بڑا خطرہ تصور کیا جارہا ہے۔ پوری دنیا میں یہ پراپیگنڈہ عام کیا جارہا ہے کہ مسلم ممالک میں دہشت گردی اور شدت پسندی کی وجوہات میں معاشی ناہمواری‘ جمہوریت کا فقدان‘ سکولوں کے نصاب تعلیم جو جہاد کا درس دیتے ہیں اور سخت متعصبانہ قوانین ہیں۔ ان وجوہات کی وجہ سے شدت پسندی کو فروغ مل رہا ہے۔ پورا مغرب مسلمان ملکوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ اپنا نصاب سیکولر کرو‘ اپنی حکومتیں جمہوری بناؤ‘ اپنے پسماندہ لوگوں کو معاشی طور پر مستحکم کرو‘ اپنی خواتین کو برابری کے حقوق دو۔ اگر تم یہ سب کر لو گے تو تمہارے اندر سے دہشت گردی اور شدت پسندی ختم ہو جائے گی۔ ان کی بولی بولنے والی ہزاروں این جی اوز اور ان عالمی طاقتوں کی امداد کے لالچ میں دیوانے ہوئے حکمران روزان اقدامات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور میڈیا میں ”دانشوروں“ کے مضامین اور گفتگو صرف چند باتوں پر مرکوز ہے‘ نظام تعلیم سے مذہب نکالو‘ مدرسوں کو ٹھیک کرو‘ عورتوں کو میدان عمل میں لاؤ‘ دہشت گردی کا یہی توڑ ہے۔ لیکن کوئی اس بات کا جواب نہیں دے پاتا کہ گزشتہ ایک سو سال کی انسانی جنگوں میں کسی اور جنگ میں اس جوق در جوق رضاکارانہ طور پر اتنے جہادی نہیں گئے جتنے عراق اور شام میں دولت اسلامیہ کے لئے لڑنے گئے ہیں۔ افغانستان میں بھی جتھے بنائے گئے‘ تنظیمیں بنیں‘ ان کو امریکہ اور دیگر حواریوں نے مدد فراہم کی‘ ویت نام میں بھی چین اور روس کی مدد شامل تھی۔ لیکن یہاں سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کسی بیرونی ملک سے لڑنے کے لئے جانے والوں میں اکثریت یورپی ممالک کے افراد کی ہے۔ وہ مغربی ممالک جہاں یہ سب پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسے ممالک جہاں سیکولر نظام تعلیم رائج ہے‘ جمہوریت بھی مستحکم ہے‘ معاشی ناہمواری بھی نہیں‘ وہاں تو کوئی مدرسہ بھی قائم نہیں ہے پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنی پرآسائش زندگیاں چھوڑ کر شام اور عراق میں لڑنے جا رہے ہیں۔ داعش کے آغاز میں یعنی آج سے چھ ماہ قبل 30 اگست 2014ء کو ”اکانومسٹ“ نے ان افراد کی تعداد بتائی تھی جو یورپی ممالک سے لڑنے عراق اور شام گئے ہیں۔ جریدے کے مطابق بیلجیم سے 250‘ ڈنمارک سے 100‘ فرانس سے 700‘ آسٹریلیا سے 250‘ ناروے سے 50‘ ہالینڈ سے 120‘ آسٹریا سے 60‘ آئرلینڈ سے 30‘ برطانیہ سے 400‘ جرمنی سے 270 اور امریکہ سے 70 افراد اپنی پرتعیش زندگی چھوڑ کر شام چلے گئے۔ اس وقت ان کی تعداد کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ دنیا کی اب تک ہونے والی جنگوں میں کسی بھی جنگ میں یورپ سے اس قدر تعداد رضاکار جنگجوؤں کی روانہ نہیں ہوئی اور نہ ہی اس قدر زیادہ ملکوں سے لوگ کسی ایک جگہ لڑنے گئے ہیں۔ یورپی ممالک سے ایسے جہاد مارچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ مغربی ملک کونسا مدرسہ بند کریں گے اور کونسا نصاب تعلیم تبدیل کریں گے اور عورتوں کو اور کتنے زیادہ حقوق دیں گے کہ شدت پسندی کم ہو۔ یہ سب جنگ پراپیگنڈے سے جیتنا چاہتے ہیں۔ لیکن دسمبر کے آخری ہفتے میں جرمنی کے صحافی جو رگن ٹوڈن ہومز نے برطانوی اخبار Independent میں اپنے دولت اسلامیہ کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ یہ 74 سال جرمن صحافی واحد مغربی صحافی ہے جو اب تک وہاں پہنچا ہے۔ اس کے انکشافات ایسے ہیں کہ جو مغرب کے لئے کڑوی گولیاں سمجھی جارہی ہیں۔ انہیں پہلے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے سیکولر معاشرے سے اس قدر جہادی کیسے پیدا ہو سکتے ہیں‘ اب وہ ٹوڈن ہومز کی اس بات پر کیسے یقین کر لیں جو اس نے سی این این پر انٹرویو دیتے ہوئے کہی ہے۔ اس نے کہا کہ ”وہ وقت دور نہیں جب داعش مغرب کے ساتھ بقائے باہمی کے لئے مذاکرات کرے گی اور مغرب کو دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہو گا“۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے‘ سوچنے کی گھڑی ہے۔ مغرب شاید سوچ رہا ہے کہ شدت پسندی اور دہشت گردی ہماری پالیسیوں اور طاقت کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے لیکن اس نے بندوق ہمارے ہاتھ میں پکڑا دی ہے۔ خون بھی ہماری زمینوں پر بہتا ہے اور شدت پسندی بھی یہاں جنم لیتی ہے۔ ہم کب تک قتل کرنے اور قتل ہوتے رہیں گے۔ چند لمحوں کے لئے اپنے مسلک‘ اپنی نسل‘ اپنے عقیدے اور اپنی تعلیم کے تعصب کو پس پشت ڈال کر سوچیے ضرور۔ صرف چند لمحوں کے لئے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سول سوسائٹی کی جنت و جہنم

ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنے کسی پیارے کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد فوراً دست دعا بلند کرتے تھے' اللہ سے اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتے' اس کے درجات کی بلندی کی استدعا کرتے اور اسے جنت الفردوس میں مقام عطا کرنے کے لئے اللہ کے سامنے درخواست گزار ہوتے۔ یہ کیفیت صرف مسلمانوں کی ہی نہیں تھی بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والے اپنے پیارے کو آئندہ دنیا کے سفر پر روانہ کرتے تو اس کی یاد میں جو بھی تقریب منعقد ہوتی وہ دعاؤں اور رب کے حضور التجاؤں سے آغاز اور انجام پاتی۔ ہم میں سے ہر کسی کا یہ ایمان تھا کہ مرحوم جس دنیا میں چلا گیا ہے وہاں اسے ہماری نعرہ بازی' جلسوں اور پوسٹر بازی سے زیادہ ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ کوئی مظلوم کسی ظالم کے ہاتھوں قتل ہوتا' کوئی وطن کی حفاظت میں جان دیتا' یا چوروں ڈاکوؤں سے لڑتا زندگی کی بازی ہارتا' ہم ایسے شہیدوں کے لئے دعائیہ تقریبات منعقد کرتے کہ ہمارا ایمان تھا کہ یہ لوگ تو اللہ کے ہاں بخشے جا چکے ہیں لیکن ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے ہمارے اپنے گناہ کم ہوں گے اور ہماری بھی بخشش کا سامان مہیا ہوگا۔ یہ وہ زادِ راہ تھی جو ہم اپنے پیاروں کو دیا کرتے تھے۔ کسی کی یاد میں قرآن پڑھ کر اور کسی کی برسی پر دعاؤں کے نذرانے دے کر۔ لیکن جس طرح "سول سوسائٹی" کے نام پر اس ملک سے اور بہت سی اقدار چھینی جا رہی ہیں' اب یہ قدر بھی موم بتیاں روشن کرنے میں بدل گئی۔

موم بتیاں کب سے روشن ہونا شروع ہوئیں' انہیں کیوں روشن کیا جاتا تھا اور اب اسے ایک معاشرتی رواج کیوں دیا جا رہا ہے۔ دنیا میں یہودیوں نے سب سے پہلے مٹ زاوہ (MITZAWAH) کے نام پر موم بتیاں روشن کرنا شروع کیں' اسے خواتین روشن کرتیں اور اس کا مقصد عورت کے اس ازلی ابدی گناہ کی تلافی کرنا تھا جس کا ماخذ یہودی اپنی کتاب تاعود کے پیرا 31۔ب سے لیتے ہیں "اے عورت تم سے ایک جرم سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں ہمیں جنت سے نکلنا پڑا۔ تم سانپ کی دلکشی پر فریفتہ ہو گئیں اور اس کے بہکاوے میں آ گئیں اور پھر تو نے ہمارے باپ آدم کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ یوں تمہاری وجہ سے اس زمین بلکہ ہماری زندگیوں میں بھی اندھیرا چھا گیا۔ اس لئے اب تمہیں موم بتیاں روشن کر کے دنیا میں روشنی کو واپس لانا ہوگا"۔ موم بتی کو روشن کرنے اور عورت کی غلطی کی تلافی وہ یوم سبت یعنی ہفتے کے دن کے تہوار کے طور پر کرتے ہیں۔ یہ موم بتیاں جمعہ کی شام یعنی ہفتے کی رات کو روشن کی جاتی ہیں۔ عورتیں دو موم بتیاں جلاتی ہیں' ایک تورات کے باب Exodus8:20 کے مطابق جب یہودیوں کو اپنے وطن سے دربدر کیا گیا تھا اور دوسری تورات کی پانچویں کتاب Deuteronmy کے فقروں 5:12 کے مطابق جن میں یوم سبت منانے کے لئے کہا گیا ہے۔ عورتیں موم بتیاں جلا کر اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانک لیتی ہیں۔ پھر شکر ادا کرتی ہیں کہ خدا نے ہمیں مقدس بنایا اور ہمیں سبت کی شمعیں جلانے کا حکم دیا۔ یہودیوں کا ایک اور تہوار "ہنوکا" HANUKAH ہے جو یہودی مہینے کزلیو KISLEV کی 25 تاریخ کو آٹھ دن کے لئے منایا جاتا ہے۔ یہ تہوار 165 قبل مسیح میں یہودیوں کی یونانی اور شامی فوجوں پر فتح کے جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسے "چنوہا" CHANUH یعنی روشنیوں کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ ان آٹھ دنوں میں یہودی مسلسل موم بتیاں روشن کرتے ہیں۔ موم بتیاں جلانا ان کے لئے ان تہواروں تک ہی محدود نہیں' بلکہ مرنے والے کی موت کی سالگرہ کے دن بھی موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔ اس خاص موم بتی کا نام YAHRTZEIT رکھا گیا ہے۔ کسی سانحے' تشدد یا بربریت میں مرنے والوں کی یاد میں موم بتیاں جلانے کا رواج بھی یہودیوں نے شروع کیا۔ جنگ عظیم دوم کے بارے میں یہودی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے ساٹھ لاکھ افراد قتل کئے گئے تھے۔ ان ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کی یاد میں ہر سال "یوم نشوہا" YOM-E-NASHOAH منایا جاتا ہے اور ہر گھر' عبادت گاہ اور یہودی عمارت پر موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔ موم بتی جلا کر مرنے والوں کی یاد منانے کی یہ رسم یہودیوں نے خود ایجاد کی اور اس کا ان کے دین سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی احکامات موجود تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی اس رسم کو عیسائیت نے بھی اپنا لیا حالانکہ اس کا کوئی حکم نہ انجیل میں موجود تھا اور نہ ہی قدیم روایات میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس کا آغاز مشرقی آرتھوڈوکس چرچ نے اپنی عبادت سے کیا جس میں پورے کا پورا مجمع ہاتھ میں موم بتی پکڑے کھڑا ہوتا ہے۔ قربان گاہوں پر موم بتیاں روشن کی جانے لگیں' مشرقی کیتھولک' اورینٹل کیتھولک بلکہ رومن کیتھولک سب کے سب موم بتی کو مسیح کی روشنی سے تعبیر کرنے لگے۔ اس رواج کو مقدس بنانے کے لئے کہا گیا کہ چرچ میں جلائے جانے والی موم بتیوں میں کم از کم 51 فیصد موم شہد کی مکھیوں کے چھتے سے حاصل کیا جائے۔ ایسٹر کے موقع پر ایک خاص موم بتی روشن کی جاتی ہے جسے پاشل PASCHAL کہا جاتا ہے۔ اسے مسیح کے ایسٹر کے دن دوبارہ زندہ ہونے کی علامت کے طور پر جلایا جاتا ہے۔ لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے کے بعد موم بتیاں جلانے کو ایک عالمی رسم بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ رسم عام آدمی نے قبول نہیں کی بلکہ ہمارے معاشرے کی ایک نئی ایجاد سول سوسائٹی نے کی۔ یہ سول سوسائٹی کیا ہے۔ اس کا تاثر پوری دنیا کے غریب معاشروں میں ایسا ہے جیسے ساری قوم جاہل' ان پڑھ گنوار' ظالم' متشدد اور بیہودہ ہے اور یہ چند فیشن زدہ' مغرب سے مرعوب اور اپنی زبان و تہذیب سے ناآشنا لوگ ہی ہیں مہذب اور انسان دوست ہیں۔

یہ سول سوسائٹی روسی کیمونسٹ حکومت کے خاتمے کے بعد کارپوریٹ سرمائے سے بننے والی جمہوری حکومتوں نے دنیا کے غریب ملکوں میں ایک عالمی کلچر کے فروغ کے لئے بنائی تاکہ ان کا مال بک سکے۔ پہلے کسی ملک میں حکومت ہوتی تھی اور دوسرے عوام۔ دنیا کی تمام حکومتیں اور عالمی انجمنیں حکومتوں کو قرض دیتی تھیں تاکہ وہ عوام پر خرچ کریں۔ لیکن اسی کی دہائی میں ان حکومتوں کو کک بیک اور عالمی رشوت خوری کے ذریعے کرپٹ کیا گیا اور پھر ایک وسیع پراپیگنڈے سے بدنام کیا گیا تاکہ مغربی حکومتیں اور عالمی انجمنیں غریب ملکوں میں براہ راست لوگوں کو امداد دیں۔ اس کے لئے این جی اوز بنائی گئیں۔ ہر ملک کے سفارت خانے نے مدد دینے کی کھڑکی کھول لی' عالمی ادارے بھی انہی این جی اوز کو گرانٹ دینے لگے۔ یہ لاکھوں روپے تنخواہ' پر تعیش دفاتر اور بڑی بڑی ائرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں گھومنے والے انہی این جی اوز کے ملازم تھے یا پھر ان کے کرتا دھرتا۔ ان تمام مفت خوروں نے مل کر ایک گروہ تشکیل دیا جس کا نام سول سوسائٹی ہے۔ یہ دنیا کے ہر غریب ملک میں پایا جاتا ہے۔ افریقہ میں اس کی بہتات ہے۔ یورپ میں عوام سڑکوں پر نکلتی ہے لیکن افریقہ اور ایشیا میں سول سوسائٹی۔ عالمی امداد پر پلنے والے اس گروہ کا ایجنڈا بھی وہی ہے جس کی بنیاد پر انہیں سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے آسان پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ آپ کو کبھی بھی مغرب میں توہین رسالت کے واقعہ یا کارٹون چھپنے پر سڑکوں پر نظر نہیں آئیں گے لیکن کسی بھی شاتم رسول کی یاد میں شمعیں جلانے ضرور آجائیں گے۔ یہ کسی بھتہ خور اور قاتل کے قتل کے خلاف بینر نہیں اٹھائیں گے خواہ وہ بلدیہ ٹاؤن میں 272 افراد کو زندہ جلا دے' لیکن کسی مولوی کے ایک بیان پر رات دن احتجاج کریں گے۔ افغانستان اور عراق میں امریکی افواج لاکھوں لوگوں کا قتل عام کر دے' انہیں کبھی دکھ نہیں ہوتا لیکن ایک امریکی کو اغوا کر کے قتل کر دیا جائے تو ان کو انسانیت یاد آجاتی ہے۔ یہ ان کا حق ہے جس کو چاہیں روئیں یا جس پر چاہیں نہ روئیں لیکن دکھ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے قوم پہلے اپنے شہیدوں کو' بے گناہ مر جانے والوں کو' یا پھر اپنی کسی محبوب شخصیت کی یاد منانے کے لئے اکٹھا ہوتی تو اپنے پروردگار سے دست بدعا ہوا کرتی تھی لیکن شاید ہم اب ان لوگوں کے لئے دعا کرنا بھی بھول جائیں گے۔ بس موم بتی جلائی' تصویر بنوائی اور آرام سے سو گئے۔ صوفیاء اور اہل نظر کا عقیدہ ہے کہ ہر جمعہ کی رات ارواح اکٹھا ہوتی ہیں تو اگر کسی کی اولاد یا چاہنے والے نے اس کے لئے مغفرت کی دعا کی ہوگی' کوئی تلاوت اس کے نام سے کی ہوگی' کوئی نیکی کا کام یا رفاہِ عامہ کا کام اس کے نام منسوب کیا ہوگا تو یہ اسے تحفے یا اجر کے طور پر ملتا ہے۔ ان ارواح کے ہجوم میں سب سے شرمندہ اور پژمردہ وہ روح ہوتی ہے جس کی اولاد یا پیار کرنے والے اسے ایسا تحفہ نہیں بھیجتے۔ ہم نے زندوں کو تو مایوس کیا تھا اب ہم نے مردوں کو بھی مایوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب ہمارے مُردوں کے نصیب میں سول سوسائٹی کی جنت یا جہنم ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سودی آقا جمہوری غلام

یہ سب سرمایہ کہاں سے آتا ہے۔دولت کی یہ ریل پیل جو سیاسی جماعتوں کے اجتماعات میں نظر آتی ہے' کیا یہ ان تمام لیڈروں کی ذاتی جمع پونجی ہے۔ کسی کنجوس کا نقشہ پشتو کے اس محاورے میں خوب کھینچا گیا ہے، "وہ تو کسی کو اپنا بخار بھی نہیں دیتا"۔ سیاسی پارٹیوں میں موجود ان رہنماؤں کی اکثریت بھی ایسی ہے کہ روزمرہ زندگی میں وہ کسی غریب' مسکین' نادار یا اپنے مفلوک الحال ہمسائے پر چند روپے خرچ نہیں کرتے' لیکن جلسوں' جلوسوں' فلیکس' پرچموں کی تنصیب اور پارٹی پبلسٹی پر لاکھوں' کروڑوں بلکہ اب تو اربوں روپے خرچ ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان سب کا خرچہ کون اٹھاتا ہے۔ یہ ہن ان پر کون برساتا ہے۔ کیا ان کو یہ سرمایہ وہ دکاندار فراہم کرتا ہے جو صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر رزق کماتا ہے یا وہ کارخانہ دار ان کی جھولی میں کروڑوں روپے ڈالتا ہے جس نے محنت سے فیکٹری لگائی ہے۔یہ سب مل بھی جائیں تو اس "شاندار جمہوری نظام" کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے۔اس لئے کہ پارٹی چلانا' مسلسل دورے' جلسے' جلوس' لٹریچر' میڈیا کے اشتہارات وغیرہ جیسے اخراجات ایک اندھا کنواں ہیں جس میں مسلسل نوٹ ڈالنے پڑتے ہیں اور واپس صرف اسمبلی کی رکنیت اور اس ملک کے غریب عوام کی قسمتوں سے کھیلنے کا اختیار ملتا ہے، یہ وہ اختیار ہے جس سے اس دولت کے ڈھیر میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر اسے پارٹی فنڈنگ کے لیے استعمال کیا جاتا اور ذاتی سلطنت کی وسعت کے لئے بھی۔

یہ سرمایہ کہاں سے آتا ہے؟ یہ سرمایہ یقیناً ان اٹھارہ کروڑ عوام کی جیبوں سے آتا ہے اور ان معصوموں کو اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ یہ انہیں سے لوٹی ہوئی دولت ہے جو انہیں ہی بے وقوف بنانے پر استعمال ہو رہی ہے۔ دنیا کی ہر جمہوریت کے پیچھے سودی بینکاری نظام کی پیدا کردہ مصنوعی دولت کار فرما ہے اور یہی صورت حال پاکستان کے "معزز جمہوری نظام" کی بھی ہے۔ جمہوریت اور سودی نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سودی نظام ایک مصنوعی دولت تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کے تحفظ کے لئے ایک ایسے سیاسی نظام میں سرمایہ لگاتا ہے جو بظاہر ایسے لگے جیسے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آیا ہے لیکن اسمبلیوں اور سینٹ میں وہ ان بینک مالکان کا تحفظ کرتا ہے جنہوں نے پارٹی فنڈنگ کے ذریعے ان کے انتخابات کا خرچہ اٹھایا تھا۔ سودی نظام کا آغاز سٹیٹ بنک سے ہوتا ہے۔ یہ ملک میں موجود سونے کے ذخائر' سکیورٹی یا Goodwill کے مطابق نوٹ چھاپتا ہے جس پر یہ عبارت تحریر کرتا ہے کہ وہ "عندالطلب کو مطالبے پر ادا کرے گا" اس وقت پاکستان کے پاس تمام سونا' بانڈ' سکیورٹی وغیرہ ملا کر کل 318 ارب روپے کی مالیت بنتی ہے لیکن 1700 ارب روپے کی مالیت کے نوٹ چھاپ رکھے ہیں اور ان پر یہ وعدہ درج ہے کہ ہم عندالطلب کو اس کے بدلے سونا' چاندی' چاول' گندم ادا کریں گے۔ پھر سود خور بنکوں کا مرحلہ آتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت 97 فیصد سے زیادہ بینکاری پرائیویٹ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ واحد سرکاری بنک نیشنل بنک ہے۔ بنکوں کو ایک خاص شرح "ریزرو" نوٹ رکھ کر مصنوعی دولت تخلیق کرنے کا اختیار ہے۔ یہ وہ سرمایہ اپنی خط و کتابت Transaction سے تخلیق کرتے ہیں۔ یعنی ایک کاغذ یا ڈرافٹ جس پر ایک کروڑ روپیہ لکھا ہوا ہے وہ چینی والے سے کھاد والے' فرنیچر والے' دوائی والے' آٹے والے سے ہوتا ہوا بنکوں تک پہنچتا ہے اور بنک مالا مال ہو جاتے ہیں۔ معیشت کی زبان میں اسے M2 کہتے ہیں اور بنکوں کو اصل سرمائے سے چالیس گنا زیادہ مصنوعی دولت تخلیق کرنے کا اختیار ہے۔ اس وقت ملک میں یہ مصنوعی دولت نو ہزار آٹھ سو اٹھائیس (9828) ارب روپے کے برابر ہے۔ یعنی اصل دولت یا سکیورٹی جو تین سو اٹھارہ ارب ہے اس پر مصنوعی دولت نو ہزار آٹھ سو اٹھائیس ارب روپے بنائی جا چکی ہے۔

کیا یہ دولت ان ظالم' خون چوسنے والے سود خور بنکوں نے کسی سرمایہ کاری کی صورت میں پیدا کی ہے' کیا انہوں نے کہیں کوئی ملیں یا کارخانے لگائے ہیں۔ نہیں۔ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ ان جمہوری حکومتوں کی عیاشیوں اور اللے تللوں کیلئے انہیں قرض دیا ہے۔ ان میں تمام نجی بنک بھی شامل ہیں اور اسلامی بنکوں نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے سکوک جاری کیے ہیں' جن پر وہ بھی اسی سودی شرح پر رقم وصول کر رہے ہیں اور وہ اسے بڑی سہولت اور آسانی سے حلال منافع قرار دیتے ہیں۔ اس وقت حکومت پاکستان پر ملکی بنکوں کا کل قرضہ دس ہزار ارب روپے ہے۔ جسے DomesticDebt کہتے ہیں۔ اس سال حکومت نے اس قرض پر ایک ہزار پانچ سو ارب روپے سود ادا کرنا ہے۔ حکومت بنکوں سے یہ قرضہ تین طریقوں سے لیتی ہے۔ 1- پاکستان انوسٹمنٹ بانڈ۔ 2- اجارہ سکوک۔ 3- مارکیٹ لٹریری بانڈ۔ اکتوبر 2014 تک ان بنکوں نے حکومت کو گیارہ ہزار چار چھہتر 11476 ارب روپے کا قرض دے رکھا تھا۔ اس میں اسلامی بنکوں کے 319 ارب روپے کے سکوک بھی شامل ہیں۔ یہ ہے ان بنکوں کی کل سرمایہ کاری۔ حکومت کو قرض دیتے ہیں اور حکومت پوری قوم کو مقروض بناتی ہے اور پوری قوم یہ قرض اپنے خون پسینے کی کمائی سے ٹیکسوں کی صورت میں ادا کرتی ہے۔ یہ بنک کوئی پبلک لمیٹڈ کمپنیاں نہیں بلکہ افراد اور خاندانوں کی ملکیت ہیں۔ مثلاً ایک بنک کے شیئر ہولڈرز میں ایک بھائی 22%' دوسرا بھائی 22 فیصد' باپ 20 فیصد' ان کی کمپنی 17 % جبکہ سٹیٹ بینک صرف 10 % ہے یعنی جو منافع حکومت ان کو ہر سال ادا کرتی ہے وہ ان مالکان کو گھر بیٹھے اس سودی نظام کی بدولت ملتا رہتا ہے۔ لوگوں پر ٹیکس لگائیں' قیمتیں بڑھائیں' ظلم کریں ان سرمایہ داروں کو سود ادا کرتے رہیں۔ میں ایک اور بڑے نجی بنک کے مالکان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا کہ لوگ اسے سیاسی گفتگو نہ بنا لیں' ورنہ وہ اس بنک کے شیئر ہولڈرز کی لسٹ دیکھ لیں اور پھر سوچیں کہ اس نے بھی حکومت کو 431 ارب روپے قرضہ دیا ہوا ہے اور وہ اس کا سود گھر بیٹھے وصول کر کے مالا مال ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سب پرائیویٹ بنک مالکان اسی طرح مصنوعی دولت تخلیق کرتے ہیں اور ان کو ایسا ہی جمہوری نظام چاہیے جو ان سے دولت قرض لے کر عوام کو مقروض کرے اور عوام پر ٹیکس لگا کر ان کی تجوریاں بھرے۔ اس وقت پاکستان کا ہر بچہ 96776 چھیانوے ہزار سات سو چھہتر روپے سے زیادہ کا مقروض ہے۔ کیا کوئی کسی کو مرضی کے بغیر مقروض کر سکتا ہے ہرگز نہیں۔ لیکن جمہوری نظام کی ایک شاندار منطق ہے کہ کیونکہ عوام نے ہمیں ووٹ دے کر منتخب کیا ہے اس لئے انہوں نے ہمیں یہ اختیار بھی دیا ہے کہ ہم ان کے نام پر قرضہ حاصل کریں اور ان کو مقروض بنائیں۔ دنیا میں جن ملکوں نے بھی قرضہ واپس کرنے سے انکار کیا انہوں نے کہا کہ یہ ڈکٹیٹروں نے لیا تھا اس لئے ہم واپس نہیں کریں گے' جیسے ارجنٹائن جیسے ملک۔ لیکن کوئی جمہوری ملک اپنے جمہوری حکمرانوں کے لئے گئے قرضوں کا انکار نہ کر سکا' اس لئے کہ یہ سب بنک کہتے ہیں کہ ان سیاسی رہنماؤں کو لوگوں نے ووٹ دے کر منتخب کیا تھا' یہ تمہارے جائز حکمران تھے اب تم ان کا لیا ہوا قرض ادا کرو۔ یہ ہے سودی معیشت اور جمہوریت کا گٹھ جوڑ۔ اسی لئے وہ مصنوعی دولت جو تخلیق کی جاتی ہے پارٹی فنڈنگ کے نام پر دنیا بھر میں جمہوری نظام کی بقا کے لئے خرچ کی جاتی ہے۔ اسی سے بڑے بڑے پارٹی کنونشن ہوتے ہیں' چھپتا ہے' میڈیا پر اشتہارات دیئے جاتے ہیں' جلسے اور جلوس نکالے جاتے ہیں' وہ تمام رنگا رنگی جو امریکی انتخابات سے لے کر پاکستانی سیاست تک نظر آتی ہے' سب اسی سرمایے کی مرہون منت ہے۔ اسی لئے' امریکہ کے سرمایہ داروں نے 32 ہزار ارب ڈالر چوری کر کے کیمن جزیرے کے بنکوں میں رکھا ہے لیکن کوئی کانگریس میں آواز تک نہیں اٹھاتا' ویسے ہی پاکستان کے سرمایہ داروں نے جو اربوں ڈالر سوئٹزر لینڈ کے بنکوں میں رکھا ہوا ہے اس پر بھی کوئی شور نہیں مچاتا۔ گراموفون ریکارڈ کی کمپنی کے اشتہار پر ایک لاؤڈ سپیکر کے سامنے کتا بیٹھا ہوتا ہے اور آواز کو غور سے سن رہا ہوتا ہے اور اس پر لکھا ہوا تھا HisMajesty'sVoice یعنی "اس کے آقا کی آواز"۔ اس جمہوری نظام کے آقا وہ کارپوریٹ کلچر کے سودی بینکار ہیں' انہی کے دم سے یہ رونق بازار ہے۔ اسے کون اجڑنے دے گا۔ یہ ایک رقص ہے جو عوام کے خون پسینے کی کمائی سے سود ادا کر کے سرِ بازار کیا جا رہا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

سودی معیشت کا کارپوریٹ کلچر اور اس کا لٹریری فیسٹیول

اگر بڑی بڑی نئے ماڈل کی چمکدار گاڑیوں سے اترتے ہوئے ڈیزائنر ملبوسات زیب تن کیئے لوگ الحمرا لاہور کی روشوں پر چلتے ہوئے ہاتھوں میں انگریزی زبان میں چھپا ایک ادبی تقریب کا بروشر تھامے ایک ایسی زبان بولتے نظر آئیں جسے آپ نہ انگریزی کہہ سکیں اور نہ ہی اردو' پنجابی تو خیر ان کو چھو کر بھی نہیں گزری ہوتی کہ اس کے بولنے سے ایک میلے پن کا تصور انہیں گھیر لیتا ہے' تو یوں سمجھیں آپ لاہور لٹریری فیسٹیول کے دنوں میں اس جگہ کو دیکھ رہے ہیں۔ کارپوریٹ سرمائے کی چکاچوند سے یہ میلہ اب ہر سال لگتا ہے جس کا ماحول پیرس کی کسی کیٹ واک سے مختلف نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں کارپوریٹ کلچر کی اشرافیہ کے ملبوسات کی نمائش چند مشہور چہروں کے ذریعے کروائی جاتی ہے اور یہاں اسی کارپوریٹ کلچر کی اشرافیہ کے لئے تخلیق کیئے گئے ادب کو چند مشہور چہروں کی موجودگی اور ملبوسات کی رنگارنگی سے مقبول بنانے کی بھونڈی سی پیش کش کی جاتی ہے۔ نہ فیشن شو میں کیٹ واک کرتی خوبصورت ماڈلز نے جو ملبوسات زیب تن کیے ہوتے ہیں وہ عام آدمی کے ذوق کی چیز ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کو استعمال کرنے کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ اسی طرح جو ادب ایسے لٹریری فیسٹیول میں پیش کیا جاتا ہے یا جس پر بحث کی جاتی ہے' اس کا بھی عام آدمی سے دور کا واسطہ نہیں۔ اس کا تعلق تو گزشتہ تیس سالوں میں پاکستان میں او لیول اور اے لیول سے جنم لینے والی ایک محدود تعداد سے ہے۔ ایک ایسی نسل جس کا اس زمین سے رشتہ صرف لاؤنج یا ڈرائنگ روم میں چھاپے لگانے' اجرک کو فریم کروانے' یا گاؤں میں بسنے والی کسی خاتون کی کڑھائی کو جدید فیشن کے ملبوسات پر لگا کر اسے ایک علاقائی تعلق سے نوازنے تک محدود ہے۔ جو اپنے گزشتہ ماضی کی کہانیاں ایسے پڑھتے ہیں جیسے امریکہ پر قابض نو آبادیاتی گورے ریڈ انڈین کے قصے پڑھا کرتے تھے۔ نو آبادیاتی گورے خود کو غیر متعصب ثابت کرنے کے لئے ان کے بارے میں نظمیں' افسانے اور ناول بھی تحریر کرتے تھے' ہالی ووڈ ان پر فلمیں بناتا تھا لیکن یہ سب کا سب صرف اور صرف تفنن طبع کے لئے ہے یا پھر کسی افسانے' ناول' ڈرامے یا تحقیق میں رنگ بھرنے کے لئے ہوتا ہے۔ میرے ملک میں لکھنے والوں کی ایک ایسی ہی نسل پیدا ہو گئی ہے جو یوں تو بہت محدود ہے لیکن یہ نسل ان لوگوں کو بہت بھاتی ہے جن کا ایجنڈا اور مقصد صرف ایک ہے کہ دنیا میں مشرق سے لے کر مغرب تک بظاہر ایک ہی طرح کا کلچر پروان چڑھے جسے وہ عرف عام میں لائف سٹائل کہتے ہیں۔ اگر دنیا میں ہر ملک کے شہروں میں بسنے والے افراد ایک طرح کا پیزا' برگر اور چکن نہیں کھائیں گے' ایک طرح کی جینز' شرٹ اور کوٹ نہیں پہنیں گے' شیمپو' صابن' ٹوتھ پیسٹ استعمال نہیں کریں گے تو ان کارپوریٹ کمپنیوں کا مال نہیں بکے گا۔ ایسا سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک طرح کا ادب بھی تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا ادب جس کے تلازمے' استعارے اور صنف کی ساخت تک مغرب سے درآمد کی گئی ہو' لیکن اس میں کہانی کسی پسماندہ بستی کی سنائی جائے۔ یہ سب بھی قاری کو حیرت کے جہان میں لے جانے کے لئے کیا جاتا ہے کیونکہ جس نے اس ناول یا افسانے کو پڑھنا ہے ان کے نزدیک' غربت' بھوک' بیماری' اوپلے' میلے دانت' پھٹے پاؤں' سب ایک انوکھے ماحول کی چیزیں ہیں۔ ایسا ادب ایک خاص مقصد اور خاص تصور کے ساتھ تخلیق کیا جاتا ہے افسانوں' ناولوں' ڈراموں اور کہانیوں میں مخصوص تصور سے کردار تخلیق کیے جاتے ہیں۔ جس کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہو' اسے منفی طور پر پیش کیا جائے' جیسے گزشتہ دو سو سالوں میں جب سے انگریز یہاں آیا' فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی' ایسے ہزاروں ادیب وجود میں آئے جو یہاں کے صدیوں سے قابل احترام کرداروں کو منفی انداز میں پیش کرتے رہے اور کیا خوبصورت دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تو حقیقت نگاری کرتے ہیں۔ ایک مولوی شیطان ہے اور ایک طوائف فرشتہ۔ کیا زمینی حقائق ہیں۔ پہلے یہ حقیقت نگاریاں علاقائی زبانوں میں ہوتی تھیں' لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اب مال خریدنے کے لئے ایک ایسی کلاس وجود میں آ گئی ہے جو رہتی تو اپنے اپنے ملکوں میں ہے لیکن زندگی یعنی لائف سٹائل عالمی یعنی انٹرنیشنل رکھتی ہے۔ ویسا ہی کھانا پینا' اوڑھنا' بچھونا اور اب تو ذریعہ تعلیم اور زبان بھی ویسی ہی ہو گئی ہے' ادب باقی رہ گیا تھا اب وہ بھی عالمی زبان کا اسیر ہو گیا۔ اب لاہور کے بارے میں جاننا ہو تو استاد دامن پڑھنے کی بجائے رڈیارڈ کپلنگ کی روایت تھامے کوئی لاہور میں پیدا ہونے والا پنجابی پڑھو جو انگریزی میں لکھتے لکھتے زیادہ معتبر ہو چکا ہے۔ یہ عام آدمی کے لئے نہیں بلکہ ان چند ہزار لوگوں کے لئے ہے جو اس طرح کے فیسٹیول کو آباد کرتے ہیں' وہ ان کے لئے لکھتا ہے۔

جان پرکنز نے جب اپنی مشہور کتاب Confession of an Economic Hitman لکھی تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ پچیس سال تک اس کتاب کو کسی پبلشر نے چھاپنے کی جرات تک نہ کی۔ اس لئے کہ اس نے مجبور اور چھوٹی معیشتوں کو تباہ و برباد کرنے کی سودی بینکاری اور عالمی قرضوں کے نظام سے پردہ اٹھایا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں ہم بڑے بڑے سودی مالیاتی ادارے وسائل سے مالا مال ملکوں کو بڑے بڑے تعمیراتی منصوبوں جیسے موٹروے' ائرپورٹ' میٹرو' ڈیم وغیرہ کے لئے قرضے دے کر ان کی معیشتیں اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں' وہیں ہم ان معاشروں کے محدود طبقے کو پرتعیش زندگی گزارنے کے لئے وسائل بھی مہیا کرتے ہیں جو ان وسائل سے ہمارا ہی مال بالآخر خریدتے ہیں۔ وہ کہتا ہے جب میں افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں معاشی قرضوں کے لئے حکومتوں سے مذاکرات کرتا تھا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ جن ملکوں کا ہم نے قرضوں سے خون نچوڑ رکھا ہے' جہاں غربت' افلاس' بھوک' بیماری اور جہالت گردش کر رہی ہے وہاں شہروں میں عالمی ریستورانوں' اور عالمی برانڈ کی دکانوں میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب کے خریدار ان کمپنیوں کے وہ اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے جو وہاں کے وسائل لوٹنے کے لئے قائم ہوتیں یا پھر ان این جی اوز کے اہلکار جنہیں دنیا بھر کی حکومتیں سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ ان دونوں طبقات کے لئے علیحدہ سکول' علیحدہ ہسپتال' علیحدہ کلب کھولے جاتے ہیں' یہ علیحدہ قسم کے شاپنگ مالوں میں خریداری کرتے ہیں اور ان کے ادب اور موسیقی کے لئے بھی علیحدہ فیسٹیول منعقد ہوتے ہیں۔ یہ فیسٹیول ایک عالمی کارپوریٹ معاشرے کی تصویر ہوتے ہیں لیکن ان میں علاقائی زبانوں' موسیقی اور ادب کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے' جیسے کسی عجائب گھر کی گیلریوں میں ایک گیلری علاقائی ثقافت کے لئے مخصوص کر دی جائے۔

لاہور کے لٹریری فیسٹیول کی کہانی بھی ایسی ہی ہے۔ اس سارے انگریزی ماحول میں اردو اور دیگر زبانوں کا حال اس پنجرے کے بندر کی طرح تھا جو ان کی ڈگڈگی پر ناچتا ہو۔ کیا دیر' سوات' اٹک' اوکاڑہ' دادو' شکارپور' خضدار اور سبی میں ایسا ہی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ ہزاروں لکھنے والے اپنی انتہائی شاندار کاوشیں جو ان کے دکھوں سے بھرپور اور ان کی زندگی سے عبارت ہوتی ہیں' لے کر منوں مٹی تلے سو جاتے ہیں۔ گزر گیا وہ زمانہ جب پاک ٹی ہاؤس میں مفلوک الحال ادیب بھی عزت سے اپنی تصنیف ملک کے عظیم ادیبوں کو سنا سکتا تھا۔ جب ساری زندگی ساہیوال میں گزارنے والا مجید امجد پاکستان کے ہر بڑے ادبی رسالے میں فخر کے ساتھ چھاپا جاتا تھا۔ ایسا ادب آج بھی تخلیق ہو رہا ہے لیکن پاکستان کے اس ادب کی سودی معیشت سے جنم لینے والے کارپوریٹ کلچر کے اس لٹریری فیسٹیول کو ضرورت نہیں۔ ایسے لکھنے والے' دھرتی' دکھ اور بیماری کی بات کرتے ہیں اور وہ بھی اپنی زبان اور لہجے ہیں لیکن انکے تو مقاصد ہی اور ہیں۔ کارپوریٹ کلچر کو ایک مرنجان مرنج ماحول اور ایسا ادب چاہیے ہوتا ہے جو عالمی زبان اور تہذیب کی اخلاقیات کا درس دیتا ہو۔ کیا کوئی ادارہ پیرس شہر میں انگریزی زبان میں لٹریری فیسٹیول منعقد کرنے کی فضول خرچی کر سکتا ہے یا پھر لندن شہر میں فرانسیسی زبان میں لٹریری فیسٹیول سجانے کی...... یہ صرف مجبور معیشتوں اور سودی عالمی بینکاری سے جنم لینے والے مقروض معاشروں میں ہوتا ہے۔ جس قوم کو تباہ کرنا ہو' سب سے پہلے اس کی زبان اس سے چھینی جاتی ہے' پھر اسے جدھر چاہے مرضی ہانک دو' وہ شکایت تک نہیں کرتی۔

KitaabPoint.blogspot.com

تکبر کے نشے میں ڈوبے ہوئے

بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں پہلے این ایف سی ایوارڈ کے سلسلے کی آخری میٹنگ 1991، کے رمضان میں منعقد ہوئی۔ پنجاب سے نون لیگ حکومت کے شاہ محمود قریشی، سندھ سے لیاقت جتوئی، سرحد سے صاحبزادہ محسن علی اور بلوچستان سے اسلم رئیسانی وزرائے خزانہ کی حیثیت سے شریک تھے۔ دن رات اجلاس چلتے رہتے، بحثیں جاری رہتیں، ایک نکتے پر اتفاق ہوتا تو دوسرے پر اختلاف شروع ہو جاتا، اجلاس کا دائرہ رات افطاری سے سحری تک بھی بڑھا دیا گیا، لیکن کوئی معنی خیز نتیجہ نہ نکلا۔ ڈپٹی سیکرٹری فنانس کی حیثیت سے اس کی میزبانی اور تمام کارروائی کو ضبط تحریر میں لانا میری ذمہ داری تھی۔ ظفر اللہ جمالی بلوچستان کی جانب سے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے شریک تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک گُر کی بات بتائی۔ اجلاس ختم ہوا تو سب لوگ سحری کے لیے جانے لگے لیکن وہ باہر گاڑی کی جانب روانہ ہوگئے۔ میں نے سحری کے لیے کہا تو بولے کہ کامیاب زندگی کا ایک گُر ہے کہ "رات جہاں بھی گزارو، اٹھو اپنے بستر سے"۔ اجلاس ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا، اختلاف ختم ہونے کو نہیں آرہا تھا۔ آخری دن صبح حکم آیا کہ کسی نتیجے پر پہنچو اور دوپہر سے پہلے دستخط کر کے اٹھو۔ کوئٹہ سے ایک ہی فلائٹ تھی جس سے پنجاب اور اس زمانے کے سرحد کے وزیر خزانہ نے جانا تھا۔ فلائٹ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا لیکن اتفاق رائے نہ ہو پا رہا تھا، میں ہر آدھے گھنٹے بعد ایک ڈرافٹ بنا کر لاتا، اس پر بحث شروع ہو جاتی۔ آخر ایک ڈرافٹ پر اتفاق رائے ہوا، لیکن فلائٹ کا وقت ہو گیا۔ وزیر اعظم کا حکم تھا کہ دستخط کر کے وہاں سے اٹھنا ہے۔ ڈپٹی کمشنر ناصر محمود کھوسہ کو بلایا گیا کہ فلائٹ کو کسی طریقے سے روکا جائے تاکہ ڈرافٹ تیار ہو اور دستخط ہو سکیں۔ ناصر محمود کھوسہ کو بیوروکریٹ بہت بااصول افسر سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنی پوری نوکری میں ان کے اصول صرف عام انسانوں کے لیے تھے جبکہ حکمرانوں کے سامنے وہ ان اصولوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے۔ فلائٹ کو تکنیکی معاملے کی وجہ سے روکا جاتا تو کراچی بتانا ضروری تھا، جہاں سے ٹیم آتی، چیک کرتی اور ہو سکتا ہے فلائٹ میں ایک روز کی تاخیر ہو جاتی۔ ایسے میں ناصر محمود کھوسہ نے وہ تاریخ رقم کی جس پر کسی بھی بیوروکریٹ کا سر شرمندگی سے جھک جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے ائیرپورٹ حکام کو یہ اطلاع دی کہ ہمیں بذریعہ سورس معلوم ہوا ہے کہ جہاز کے سامان میں بم چھپایا گیا ہے، آپ اسے دوبارہ چیک کر لیں۔ تمام مسافروں کو جہاز سے اتارا گیا، سارا سامان واپس ائرپورٹ پر لایا گیا۔ مسافروں سے ان کے سامان کی شناخت کروائی گئی اور پھر سامان کی بھرپور تلاشی لی گئی۔ اس سارے عمل میں تین گھنٹے لگ گئے۔ مسافر واپس جہاز پر بیٹھے تو دونوں وزرائے خزانہ اور ان کے ہمراہ بیوروکریٹس کا ایک جم غفیر جہاز میں داخل ہوا اور جہاز روانہ ہو گیا۔ سارے مسافر اسی بات پر خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ کہیں کوئی بم موجود نہ تھا ورنہ تخریب کاری کی وجہ سے ان کی جان چلی جاتی۔ یہ حرکت اگر کسی عام آدمی سے سرزد ہوتی تو اسے "دہشت گردی" اور تخریب کاری کے مقدمے میں گرفتار کر لیا جاتا۔ پولیس اس کے اس مذاق پر اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارتی ہوئی وین میں ڈالتی اور تھانے لے جا کر اس کا دماغ درست کرتی۔ لیکن اس ملک پر گذشتہ سات دہائیوں سے حکمران یہ طبقات جس طرح اپنے روّیوں سے عام آدمی کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے سامنے اپنے بالاتر ہونے کی نمائش کرتے ہیں۔ اور ان کو احساس کمتری کی اذیت کا شکار کرتے وہ صرف ائیرپورٹوں تک محدود نہیں۔ یہ روّیہ آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں نظر آئے گا اور ان حکمران طبقوں میں سیاست دان، بیوروکریٹس اور جرنیل سب شامل ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ عام لوگوں کی لائن سے الگ تھلگ رہتے ہیں کہ کہیں ان کے پسینے کی بُو ان کی طبع نازک پر گراں نہ گذرے۔ رحمٰن ملک یا رمیش کمار ہماری قومی تاریخ کے نئے کردار نہیں ہیں۔ لیکن تاریخ کا نیا روپ یہ ہے کہ وہ دو یا تین سو افراد جو جہاز میں بیٹھے دو تین گھنٹے اذیت برداشت کرتے تھے، اور کسی وی آئی پی کے آنے کے بعد سکھ کا سانس لیتے تھے کہ اب تو جہاز منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ یہ لوگ پہلے اپنی سیٹوں پر بیٹھے دل میں یا آپس میں اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کرتے رہتے تھے، اب انہی لوگوں نے اچانک نفرت کا آتش فشاں ان دونوں ممبران پارلیمنٹ پر لاوے کی صورت اُگل دیا۔ یہ ہکابکا رہ گئے ہیں۔ لوگوں کے سامنے صفائیاں دیتے پھر رہے ہیں۔ لیکن جیسے ہی یہ پارلیمنٹ میں پہنچے تو گرجنے برسنے لگے۔ عالمی قوانین کی کتابیں نکال لیں اور کہا یہ دیکھو، بپھرے ہوئے (Unruly) مسافر کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ یہ بپھرے ہوئے چند مسافر نہیں۔ سات دہائیوں کا غصہ ہے۔ جو آتش فشاں کی طرح بپھر رہا ہے، لاوے کی طرح ابل رہا ہے۔ جہاز کے بپھرے ہوئے مسافر کے بارے میں تو قانون کی کتابیں نکال لیں آپ نے، لیکن جب قوم بپھر جاتی ہے تو کتاب تو دور کی بات ہے، ان متکبر لوگوں کو سوچنے کی بھی مہلت نہیں دیتی۔ کبھی بپھری ہوئی قوموں کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لیں۔

یہ متکبر لوگ بھی غضب کے ہیں۔ عام آدمیوں سے الگ تھلک اور ممتاز نظر آنے کا نشہ انہیں چین نہیں لینے دیتا۔ سیاسی رہنما ہو، اعلیٰ بیوروکریٹ یا جرنیل، جہاز سے اترتے ہی اس کے ذاتی سٹاف کے لوگ اس کا پاسپورٹ پکڑتے ہیں، دستی بیگ ہاتھ میں لیتے ہیں، صاحب، دروازے پر کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوتا ہے اور وہ مہریں لگوا، سامان وصول کر کے گھر آتے ہیں۔ وی آئی پی لاوَنج میں بھی جاتے ہوئے ایسا ہی پروٹوکول موجود ہوتا ہے۔ صاحب بس جہاز کا دروازہ بند ہونے سے چند لمحے قبل اپنی سیٹ پر آکر بیٹھتا ہے۔ یہی سیاسی رہنما، یہی چیف سیکرٹری، آئی جی پولیس یا جرنیل جب تک سرکاری نوکری میں ہوتے ہیں، کسی عوامی عہدے پر براجمان ہوتے ہیں تو ان کی جان کو لاکھوں خطرے لاحق ہوتے ہیں۔ ان کے آگے پیچھے مستعد گارڈ یا اسکوارڈ چلتے ہیں، لیکن جیسے ہی وہ اس نوکری میں یا عوامی عہدے پر نہیں رہتے تو اگلے دن کسی دکان پر سودا خریدتے پائے جاتے ہیں۔ ایسے میں ان "یوسف بے کارواں" لوگوں کے چہرے پر سجا ہوا دکھ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

تاریخ میں ان متکبر اور عوام سے ممتاز رہنے والے کرداروں میں ایک نمایاں کردار ابوجہل کا بھی تھا۔ مکہ کے سرداروں کا ایک سردار، جسے اپنی دانائی اور قبیلے کی برتری کا بہت غرور تھا۔ اس نے وصیت کی تھی، کہ جنگ کے دوران اگر کوئی مجھے قتل کرے تو میرا سر گردن سے ذرا نیچے سے کاٹے تاکہ قتل ہونے والے سروں کے درمیان میرا سر بڑا، ممتاز، ممیز اور علیحدہ نظر آئے۔ یہ خواہش موت کے بعد آج بھی قائم ہے۔ قبرستانوں میں علیحدہ احاطے اور منقش سنگ مزار۔ لیکن انہیں اندازہ تک نہیں کہ اللہ نے یوم حشر میں بھی ان لوگوں کے علیحدہ اور مختلف ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے "مجرمو! آج کے دن علیحدہ ہو جاؤ" (یٰسین)۔ وہ دن جب حشر کے میدان میں سب انسان برابر کھڑے ہوں گے۔ اللہ ایک اعلان کے ساتھ ان کو عام لوگوں کی لائن سے الگ کر دے گا۔ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن متکبر لوگ چونٹیوں کی طرح ہوں گے اور لوگ انہیں روندتے ہوئے گذریں گے"۔ اس دن کسی پارلیمنٹ میں کوئی تحریکِ استحقاق جمع نہ ہو سکے گی، کوئی عالمی یا ملکی آئین اور قانون کی کتابیں نہیں کھول سکے گا۔ کسی مقدس ایوان کا تقدس ان کا تحفظ نہیں کر سکے گا۔ جس طرح وہ آج اس دنیا میں عام لوگوں سے علیحدہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ انہیں وہاں بھی علیحدہ کر دے گا۔

نوٹ: فیس بک اور ٹویٹر پر میرے نام سے بہت سے اکاؤنٹ اور پیج بنائے گئے ہیں جن کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے اکاؤنٹ درج ذیل ہیں۔

فیس بک: www.facebook.com/oryamaqbool

ٹویٹر: https:twitter.com/OryaMaqboolJan

KitaabPoint.blogspot.com

تماشا دکھا کر مداری گیا

سکندر جسے یورپ کے متعصب مورخین نے ایک عظیم فاتح اور حکمران کے طور پر اس کے نام کے ساتھ اعظم (The Great) لکھا اور مغرب کی بالادستی کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ یہ شخص تاریخ کے ظالم ترین لوگوں میں سے ایک تھا۔ مقدونیہ سے خاندانی تعلق کی وجہ سے اس کا باپ ہمیشہ یونان کی حکمت و علم سے مرعوب رہا۔ یونان کی شہری ریاستیں چونکہ تمام شہریوں کو ایک جمہوری اسمبلی کا درجہ دیتی تھیں' اس لئے وہ سکندر کے باپ کو اس کی خواہش کے باوجود اپنا شہری تسلیم نہ کر سکیں۔ مقدونیہ کے اس بادشاہ مزاج شخص نے گھوڑے دوڑائے' علم کے مرکز تھیبس پر قبضہ کیا اور یوں وہ وہاں کا بلا شرکت غیرے عظیم شہری بن گیا۔ یہی شہریت سکندر کے ورثے میں آئی۔ دنیا فتح کرنے کا جنون سکندر پر سوار ہوا تو وہ اپنی مختصر سی فوج لے کر ارد گرد کے علاقوں پر چڑھ دوڑا۔ یہ دنیا کا پہلا حکمران تھا جو امن کے معاہدے کرتا' موقع کا انتظار کرتا اور پھر اس شہر کو فتح کر لیتا جسے وہ معاہدے کے تحت دوست بنا چکا تھا۔ اس کی جنگوں کا عرصہ سالوں پر محیط تھا کیونکہ جنگ ابھی تیر' تلوار اور گھوڑوں سے آگے نہیں نکلی تھی۔ لوگ جنگ پر نکلتے تو مہینوں ان کی خبر نہ ہوتی۔ کوئی راہ چلتا مسافر آکر خیر خیریت بتاتا یا پھر کوئی قاصد فتح و شکست کے بارے میں اطلاع دیتا۔ سکندر مشرقی یورپ کے کسی علاقے میں مصروف تھا کہ تھیبس کے شہر میں کسی مسافر نے یہ اطلاع پہنچائی کہ سکندر کسی جنگ میں مارا گیا۔ شہر کے لوگ سقراط کے زمانے سے آزادی اظہار کی عادت کا شکار تھے۔ شہر میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور شہریوں نے سب سے پہلے میدان میں جمع ہو کر نعرے بازی کی اور پھر شہر کی دیواروں پر ایسے نعرے لکھے جن کا مفہوم تھا کہ "سکندر چلا گیا"۔ سکندر واپسی کے سفر پر روانہ تھا کہ اس کو اس "وال چاکنگ" کی خبر ملی۔ اس نے آتے ہی پورے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تمام شہریوں کو شہر سے باہر نکلنے کا حکم دیا اور پھر نومولود بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر کسی کو قتل کروا دیا۔ سکندر کا شاہانہ اور ظالمانہ مزاج آج بھی آپ کو ہر ایسے حکمران میں ملے گا جو یہ تصور کر بیٹھتا ہے کہ لوگوں پر حکمرانی صرف اس کا یا اس کے خاندان کا حق ہے۔ دنیا بدل جائے' لوگ شعور کی منزلیں طے کر لیں' اظہار کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیں' لیکن ایسے حکمرانوں کی خواہش حکمرانی اور طرز بادشاہت میں فرق نہیں آتا۔ فرق صرف اتنا آیا ہے کہ وہ سکندر کی طرح لوگوں کی زبانیں خاموش کرنے پر قادر نہیں رہے۔ البتہ غصے میں تلملاتے ہوئے اور نفرت میں ابلتے ہوئے فقرے ان کے منہ سے ضرور نکل جاتے ہیں۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ کاش وہ سکندر کے عہد میں حکمرانی کی مسند پر بیٹھتے اور پھر دیکھتے کہ کون سی زبانیں ہیں جو ان کے خلاف زہر اگلتی ہیں اور کون سے ہاتھ ہیں جو وال چاکنگ کرتے ہیں۔

نوے کی دہائی' بلوچستان میں پشتون بلوچ تصادم کی دہائی تھی۔ وہ قوم پرست بلوچ اور پشتون جو 1974 میں ذوالفقار علی بھٹو کے آرمی ایکشن کے دوران متحد تھے' آج ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ میدان جنگ کوئٹہ تھا کہ یہاں دونوں بکثرت آباد تھے۔ ذرا سی بات پر آپس میں بندوقیں تن جاتیں اور لاشیں گرنے لگتیں۔ کوئٹہ بار بار کرفیو کی زد میں آتا۔ دونوں جانب بڑے بڑے جلسے ہوئے اور ان میں ایسی آتش فشاں قسم کی تقریریں ہوتیں کہ یوں لگتا کہ جیسے ابھی دونوں جانب سے لشکر برآمد ہوں گے اور پورا صوبہ خون میں نہا جائے گا۔ شہر حقیقی طور پر بیروت کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ پشتون بلوچ علاقوں میں جانے سے گریز کرتے اور بلوچ پشتون علاقوں میں۔ زرعی کالج کی جگہ کے تنازع نے زور پکڑا تو ہر کوئی کہتا اس کو ہمارے علاقے میں بناؤ۔ یوں بلوچستان اس درسگاہ سے محروم رہ گیا۔ برج عزیز ڈیم بھی پاکستان کے کالاباغ ڈیم کی طرح ثابت ہوا۔ اس سیلابی پانی پر بننے والے ڈیم پر حق ملکیت جتانے کا جھگڑا اتنا طول پکڑا کہ وہ صوبہ جہاں پانی کی ایک ایک بوند بھی قیمتی تھی آج تک اپنے سیلابی پانی کو ذخیرہ بنانے کا کوئی منصوبہ نہ بنا سکا اور سیلابی پانی آج بھی پہاڑوں اور میدانوں سے تیزی سے گزرتا ہوا وسیع ریگستانوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ انہیں دنوں میں یادش بخیر نواب محمد اسلم رئیسانی نے سیاست میں قدم رکھا' نوجوان ڈی ایس پی اور پھر بی ڈی اے کی جنرل منیجری کی نوکری چھوڑ کر سیاست میں آنے والا یہ شخص اپنے ذہن میں بہت سی اخلاقی قدروں کو لئے ہوئے تھا۔ پشتون بلوچ جھگڑوں سے دور وہ الیکشن جیت گیا ۔ مستونگ کی نشست سے اسے ہر قومیت کے فرد نے ووٹ ڈالے۔ اکثر اوقات وہ ان قوم پرست رہنماؤں کے بیانات اور تقریروں پر بات کرتا اور کڑھتا رہتا۔ وزیر خزانہ کی حیثیت سے وہ ایک دن بہت پریشان اور مضطرب حالت میں میرے کمرے میں آیا۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو پریشانی کے عالم میں گھماتا جا رہا تھا۔ سلیمانی چائے بلوچستان میں پسند کی جاتی ہے۔ کہا سلیمانی چائے پلاؤ اور پھر وہ پھٹ پڑا۔ کہنے لگا یہ تمام بلوچ اور پشتون قوم پرست لیڈر جو جلسوں میں ایک دوسرے کا خون پینے کے دعوے کرتے ہیں۔ ان کی تقریریں سن کر لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے اور گھر اجاڑتے ہیں۔ اسمبلی کی کینٹین میں کس طرح خوش گپیوں میں مصروف ہو کر ایک دوسرے کو کیک' پیسٹریاں اور سموسے کھلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے "خاص" بندوں کو میرٹ کے بغیر نوکریاں دیتے ہیں۔ ان کی سکیمیں منظور کرتے ہیں ان کے ذاتی فوائد کے لیے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن جب اسمبلی کے ہال میں مائیک پر کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے نفرت کی جھاگ نکل رہی ہوتی ہے۔ اس زمانے کا اصول پرست نواب اسلم رئیسانی پریشان بھی تھا اور مضطرب بھی لیکن جمہوری پارلیمانی سیاست کی راہداریوں نے اسے ایسا بنا دیا کہ یقین نہیں آتا۔ نفسیات دان کہتے ہیں کہ انسان پر سب سے زیادہ اثر اس کے گروہ (PEER) کا ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ ان کے رنگ میں ڈھلنے لگتا ہے۔

لیکن اس جمہوری پارلیمانی تاریخ کا اس قوم پر ایک بہت بڑا احسان گزشتہ دنوں ہوا ہے۔ یہ احسان ایسا ہے جس نے پوری قوم کی آنکھوں پر پڑے دبیز پردے اتار پھینکے ہیں۔ دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے آج تک کئی ہفتے صرف اس بات پر بحث نہیں کی ہو گی کہ ان کے اپنے مفادات تباہ ہو رہے ہیں۔ وزارت اطلاعات یقیناً انعام کی مستحق ہے کہ اس نے لوگوں کو سیاست کا وہ روپ براہ راست دکھا دیا جو اسلم رئیسانی جیسے ممبران اسمبلی صرف اسمبلی کی کینٹین میں دیکھا کرتے تھے۔ قوم کو پچاس سال سے دست و گریباں کرنے والے' ایک دوسرے پر گالیوں کی بوچھاڑ اور نسلوں کو طعنے دینے والے' غدار کے لقب اور بددیانت کے تمغوں سے سجانے والے یوں اکٹھے ہوئے جیسے سیلاب کے دوران خونخوار جانور بہتے ہوئے تختے پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سیلاب ابھی تھما نہیں تھا کہ انہیں احساس ہونے لگا کہ یہ کیا ہو گیا۔ لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا' سن لیا۔ اب یہ جان گئے ہیں کہ ہم تو شکار کے معاملے میں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں لیکن اپنے لیے متحد ہو جاتے ہیں۔ اب ہر کوئی علیحدہ علیحدہ شکار کو پھر گھیرنے کی تگ و دو میں لگ گیا ہے۔ الزامات دوبارہ زبانوں سے اچھل رہے ہیں لیکن شاید اب تک لوگوں کی آنکھوں اور ذہن میں کئی ہفتے چلنے والے پارلیمنٹ کے اجلاس میں اتحاد و یگانگت کی گفتگو گونج رہی ہے۔ اسی لیے اب ان سیاست دانوں کا لہجہ شاہانہ نہیں ملتجیانہ ہو چکا ہے۔ ورکروں سے معافی مانگتا ہوں' ہمارے خاندان کی قربانیاں ہیں۔ خدا کے لیے ہمیں بھولنا مت۔ لیکن شاید اب لوگ بھولیں گے بھی نہیں۔ انہیں گزشتہ پچاس سال میں اپنے بے وقوف بننے پر شرمندگی انہیں بھولنے ہی نہیں دے گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

تقدیر کو تدبیر سے شکست دینے کی بات

اس فقرے کی گونج موجودہ تاریخ میں بار بار سنائی دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علامہ اقبال نے بغیر کسی تجربے یا چوٹ کھائے ہوئے اپنے وجدان اور قرآنی علم کی روشنی میں اس دور کی جمہوریت کے کریہہ چہرے سے نقاب الٹا' اس آزادی کی نیلم پری کو دیو استبداد کہا جب کہ دنیا نئی نئی اس کے سحر میں گرفتار ہوئی تھی۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال کی عظیم اور معرکۃ الآراء نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس اور اس کے مشیروں کی گفتگو میں اس نظام کے غلیظ چہرے کو بے نقاب کیا گیا ہے وہ مغربی جمہوریت ہے جسے انسانی حقوق' آزادی اظہار اور عوام کی حکمرانی جیسے خوبصورت تصورات کا لبادہ اوڑھایا گیا ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقبال کی ایک اور نظم "ابلیس کی عرضداشت" میں ابلیس اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہے کہ اب دنیا میں انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے میری ضرورت باقی نہیں رہی' اس لیے کہ

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہہ افلاک

گمراہی کا جو پرچم ازل سے ابلیس نے اٹھا رکھا تھا' اقبال کے نزدیک اب اس کے پرچم بردار جمہوری نظام کے سیاست دان ہیں۔ یہاں تک کہ اقبال اپنی طنزیہ شاعری میں بھی جمہوری نظام کا تمسخر اس طرح اڑاتا ہے۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن ممبری' کونسل' صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے

لیکن جس شعر نے اس مغربی طرز جمہوری کی اساس پر کاری ضرب لگائی اور اقبال کی روحانی پارلیمنٹ کا تصور دیا وہ دنیا کی کسی بھی جمہوری پارلیمنٹ پر صادق آتا ہے۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کار شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آئی

اس کا ترجمہ یوں ہے کہ طرز جمہوری سے پناہ مانگ اور کسی پختہ کار یعنی صاحب علم و کمال و تجربہ کا غلام بن جا۔ اس لیے کہ دو سو گدھوں کے دماغ سے انسانی فکر برآمد نہیں ہو سکتی۔ یہ اس فرد کے خیالات ہیں جسے مفکر پاکستان کہا جاتا ہے۔ جس کے خوابوں کی تعبیر یہ مملکت ہے جسے اس وعدے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اس مالک کائنات کا فرمان نافذ ہو گا۔ ورنہ جمہوری طور پر تو ایک ہندوستان میں بھی زندہ رہا جا سکتا تھا۔ مسلم لیگ کی پچاس ساٹھ سیٹیں بھی ہوتیں پارلیمنٹ میں' جماعت اسلامی بھی چند نشستوں پر کھڑے ہو کر "حق گوئی" کا فریضہ ادا کرتی' پیپلز پارٹی اور دیگر سیکولر جماعتیں بھی سیکولر کانگریس یا بی جے پی کے ساتھ اتحاد بنا کر برسر اقتدار آجاتیں۔ متحدہ قومی موومنٹ کے لوگ اپنے یوپی میں ہوتے اور بابری مسجد کے تحفظ کی تحریکیں چلاتے اور اس پارٹی کو ووٹ دیتے جو انہیں زیادہ مراعات دیتی۔ جمہوریت بھی مستحکم ہوتی اور اس کے ادارے بھی۔ ایک تسلسل بھی قائم رہتا۔ یہ ملک اسی لیے جمہوریت کے عالمی اصولوں کے منافی بنایا گیا تھا کہ ہمیں جمہوریت وارا نہیں کھاتی تھی۔ ہمارے لیے یہ جمہوریت "اکثریت کی آمریت" Tyranny of Majority بن جاتی جو آج بنی ہوئی ہے اور وہاں پاکستان سے بھی زیادہ مسلمان بستے ہیں لیکن سچر رپورٹ کے مطابق شودروں اور دلتوں سے بھی بدتر' محروم اور پسماندہ ہیں۔ یہ ہے اس جمہوریت کا پھل جو انہیں میسر ہے' وہاں تو تسلسل بھی ہے' الیکشن بھی شفاف ہوتے ہیں' فوج بھی تختہ نہیں الٹتی۔ سب کچھ بہترین' لیکن بیس کروڑ مسلمان جنہیں "پریشر گروپ" کہا جاتا ہے وہ آج بھی محکوم اور اکثریت کی آمریت کے ظلم کا شکار ہے۔ یہ سب مل کر اگر پچاس کروڑ بھی ہو جاتے تو ایک ارب ہندوؤں کی اکثریت کے سامنے ان کی کیا اوقات اور حیثیت ہوتی۔ اکثریت بھی وہ جو کارپوریٹ سرمائے کی جمہوریت پر استوار ہو' جسے متل' امبانی' ٹاٹا اور برلا کے سرمائے نے پالا ہو۔ کارپوریٹ سرمایہ جو سات ارب ڈالر اوباما' 14 ارب ڈالر سرکوزی اور تین ارب ڈالر گورڈن براؤن کی پارٹیوں کو ملتا ہے اور انہیں غلام بنا لیتا ہے۔ انہی سرمایہ داروں نے تیس ہزار ارب ڈالر امریکی ٹیکس حکام سے چوری کرنے کیلئے کیمن جزیرے میں رکھا ہے لیکن کانگریس میں ایک آواز نہیں اٹھتی۔ کیوں؟ جمہوری تسلسل کیلئے پارٹی فنڈ ضروری ہیں' سرمائے سے چلنے والے میڈیا کی مدد چاہیے۔ یہ دونوں جو کوئی فراہم کریگا' جمہوری ارباب سیاست پتلیوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچیں گے۔ پچاس کروڑ مسلمان اگر اس سیکولر بھارتی جمہوریت میں ہوتے تو دنیا ان کی پسماندگی اور افلاس کی مثالیں دیتی۔ سیلاب میں ڈوبے بنگالی' ہندو مہاجن کے قرض میں جکڑے پنجابی اور سندھی' پسماندہ بلوچ جن کی ریاست قلات میں چند میل پکی سڑک تھی اور کوئٹہ سے کراچی تک صرف دو جگہ پانی میسر تھا۔ انہیں اس اکثریت کی آمریت میں صرف ایک ہی بات یاد آتی۔ ہم پر اس لیے ظلم کیا جاتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں' جس طرح آج کے بھارت کے مسلمان نہ خود کو پنجابی کہتے نہ گجراتی اور نہ بنگالی' اس لیے کہ سب پر جمہوریت کی اکثریت کا ان پر بحیثیت مسلمان ظلم یکساں ہے۔

اس فقرے کی گونج 1970ء کے الیکشن میں بدترین شکست کے بعد مولانا مودودی کے منہ سے سنائی دی تھی۔ میں اس عصر کی محفل میں موجود تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے جمہوریت کے علاوہ اور بھی بہت راستے ہیں اور پھر انہوں نے راستے گنوانا شروع کر دیئے۔ آج 44 سال بعد عوامی جرگے کے ناکام و نامراد لوٹنے کے بعد سراج الحق صاحب نے فرمایا۔ "اس طرز جمہوریت کو ایک نہیں تین طلاقیں"۔ وجہ بتائی کہ سیاستدان کروڑوں لگا کر اربوں کماتے ہیں۔ طلاق کا اصول یہ ہے کہ اگر وہ کسی وجہ کے ساتھ منسوب کر دی جائے اور وہ وجہ قائم رہے تو شرعاً طلاق ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ طلاق قائم رہتی ہے یا حلالہ کی نوبت آجاتی ہے۔ رضائے الٰہی کا حصول ہو یا اسلامی شریعت کا نفاذ' مغربی جمہوری نظام کا راستہ ہی اس سے مختلف ہے۔ کیا سید الانبیاء کی دعوت یہ تھی کہ اسلام قبول کر لو تمہیں تعلیم' صحت' روزگار اور بہتر زندگی کی سہولیات ملیں گی۔ سیکولر اور مذہبی جماعتوں کے منشور اٹھائیں' اوپر کے ورق پھاڑیں' سب کے اہداف ایک جیسے ہیں' صرف دینی جماعتوں نے ان میں قرآن کی آیات تحریر کر رکھی ہیں۔ یہ سب اس سرمایہ دارانہ' سودی نظام کے تحفظ کے راستے پر گامزن ہیں۔ جہاں یہ تصور کر لیا جائے کہ اللہ کی حاکمیت اسی وقت اس ملک پر قائم رہ سکے گی اگر اسے آئین کے چند صفحات تحفظ دیں تو اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اس شرک کے تسلسل کو پاکستان کے مستقبل سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو اگر اللہ چاہے گا تو یہ ملک سلامت رہے گا' خواہ آئین اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں کیوں نہ پھینک دیا جائے اور اگر اللہ نے ہمارے اعمال کی سزا کے طور پر اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر دیا تو سارے کا سارا دستور اسلامی بنا دو اور اس کی ایک شق پر بھی عمل نہ کرو تو یہ پاکستان نہیں بچ سکے گا۔ لیکن اس پاکستان نے رہنا ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کی غیرت و حمیت اور سید الانبیاء کی بشارتوں کی علامت ہے۔ اگر اللہ کی غیرت و حمیت اور حاکمیت اعلیٰ پر کامل ایمان ہو تو پھر سسٹم کے تسلسل پر نہیں اللہ کی تقدیر پر یقین ضروری ہوتا ہے۔

تدبیر کے بندوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ حالات کے غلام ہوتے ہیں۔ لیکن حالات اب تاریخ کا رخ موڑنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ابھی اسلام آباد پر بادل نمودار ہوئے ہیں' یہ کالی گھٹا بنیں گے' سیلاب جو بڑی بڑی عمارتوں کے مکینوں کو بہا کر لے جائے گا۔ قیامت کا سماں ہے۔ سورہ التکویر کی اس آیت کے مصداق کہ جب وحشی جانور اپنی وحشت بھول کر اکٹھے ہو جائیں گے۔ وہ باتیں' وہ نعرے' وہ مطالبے جو دھرنے میں کیے جا رہے ہیں اگر یہ ساری جماعتیں پارلیمنٹ کے ایوان میں کرتیں' ایک سال یہ ہنگامہ اس ایوان میں برپا رہتا تو کیا دھرنے کا کوئی جواز باقی رہتا۔ لیکن یہ تو صرف اور صرف تسلسل چاہتے ہیں۔ ایک فرعون کا اقتدار چار سو فرعون میں تقسیم کر کے اسے جمہوری تسلسل کا نام دینا چاہتے ہیں۔ سراج الحق صاحب' تین طلاق دے دیں کہ جسے آپ آزادی کی نیلم پری سمجھ کر بچانا چاہتے ہیں' وہ دیو استبداد ہے۔ اس اللہ سے امید استوار کریں جو نہ کسی تسلسل کا محتاج ہے اور نہ کسی نظام کا تابع۔ گھٹا چھانے والی ہے' سیلاب کی آمد ہے جو بڑے بڑے پُرغرور سروں کو ڈوبتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے "میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا"۔

KitaabPoint.blogspot.com

تقسیم واضح ہو رہی ہے

یہ وہ سرزمین ہے جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ "اور بچا کر لے گئے ہم اسے (ابراہیمؑ) اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے تمام جہانوں کے لئے برکتیں رکھی ہیں (انبیاء:71)۔ یہ سرزمین شام ہے جسے بلاد الشام یا اخبادالشام کہا جاتا تھا۔ یہ خطہ دریائے فرات سے ارض فلسطین تک پھیلا ہوا ہے جس میں موجودہ دور کے اسرائیل' لبنان' اردن اور شام کے ممالک آتے ہیں۔ یہ تقسیم جنگ عظیم اول کے بعد عالمی طاقتوں کی قائم کردہ قومی ریاستوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی۔ سیدالانبیاء ﷺ نے یہیں سے آسمانوں کی طرف اپنے معراج کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس سے پہلے مکہ سے اس سرزمین تک کے سفر کو اللہ نے دو مسجدوں مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیان کا سفر بتاتے ہوئے فرمایا "پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک' وہ کہ ہم نے جس کے ماحول کو برکت دی ہے (بنی اسرائیل)۔ پیغمبروں کی سرزمین۔ تین ابراہیمی مذاہب کا روحانی مرکز۔ قدیم رومی سلطنت نے اس کو 64 قبل مسیح میں فتح کیا اور پھر مدتوں یہ اس کے ایک مرکزی حصے کے طور پر جانا جاتا رہا۔ اس سے پہلے ایک طویل عرصہ یہ سکندر یونانی کے جرنیل سیلوکس (Seleucis) کے زیر تسلط رہا۔ جس سرزمین پر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی عظیم بادشاہت قائم ہوئی۔ بنی اسرائیل پر نعمتوں اور نوازشات کا نزول بھی اسی سرزمین پر ہوا اور ان پر عذاب کے کوڑے بھی یہیں برسے۔ یہ خطہ ازل سے اہمیت کا حامل ہے اور سیدالانبیاء کی بشارتوں کے مطابق قیامت سے قبل ہونے والی جنگ عظیم میں بھی مسلمانوں کی فتح و نصرت کی علامت ہو گا۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں کسی عالمی طاقت سے جو دو لڑائیاں ہوئیں وہ اسی شام کے علاقے میں برپا ہوئیں اور قیصر روم کی افواج سے ہوئیں۔ فتح مکہ کے بعد جب آپؐ نے اردگرد کے حکمرانوں کو دعوتی پیغامات بھیجے تو ہرقل کے عیسائی حاکم کے نائب شرجیل بن عمرو غسانی نے آپؐ کے سفیر حضرت حارثؓ بن عمیر کو راستے میں شہید کر دیا۔ آپ نے اس عالمی طاقت روم سے سفیر کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لئے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارث کی سربراہی میں لشکر روانہ کیا اور اسے خود مدینے سے باہر چھوڑنے آئے۔ شارف کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ حضرت زید بن حارثؓ شہید ہوئے تو علم حضرت جعفرؓ کے سپرد ہوا۔ آپ کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو اسے بائیں ہاتھ سے پکڑا' بایاں بھی کٹ گیا تو سینے پر شہادت تک سنبھالے رکھا۔ اس کے بعد عبداللہ بن رواحہؓ علمبردار ہوئے وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد خالد بن ولیدؓ نے علم سنبھالا' بے جگری سے لڑے' نو تلواریں ٹوٹیں اور اپنی فوج کو بچا کر لے آئے۔ اسی معرکے میں حضرت جعفر کو طیار اور خالد بن ولید کو سیف اللہ کا لقب حاصل ہوا۔ آپؐ نے واپس آنے والوں کے بارے میں فرمایا یہ کراری ہیں' یعنی یہ دوبارہ لڑنے جائیں گے۔ رجب 9 ہجری کو اطلاع ملی کہ قیصر اپنی فوجیں لے کر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لئے آ رہا ہے۔ وہ جس کی آدھی دنیا پر حکومت تھی جو ایران کو تازہ تازہ شکست دے چکا تھا۔ حضورؐ نے طے کیا کہ اسے عرب کی سرزمین میں گھسنے سے پہلے ہی دفاعی مقابلہ کرتے ہوئے روک دیا جائے۔ یہ غزوہ تبوک کا وہ منظر ہے جس میں مسلمانوں نے ایثار اور انفاق کی مثالیں قائم کیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے گھر کا پورا سامان اسی غزوہ کے لئے اٹھا لائے۔ تیس ہزار جانثار سیدالانبیاءؐ کی سربراہی میں روانہ ہوئے لیکن روم کی فوج نہ آئی۔ اس لئے کہ ان کو کسی نے اطلاع دی تھی کہ نعوذ باللہ مدینہ کے نبیؐ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے یہ حملہ کرنے کا بہترین وقت ہے۔ اطلاع غلط ثابت ہونے پر وہ آگے روانہ نہ ہوئے۔ اس کے باوجود بھی رسول اکرم ﷺ نے وہاں ایک ماہ تک فوجی کیمپ قائم رکھا۔ یہ تھی شام کی اہمیت۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کے زمانے میں 15 ہجری میں اسے فتح کرنے کے لئے لشکر روانہ کیا گیا۔ یہ جنگ یرموک تھی جس کے نتیجے میں بلاد شام مسلمانوں کی ریاست میں شامل ہوا۔ اس جنگ میں اہل بیت رسول ﷺ سے پہلے شہید نے جان جان آفرین کے سپرد کی۔ یہ تھے نواسہ رسول حضرت علی بن العاصؓ۔ ان کی عمر اس وقت بائیس برس تھی۔ یہ آپؐ کی بیٹی سیدہ زینب کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے علی زی نبیؓ بھی کہلاتے تھے۔ اس نواسہ رسول کی شہادت اور شوق شہادت پر علامہ اقبال نے بانگ درا میں ایک نظم "جنگ یرموک کا ایک واقعہ تحریر کی ہے

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند

تھی منتظر حنا کی عروس زمین شام

اک نوجوان صورت سیماب مضطرب

آ کر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام

اے بو عبیدہ رخصت پیکار دے مجھے

لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

بیتاب ہو رہا ہوں فراق رسول میں

اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں

لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں ہے تو

پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

پہنچے جو بارگاہ رسول امیں میں تو

کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے

پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے

شام کی یہ فتح مسلمانوں کی شجاعت اور نواسہ رسول ﷺ حضرت علی بن العاص کی شہادت کی یادگار ہے۔ شام کی یہ سرزمین جس میں اللہ نے عالمین کے لئے برکت رکھی آج جنگ و جدل اور خاک و خون میں غلطاں ہے۔ اسی سرزمین پر اسرائیل بھی اپنے مظالم جاری رکھے ہوئے ہے اور لبنان بھی خون آشامی اور خوف میں زندہ ہے لیکن دمشق اور حلب کے وہ علاقے جن کے بارے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ یہاں مسلمانوں اور دجال کے ساتھ آخری معرکہ ہو گا۔ یہیں غوطہ کے پاس سیدنا امام مہدی کا ہیڈ کوارٹر ہو گا۔ یہیں حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا اور وہ دجال کو قتل کریں گے۔ یہ سب علاقے گزشتہ دو سالوں سے ایک مستقل لڑائی کا شکار ہیں۔ یہی علاقہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کو ایک ملت واحد سمجھ کر ان پر حملہ کیا جاتا ہے۔ انہیں اکٹھا نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسی شام کے علاقے کو جنگ عظیم اول کے بعد چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے ان پر اپنے ٹوڈی' بدترین ظالم حکمران مسلط کیے گئے۔ جس جگہ سے میرے اللہ نے نصرت کا پرچم بلند کرنا ہو' کیسے ہو سکتا ہے کہ وہاں دجال کی طاقتیں اور یاجوج و ماجوج کا نظام حملہ آور نہ ہو۔ سیدالانبیاء ﷺ نے فرمایا "قیامت سے پہلے یہ واقعہ ضرور ہو کر رہے گا کہ اہل روم اہل اسلام سے اعماق یا دابق (حلب کے آس پاس) جنگ نہ کر لیں (مسلم): ایک اور جگہ فرمایا "ہجرت کے بعد ہجرت ہو گی پس بہترین شخص وہ ہو گا جو اس جگہ ہجرت کر کے جائے گا جہاں حضرت ابراہیم نے ہجرت کی (یعنی شام) (ابوداؤد)۔ زمانہ آخر کی جنگوں کے دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث صحیح مسلم میں یوں ہے "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "دمشق کے مشرقی جانب سفید مینار پر حضرت عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے" پھر فرمایا "وہ دجال کو تلاش کریں گے حتی کہ باب لد پر اسے پالیں گے اور قتل کر دیں گے (ابن ماجہ)۔ احادیث کا ایک طویل باب ہے جس میں شام کی فضیلت اور اس کے لیے برکت کی دعائیں ہیں۔ یہ بابرکت سرزمین ایک بار اور شاید آخری بار ایک آخری معرکے میں داخل ہو رہی ہے۔ جو سیدنا امام مہدی کا ہیڈ کوارٹر اور ان کا مرکز خلافت ہو گا لیکن اس عظیم جنگ سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے مطابق دنیا دو خیموں میں تقسیم ہو جائے گی' ایک جانب پورا کفر اور دوسری جانب پورا ایمان یعنی نفاق نہیں ہو گا۔ تقسیم واضح ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف امریکہ' اسرائیل اور اس کے حواری اور دوسری جانب نہتے' یہ مزید واضح ہو جائے گی کہ اب وقت قریب آ پہنچا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

تاریخ کے فریب اور ہمارا نصاب

بددیانتی' جھوٹ اور مصلحت کے تحت لکھی گئی تاریخ کے بعض کردار جو ہم برصغیر میں انگریز کی آمد کے بعد سے پڑھتے آ رہے ہیں ان میں ایک نام یونان کے بادشاہ سکندر کا بھی ہے۔ سکندر ہمارے روزمرہ کے محاوروں میں شامل ہے اور ہمارے ہاں فتح اور جیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ وہ سکندر جو دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنے والے ملک یونان کا باشندہ تھا، اُس کا عظیم روپ ہمارے نصاب کی کتابوں اور تاریخ کی داستانوں میں اس طرح شامل کیا گیا کہ ایک جانب ہم بچے کے کان میں اذان دیتے ہوئے اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں تو دوسری جانب اُس بچے کا نام ایک مشرک اور بت پرست بادشاہ کے نام پر سکندر رکھ دیتے ہیں۔ سکندر جسے ہم یورپی مورخین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سکندرِ اعظم بھی کہتے ہیں' جو ہماری شاعری میں استعاروں کے طور پر جگمگاتا ہے۔ سکندری اُس بادشاہت کی علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے جس میں کوئی نقص اور عیب نہ ہو اور جس کی ہر کوئی خواہش کرے۔ اُس کے استاد ارسطو کی کہانیاں اور قصے بھی ہماری داستانوں میں ملتے ہیں۔ ہم ذہین آدمی کو اپنے ہاں کے کسی عالم کے نام سے نہیں بلکہ ''بڑا ارسطو'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ وہی ارسطو ہے جس کے بارے میں برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ اس نے اس قدر جہالت پر مبنی نظریات پیش کیے اور پھر اہلِ اقتدار سے ان کو منوایا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سائنس پانچ سو سال پہلے ترقی کے راستے پر چل پڑتی۔

اس ''عظیم'' فلسفی کے ''عظیم'' شاگرد سکندرِ اعظم کی فتوحات آپ کو دنیا کے تمام ممالک کے بچوں کے نصاب میں ملیں گی' لیکن اس کے ظلم، بربریت اور تباہی کی کہانیوں کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

اُس کا باپ فلپ مقدونیہ کا ایک شہزادہ تھا جسے یونانی جرنیل پیلوپیڈس نے گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر تھیبس بھیج دیا۔ یہاں وہ یونان کے کلچر اور آب و تاب سے بہت متاثر ہوا۔ ادھر مقدونیہ پر اُس کا بھائی الیگزنڈر تخت نشین تھا۔ اُسے قتل کیا گیا تو فلپ اپنے وطن مقدونیہ واپس آ گیا۔ اب اُسے اپنا ہی علاقہ پسماندہ لگنے لگا تھا۔ اس دوران اُس کا دوسرا بھائی پرڈکس تخت نشین ہوا لیکن تھوڑے عرصے بعد اُسے بھی قتل کر دیا گیا تو فلپ بادشاہ بن گیا۔ اس نے زندگی کا مقصد یونان پر حکومت قائم کرنا بنا لیا؛ چنانچہ ایک بہت بڑی فوج بنائی اور اردگرد کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا تاکہ یونانی رعب میں آ جائیں۔ جب ہر طرف اُس کی دھاک بیٹھ گئی تو وہ یونان فتح کرنے نکلا اور پھر تھیبس کو فتح کر لیا۔ یونانی خوف سے کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ تو ان کی تہذیب سے متاثر تھا۔ اُس نے کہا اگر وہ اعلان کر دیں کہ وہ ایک یونانی ہے تو سب آزاد۔ اب وہ یونانی تھا اور اس کا بیٹا سکندر بھی یونانی۔ 46 سال کی عمر میں فلپ قتل ہو گیا اور تاریخ کا یہ ہیرو سکندر 19 سال کی عمر میں مقدونیہ کا بادشاہ بن گیا، جس میں تھیبس بھی شامل تھا۔ بادشاہ بننے کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ تھیبس میں افواہ پھیلی کہ سکندر مر گیا ہے۔ لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔ سکندر کو اس کا علم ہوا تو فوج لے کر یونان یعنی تھیبس میں داخل ہوا۔ دیواروں پر سکندر سے آزادی کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اُس نے شہر کے تمام مکینوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور پھر نہ کوئی شیر خوار بچہ زندہ بچا نہ مرد اور عورت۔ یہ اُس ''سکندرِ اعظم'' کی جہانداری اور جہانبانی کا آغاز تھا۔ اُس کے چھ ماہ بعد وہ اپنے اردگرد بلقان کے علاقے کے پہاڑی شہروں اور قبائل پر ظلم اور بربریت کے پہاڑ توڑنے چل نکلا۔ ڈینوب دریا کے کنارے اُس کی افواج کی قتل و غارت سے لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ وہ لوگوں کے ساتھ صلح نامے دستخط کرتا اور پھر انہیں قتل کر دیتا۔ یہ دنیا کی تاریخ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے سفیروں کو قتل کرنے کا آغاز کیا۔ اب اُس کا نام ایک ظالم آندھی کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ رستے میں آنے والے بڑے بڑے شہر خود ہی اُس کے سامنے سرنگوں ہوتے گئے۔ وہ کہیں تو پورے شہر کو قتل کرنے کا حکم دیتا اور کبھی صرف خوف قائم کرنے کے لیے نوجوانوں کی گردنیں اڑا دیتا۔ ایران کی فتح کو اُس کے ماتھے کا جھومر اور سر کا تاج سمجھا جاتا ہے۔ فرات کے کنارے آباد شہر پر قبضہ ہوا تو دو ہزار شہریوں کو پھانسی پر لٹکا دیا اور زندہ بچنے والے بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ اُس پر دارا جو ایران کا بادشاہ تھا، اس نے قتل و غارت سے لوگوں کو بچانے کے لیے خط لکھا کہ میں تمہیں اپنی بیٹی کا رشتہ اور فرات کے مغرب تک کا علاقہ پیش کرتا ہوں۔ سکندر نے جواب دیا۔ تم ایک فاتح کو شرائط پیش کرتے ہو؟ میں فتح کے بعد چاہوں تو تمہاری بیٹی سے شادی کروں یا اُسے غلام بنا کر بیچ ڈالوں۔ ایران کے قدیم شہر پرسی پولس کے کھنڈرات آج بھی سکندر کی لائی ہوئی تباہی کی داستان سناتے ہیں۔ اُس نے سائرس اعظم کے خزانوں کی تلاش میں سارے گھر، عمارات اور عبادت گاہیں مسمار کر دیں۔ پورے شہر کی عورتوں کو زیورات سمیت گھروں سے نکالا اور زیورات چھین کر فروخت کر دیا۔ تمام زندہ مرد قتل کر دیئے گئے۔ شہر پر موت کا سناٹا تھا اور سکندر فتح کا جشن منا رہا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت سکندر نے ایک یونانی عورت کو مشعل پکڑ کر کہا کہ ایرانیوں کے غرور کی علامت کو آگ لگا دو۔ میں اسے ایک عورت کے ہاتھ سے جلتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تو اس کے ظلم اور بربریت کی صرف ایک جھلک ہے ورنہ بابل' مصر اور پھر افغانستان میں اُس کی لائی ہوئی تباہی کے نقوش بھی اس سے مختلف نہیں۔

اُس کے ذاتی کردار کا یہ عالم تھا کہ اس نے مدتوں شادی نہ کی اور ایک دوست ہپاسٹین کے ساتھ 19 سال تک رہتا رہا۔ جب یہ دوست بیمار ہو کر مرا تو اُس نے اُس ڈاکٹر کو پھانسی لگا دی جس نے دوست کا علاج کیا تھا۔ ایک دفعہ اپنے بھائی کلائی ٹس سے لڑائی ہوئی تو ساتھ کھڑے سپاہی سے نیزہ چھین کر اُسے قتل کر دیا۔ اس نے تین شادیاں کیں لیکن تینوں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ آتشِ انتقام کا یہ عالم کہ یوروڈائس کے دودھ پیتے بچے کو برچھی میں پرو دیا۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر اپنے قابلِ اعتماد جرنیل سیلٹس کو قتل کر دیا۔ اُس کی موت بھی کثرتِ شراب نوشی سے ہوئی۔ مرنے سے پہلے وہ پوری رات اپنے دوست میڈلیس کے ساتھ محوِ ناؤ نوش رہا اور پورا دن سوتا رہا۔ اگلی رات بھی ایسا ہی کیا اور پھر اگلے دن اٹھنے کے قابل نہ تھا۔ شراب نوشی نے اُسے مفلوج کر دیا، بخار کی شدت بڑھتی گئی اور دو دن بعد 13 سال دنیا میں ظلم و بربریت پھیلانے والا سکندر صرف 33 سال کی عمر میں چل بسا۔

امریکہ سے لے کر آسٹریلیا تک بچوں کے نصاب اٹھا لیں، ہمارے انگلش میڈیم سکولوں کی کتابیں پڑھ لیں آپ کو ''سکندرِ اعظم'' ایک عظیم فاتح کے طور پر ملے گا۔ ایک خوبصورت تصویر، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی فتوحات نے کتنے گھر اجاڑے، کتنی عصمتیں پامال کیں، کتنے شہر جلائے۔ کس قدر دہشت و بربریت تھی اس فاتح کی تیرہ سالہ جنگوں میں۔ پوری دنیا میں بددیانتی اور جھوٹ پر مبنی یہ تاریخ پڑھائی جاتی ہے لیکن کوئی نہیں چیختا۔ لیکن میرے ملک میں آپ کسی بھی مسلمان فاتح کا ذکر چھیڑ کر دیکھ لیں' تاریخ کے کچھ ''عظیم ماہرین'' اور ''عالی نسب دانشور'' اُس مسلمان حکمران کے ظلم کے قصے بیان کرنا شروع کر دیں گے۔ پورا مغرب سکندر پر فخر کرتا ہے اور ہمیں کہا جاتا ہے تمہارا ماضی تو ایک گزرا ہوا قصہ ہے اور اس میں ویسے بھی کوئی قابلِ فخر چیز نہیں۔ آگے بڑھو، دنیا کی طرح جینا سیکھو۔ سکندر بنو جس کی زندگی میں نہ انصاف کا کوئی قصہ ملتا ہے، نہ رحم دلی کا کوئی واقعہ، نہ رعایا کی فلاح کی کوئی کہانی ہے اور نہ ہی علم سے محبت کا کوئی افسانہ۔ اس کے باوجود ہماری بدقسمتی دیکھیں کہ ہمیں گورے نے اس قدر مرعوب کر دیا ہے کہ ہم مسلمان گھر میں مسلمان پیدا ہونے والے بچے کا نام بھی سکندر رکھتے ہیں جس کا اسلام سے دور دور، کا بھی واسطہ نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

تحریکیں زور کیسے پکڑتی ہیں

دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جس میں مختلف اوقات پر زوردار تحریکیں نہ چلی ہوں اور انہوں نے حالات کا رخ نہ بدلا ہو۔ ہر ملک کے عوام کے مزاج، ماحول اور اقتدار کی مسند پر متمکن حکمرانوں کے رویے کے ردعمل کے نتیجے میں تحریکیوں کا مزاج بھی بدلتا رہا ہے۔ لیکن آج یہ تصور بہت زور شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ تحریکیں، انقلاب اور انارکی صرف اور صرف ڈکٹیٹر شپ میں جنم لیتی ہیں اور کسی بھی ملک میں اگر جمہوری طور پر الیکشن ہوتے رہیں، نظام کا ایک تسلسل قائم رہے تو یہ ملک کو پرامن رکھنے اور فساد سے پاک بنانے کی ضمانت ہوتا ہے۔ جمہوری حکمرانوں کا رویہ، مزاج اور طرز حکومت جیسا بھی ہو، لوگ ان کے خلاف بغاوت کیلئے آمادہ نہیں ہوتے، وہاں کوئی تحریک منظم نہیں ہو پاتی، ان ملکوں میں عوامی غیظ و غضب کسی تبدیلی یا انقلاب کا ذریعہ نہیں بنتا۔ اس تجزیے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تاریخی طور پر دنیا میں امن اسی وقت قائم ہوا، انسان نے سکون اور اطمینان کی شکل صرف اسی دور میں دیکھی جب دنیا نے حکمرانی کیلئے جمہوریت کا راستہ اختیار کیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس دنیا میں چین تھا نہ اطمینان، بس ایک غلامانہ زندگی تھی۔ یہ دنیا ہزاروں سال سے آباد ہے اور اس کی معلوم تاریخ پانچ ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس میں جمہوریت اور عوام کی حکمرانی کے تصور کی عمر صرف دو سو سال کے لگ بھگ بنتی ہے۔ ان دو سو سالوں میں پہلے سو سال تو جمہوریت نام کی چڑیا کے ابھی پر بھی نہیں نکلے تھے۔ جہاں تک ایک شخص ایک ووٹ کا تصور ہے اس کی تاریخ بھی اتنی پرانی نہیں ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق 1920ء کے لگ بھگ ملنا شروع ہوا اور سوئٹزرلینڈ میں تو خواتین کو ووٹ دینے کا اختیار 1973ء میں ملا۔ یعنی اس معاملے میں پاکستان ان سے تین سال آگے تھا۔ ہم 1970ء میں ایک فرد ایک ووٹ کے تصور پر عمل کرتے ہوئے الیکشن کروا کر 1971ء میں اپنا آدھا ملک گنوا بیٹھے تھے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بادشاہوں اور آمروں کے زمانے میں بھی لوگ چین کی بنسی بجاتے رہے اور جمہوری طور پر منتخب حکمرانوں کے زمانے میں بھی تحریکیں جنم لیتی رہیں، تبدیلیاں آتی رہیں، بحران کی کیفیت اور انارکی پھیلتی رہی۔ دنیا کی سب سے قدیم جمہوریت برطانیہ میں ایک ایسی تحریک چلی تھی جس کے نتیجے میں لوگوں نے ایک عوامی عدالت لگائی اور 30 جنوری 1649ء میں اپنے بادشاہ چارلس اول کا سر گیلوٹین کے تیز دھار چھرے سے کاٹ دیا۔ اس وقت برطانیہ میں الیکشن بھی ہوتے تھے اور پارلیمنٹ بھی موجود تھی۔ اس کے برعکس اسی دور میں دنیا کے اکثر ممالک بادشاہتوں کے زیر اثر تھے مگر وہاں چند ایک ممالک کو چھوڑ کر کہیں کوئی بدامنی، انارکی یا تحریکی صورت حال نظر نہیں آتی۔

دنیا بھر کی لائبریریوں میں ایسی ہزاروں کتابیں اور لاکھوں تحقیقیں موجود ہیں جو کسی علاقے، ملک یا قوم میں تحریکوں کے پس منظر سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ان سب میں ایک بات پر اتفاق پایا جاتا ہے اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو تحریکیوں کے جنم لینے کی اصل وجہ بنتا ہے۔ اس نکتے کو دنیا میں کہانی کہنے، سنانے اور لکھنے والوں نے کس خوبصورتی سے چند لائنوں میں سمیٹا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کی کہانی اٹھالیں‘ اس میں اس طرح کے فقرے مشترک ملیں گے ”ایک تھا بادشاہ، اس کے دور میں رعایا خوشحال، شہر پرامن اور حالات پرسکون تھے، اس لیے کہ وہ اس قدر منصف مزاج تھا کہ اس کے دور میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے“ جب کہ اس کے برعکس کسی ظالم بادشاہ کو اس طرح بیان کریں گے کہ ”بادشاہ ظالم تھا اس کے دور میں انصاف نام کو بھی نہ تھا۔ اس کے اہل کار لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے اور لوگوں کی زندگی عذاب تھی“۔ پرسکون اور مطمئن رعایا ایک ایسا میدانی دریا ہوتی ہے جو انتہائی اطمینان کے ساتھ زمین کے سینے پر اپنا سفر جاری رکھتی ہے جبکہ ایک غیر مطمئن اور ظلم سے تنگ عوام کا حال پہاڑی ندی نالوں کی طرح ہوتا ہے جو ہر پتھر سے سر ٹکراتا، شور مچاتا بہتا چلا جاتا ہے۔ تحریکوں اور انارکی کے بڑے بڑے تجزیہ کار اور مفکر کسی ایسے معاشرے کی مثال ایک آتش فشاں کی طرح ہیں جس کے اندر لاوا جوش مار رہا ہوتا ہے لیکن اس کے دہانے پر موت کا سا سکوت ہوتا ہے۔ دوسری مثال وہ Tipping پوائنٹ کی دیتے ہیں جسے ایک گدھے سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ آپ اس پر لکڑیاں لادتے جاتے ہیں۔ وہ برداشت کرتا رہتا ہے، کئی من لکڑیوں کے باوجود بھی وہ کھڑا رہتا ہے لیکن پھر اچانک ایک لکڑی آپ رکھتے ہیں تو وہ ہر بڑا کر بوجھ نیچے گرا دیتا ہے۔ ہر وہ معاشرہ جس میں لوگ مر مر کر زندگی گزار رہے ہوں، انہیں ضروریات زندگی تک میسر نہ ہوں، ان پر انصاف کے دروازے بند کر دیے جائیں، چند گروہ ان کو لاٹھیوں سے ہانکتے رہیں تو اس معاشرے میں کسی بھی تحریک کا مواد اور میٹریل کثرت سے موجود ہوتا ہے۔ یہ وہ غم و غصہ ہوتا ہے جس کا اظہار لوگ گھروں، دفتروں اور نجی محفلوں میں کرتے ہیں لیکن انہیں سمجھ نہیں آتی کہ ان کا یہ غصہ اور غضب کیسے حکمرانوں تک پہنچے۔ کبھی بجلی، پانی یا گیس بند ہونے پر سڑک پر نکل آتے ہیں، کبھی اپنے بے گناہ مقتول کی لاش اٹھا کر کسی ایوان کے سامنے دھرنا دیتے ہیں اور کبھی ناانصافی کے خلاف کسی پریس کلب یا شارع عام پر پلے کارڈ لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک عادل اور منصف مزاج حکمران جسے سیاسی بصیرت بھی حاصل ہو وہ فوری طور پر اس غم و غصہ کے ازالے کی طرف توجہ دیتا ہے تاکہ اس غبارے میں ہوا نہ بھرنے پائے جبکہ سیاسی بصیرت سے عاری حکمران بہانہ بازیوں سے ٹالتا رہتا ہے‘ ان سب کو سازشی عناصر قرار دیتا ہے اور جمہوریت نے تو ان کو ایک اور لفظ سکھا دیا ہے کہ ”یہ سسٹم کو پٹڑی سے اکھاڑنے کی کوشش ہو رہی ہے“۔ صدیوں سے لوگوں پر حکمران رہنے والے بادشاہ اور بدترین آمر بھی اس حقیقت کو جانتے تھے کہ ایک غیر مطمئن رعایا پر حکومت نہیں کی جا سکتی‘ وہ ہر حال میں اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے کیونکہ انہیں دوسرے بادشاہ کے حملے کا خوف ہوتا تھا کہ اگر ایسے وقت میں قوم ان کے ساتھ نہ ہوئی تو شکست یقینی ہے۔ آمروں اور ڈکٹیٹروں کو بھی اس کا ادراک ہوتا ہے اور جس کو نہیں ہوتا وہ عبرت کی مثال بن جاتا ہے۔ جب انقلاب فرانس آیا تو انگلستان کی معاشی غربت فرانس سے بدتر تھی۔ لوگ غربت کا شکار تھے لیکن وہاں فرانس کی طرح کوئی یہ کہہ کر تمسخر اڑانے والا نہیں تھا کہ ”اگر روٹی نہیں ملتی تو کیک کیوں نہیں کھاتے‘ یا پھر گھاس بہت ہے جاؤ اور کھاؤ“ تاریخ بتاتی ہے کہ جس نے یہ کہا تھا‘ لوگوں نے پہلے اس کے منہ میں گھاس بھری اور پھر اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔ یہی فضا ہوتی ہے جس میں کوئی بھی نعرہ‘ کوئی بھی آواز جو حکمرانوں کے خلاف بلند ہوتی ہے وہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ لیتی ہے۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کونسا نعرہ بلند ہو رہا ہے یا کون اس کی قیادت کر رہا ہے۔ وہ تو اپنا اپنا غصہ اور اپنی اپنی نفرت لے کر ساتھ چل پڑتے ہیں۔ کسی کو پولیس نے تنگ کیا ہوتا ہے‘ کسی کی زمین پٹواری نے ہضم کی ہوتی ہے‘ کسی کو میرٹ سے انکار پر نوکری نہیں ملی ہوتی‘ کوئی سیاسی گروہوں کے ظلم سے تنگ ہوتا ہے‘ کسی کے باپ یا بیٹے نے خودکشی کی ہوتی اور کوئی رات بھر بھوک‘ بیماری اور لوڈشیڈنگ کے عذاب سے لڑ کر آیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہر اس گروہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جو حکومت اور سرکار کے مقابل آ کر کھڑا ہو جائے۔ انہیں نہ جمہوریت کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی شریعت کا‘ وہ نہ مزدور کے حقوق کے لئے کمیونزم چاہتے اور نہ ہی شفاف انتخابات‘ ان کا غصہ اجتماعی نفسیات بن جاتا ہے۔ قوموں کی یہ اجتماعی نفسیات آج دنیا کے ماہرین کا سب سے بڑا موضوع ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قومی غصے کی اجتماعی نفسیات حکمرانوں کے زوال کا باعث اس وقت بنتی ہے جب وہ ریاستی طاقت سے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پہاڑی ندی نالے کی طرح شور مچاتے عوام حکومتی طاقت سے سر ٹکراتے ہیں اور پھر یوں بپھرتے ہیں کہ دامن میں آباد ہر بستی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے ہیں۔ دانا لوگ ان شوریدہ سر نالوں پر بند نہیں باندھتے‘ گزرنے دیتے ہیں لیکن نادان اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے خود کو بدترین انجام تک لے جاتے ہیں۔

نوٹ: موصوف کالم نگار کے میرے ذات کے بارے میں سوالات کا میں جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن انہوں نے پھر معاملہ چھیڑا ہے اور اب چونکہ معاملہ سود کا ہے اس لئے عرض کردوں کہ سود جی پی فنڈ پر ملتا ہے اور میں نے آج سے 25 سال قبل لکھ کر دے دیا تھا کہ میرے جی پی فنڈ پر سود نہ ڈالا جائے۔ اب مجھے ریٹائرمنٹ پر مبلغ آٹھ لاکھ روپے ملیں گے لیکن اگر سود لیتا تو 39 لاکھ کے قریب ملتے۔ میرا ریکارڈ اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اس کارساز کمپنی کا تعلق ہے وہ جاپان کی ایک غیر مسلم کمپنی ہے جسے سود کی حرمت کی کسوٹی پر رکھ کر نہیں رکھا جاتا۔ میں نے مثال یہ دی تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی کارساز کمپنی نے یہ ثابت کر دیا کہ بینکاری سود کے بغیر پچاس سال سے ایک کمپنی چلائی جا سکتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے سود کے دفاع کرنے والوں کی بھی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انہیں اگر اللہ کے بتائے گئے اصولوں پر کامیابی نظر آ جائے تو ان کے دل جل اٹھتے ہیں۔ وہ پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ کہیں سے کوئی برائی نکالو تاکہ اللہ کے بتائے اس اصول کا تمسخر اڑایا جا سکے۔ اللہ انہیں خیر دیکھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

KitaabPoint.blogspot.com

علمائے امت اور غزہ کے مسلمان

کسی بھی تجزیہ نگار' دانشور' سیاست دان یہاں تک کہ اس امت کے علماء تک کی گفتگو' تحریر یا تقریر ملاحظہ کریں جو ان دنوں فلسطین کے مسلمانوں پر اسرائیلی ظلم و تشدد اور بربریت کے جواب میں کی یا لکھی گئی ہو تو اس میں آپ کو ایک نکتہ مشترک ملے گا۔ "ہم عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہیں"۔ چوراہوں' سڑکوں' پریس کلبوں اور عالمی دفاتر کے سامنے پلے کارڈ اٹھائے' نعرے لگاتے اور موم بتیاں جلاتے لوگ نظر آئیں گے۔ یہ سب اس بات پر کسقدر مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ ہم نے اپنا حصہ ڈال دیا۔ اب ہم دن بھر شاپنگ کریں' عیش و عشرت میں گم رہیں اور پھر رات کو مزے کی نیند سو جائیں' ہم مطمئن ہیں۔ یہ عالمی ضمیر ہے کیا چیز۔ کیا گزشتہ پندرہ سالوں میں ہر بڑے چھوٹے' بوڑھے جوان نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا؟ گیارہ ستمبر کے بعد اسی عالمی ضمیر نے نیویارک میں اکٹھے ہو کر چالیس سے زیادہ ممالک کو یہ اختیار دیا تھا کہ ایک ایسے ملک پر ٹوٹ پڑیں جو وسائل کے اعتبار سے دنیا بھر میں سب سے کمزور ہے۔ اس کے پاس نہ رسد و رسائل کے ذرائع تھے اور نہ ٹیکنالوجی۔ لیکن اس کے باوجود بھی پہاڑوں' جنگلوں اور بیابانوں میں آباد ان چرواہوں اور کسانوں کو انسانیت کا سب سے خطرناک دشمن قرار دیا گیا۔ دنیا کے یہ اڑتالیس غنڈے اس ملک پر چڑھ دوڑے۔ اس عالمی ضمیر کا نمائندہ پاکستانی وفد جب ملا محمد عمر کے پاس گیا تو اس نے اور بہت سی باتوں کے علاوہ ایک بات ایسی کی جواب سچ ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے کہا تھا "دیکھو یہ باری کی بات ہے' ہماری باری پہلے آگئی ہے' کل تمہاری بھی آجائے گی۔ ہمیں خاک ہونے کا ڈر نہیں کہ ہم مٹی کے گھر میں رہتے ہیں' مٹی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور اس بات پر ہمارا ایمان ہے کہ ہم نے مٹی میں چلے جانا ہے۔ ان لوگوں کا کیا ہو گا جنہوں نے آسمان سے چھوتی عمارتیں تعمیر کر لی ہیں۔ آسائش کی زندگی اور تعیش کا سامان جمع کر لیا ہے۔ اللہ کا واسطہ باریاں مت لگاؤ"۔ لیکن ہم سب نے اسی عالمی ضمیر کا ساتھ دیا۔ وہ سب جو آج غزہ کے ظلم پر چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ کوئی پڑوسی ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ انہوں نے اس عالمی ضمیر کا ساتھ دینے کیلئے اپنی سرزمین استعمال کرنے دی۔ میرے ملک سے امریکی طیارے ستاون ہزار دفعہ اڑے اور انہوں نے اسی طرح افغان مسلمانوں کے جسموں کے پرخچے اڑائے جس طرح آج غزہ میں اسرائیل کر رہا ہے۔ ایران نے نہ صرف بدترین خاموشی دکھائی بلکہ اس کے پاسداران کے سربراہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر امریکی حملے کے دوران ہمارے جوان شمالی اتحاد کے ساتھ شانہ بشانہ نہ لڑ رہے ہوتے تو یہ فتح ممکن نہ تھی۔ تاجکستان نے کابل کی طرف پیش قدمی کا راستہ دیا۔ عالمی ضمیر مطمئن ہو گیا۔ دنیا کے امن کیلئے سب سے بڑا خطرہ افغانستان فتح کر لیا گیا۔ کیا اس کے بعد کسی اور کی باری نہیں آئی۔ شاید ہم بھول گئے۔ اس کے بعد عراق تھا۔ اس کیلئے تو کسی نے نیویارک میں موجود عالمی ضمیر کی علامت اقوام متحدہ سے اجازت لینے کی ضرورت تک محسوس نہ کی۔ امریکہ اور اس کے اتحادی اپنی فوجی قوت اور میڈیا کے پراپیگنڈے کے زور پر عراق میں داخل ہوئے۔ کونسا پڑوسی تھا جس نے اس ظلم پر احتجاج کیا۔ سب نے اس عالمی ضمیر کے سامنے سر جھکائے بلکہ سجدہ ہائے تعظیمی کئے۔ شام' اردن' کویت' قطر' سعودی عرب اور ایران سب کے سب کئی سال عراق کے نہتے اور مظلوم انسانوں کے قتل عام کا تماشہ دیکھتے رہے۔ معاملہ یہاں تک رہتا تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ ان کا ضمیر اس عالمی ضمیر نے خرید لیا ہے لیکن پھر ان دونوں ملکوں میں جب ان عالمی غنڈوں نے اپنی مرضی کے آئین تحریر کیے، اپنی نگرانی میں الیکشن کروائے اور اپنی کاسہ لیس حکومتیں قائم کیں تو ان تمام ممالک نے ان دونوں حکومتوں کو نہ صرف جائز تسلیم کیا بلکہ ان کے ہر ظلم پر بدترین خاموشی اختیار کی۔ یہ حکومتیں شہروں کے شہر اجاڑتی رہیں، لوگوں کو دہشت گرد، القاعدہ اور باغی کہہ کر قتل کرتی رہیں اور ان کے حکمرانوں کا تمام پڑوسی ملک اپنے ایوانوں میں استقبال کرتے رہے۔ وہ جن کے ہاتھ معصوم مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے، وہ ریاض، تہران، اسلام آباد اور دمشق جیسے شہروں میں باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کرتے اور مشترکہ اعلامیہ جاری کرتے۔ اس سب کو میڈیا نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کی کامیابی قرار دیا۔ جان پ لیجر JonPlijer کی وہ مشہور ڈاکومنٹری "youhavenotseen war" (جنگ جو آپ نے دیکھی نہیں) ایسے تمام چہروں کو بے نقاب کرتی ہے جو اس عالمی ضمیر اور عالمی پراپیگنڈے کے سامنے سربسجود تھے۔ مسلمانوں نے اپنے گزشتہ دس سالوں میں اس عالمی ضمیر کو ایک نکتہ سمجھا دیا کہ ہم بے حس ہیں، بے ضمیر ہیں اور تم جس کو بھی دہشت گرد اور انسانیت کیلئے خطرہ تصور کر کے انکے گھربار، خاندان اور آبادی سب کو تباہ کر دو، ہم خاموش رہیں گے۔ یہی وہ الفاظ ہیں جو آج اسرائیل اور اس کے حواری بول رہے ہیں۔ لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ ہم عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کیلئے ریلیاں نکالتے ہیں، پلے کارڈ اٹھاتے ہیں، یوم القدس مناتے ہیں، دنیا بھر کے ہر فرقے کے علماء اس عالمی ضمیر سے فیصلہ کروانے سڑکوں پر نکلتے تھے۔ کیا انہوں نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی تھی "اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لائے جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا، لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ اپنا معاملہ فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا کھل کر انکار کریں" (النسا 60)۔ تجزیہ نگار، دانشور، سیاست دان یہاں تک وہ علمائے کرام جنہوں نے اس آیت کو بار بار پڑھا ہو گا، اللہ کے اس حکم کو لوگوں کو سنایا ہو گا وہ بھی اپنا معاملہ اور اپنا فیصلہ طاغوت سے کروانا چاہتے ہیں اور کس قدر بھولے ہیں کہ یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو گا۔ کیا یہ سب نہیں جانتے کہ یہ دور فتن ہے۔ کیا ان سب نے احادیث کی کتب میں فتن کے ابواب اور ان میں درج احادیث نہیں دیکھیں۔ لیکن کسقدر بدقسمتی ہے کہ اس امت کے حکمران اور ان کے مسلکی علماء عراق اور شام میں ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے تلواریں نکالتے ہیں، جیش تیار کرتے ہیں، کوئی ایک حکومت کو بچانے کیلئے فتویٰ دیتا ہے تو دوسرا اس کو گرانے کیلئے۔ کسی کو اینٹوں اور سنگ مرمر کے مزارات کے تحفظ کے لیے جان دینی عزیز ہے تو دوسرے کو ان مزارات کو گرا کر اپنے جہاد کا جھنڈا بلند کرنا ہے۔ لیکن کیا ان ستاون اسلامی ممالک میں کسی ایک کے علماء میں یکسوئی نہیں کہ وہ اعلان کریں کہ نہتے فلسطینیوں کے ساتھ مل کر لڑنا فرض عین ہے۔ اس امت کی پچاس لاکھ سے زیادہ افواج ہیں، جو کیل کانٹے اور ایٹم بم سے لیس ہیں، کیا یہ ساری طاقت جو انہیں اللہ نے عطا کی ہے وہ قیامت کے دن ان سے حساب نہیں لے گا کہ تم نے اس امت کے مظلوم مسلمانوں کو ظلم سے نجات کے لیے صرف کی یا نہیں کی۔ جو جتنے بڑے منصب پر ہو گا اس کی اتنی ہی بڑی جواب دہی ہو گی۔ لیکن سب جانب خاموشی ہے، سکوت ہے، پلے کارڈ ہیں، بینرز ہیں، تبصرے ہیں، شاید یہی وہ زمانہ تھا جس کے بارے میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب ان میں پڑھے لکھے لوگ بھی یہ کہیں گے کہ یہ جہاد کا دور نہیں ہے۔ لہٰذا ایسا دور جن کو ملے وہ جہاد کا بہترین زمانہ ہو گا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کیا کوئی مسلمان ایسا کہہ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! جن پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت ہو گی (السنن الواردۃ فی الفتن)

کیا ستاون اسلامی ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا ہے کہ جو اسلامی ممالک کو دعوت دے کہ آؤ اپنے فیصلے طاغوت سے نہیں خود کریں، خود اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کریں۔ کیا ہمارے تمام مسالک کے علمائے امت سب کو اس ایک نکتے پر جمع کر سکتے ہیں اس کا علاج ریلیاں نہیں جہاد ہے لیکن اس ایک لفظ جہاد کو منہ سے نکالنے پر ہمیں جس قدر شرمندگی ہوتی ہے، شاید اس سے کئی گناہ زیادہ ہمیں روز قیامت شرمندگی ہو گی۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

عالم بالا میں آج اقبال کس قدر سکھ کا سانس لے رہے ہوں گے کہ وہ 2014ء میں پاکستان میں موجود نہیں تھے۔ ورنہ ان کی اس نظم پر ان پر امن عامہ خراب کرنے، لوگوں کو جلاؤ گھیراؤ پر اکسانے اور منتخب جمہوری حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزامات کے تحت دہشت گردی کی دفعات کے تحت مقدمہ درج ہو چکا ہوتا۔ وزراء پریس کانفرنسیں کرتے۔ تجزیہ نگار اور اینکر پرسن رات گئے ٹیلی ویژن سکرینوں پر بیٹھے تبصرے کرتے، اس ملک میں جو غم و غصہ ہے، نفرت ہے، حکومت کے خلاف جو ہنگامے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم لکھ کر لوگوں کو اکسایا ہے۔ ایف آئی آر میں یہ اشعار تو خاص طور پر درج کیے جاتے۔

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگادو

کاخِ امراء کے درو دیوار ہلادو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

دنیا بھر کا مزاحمتی ادب اسی غم و غصے سے بھرا ہوا ہے اور یہ وہ ادب ہے جو دنیا بھر میں تبدیلی اور انقلاب کا راستہ متعین کرتا ہے۔ دنیا کا ہر شعلہ بیان مقرر اسی لہجے میں گفتگو کرتا ہے جو لہجہ لوگوں کے دلوں کی آواز ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کی زندگی عیش و آرام اور سکون و اطمینان سے گزر رہی ہو تو انہیں دھیمے لہجے اور ہنس مکھ باتیں کرنے والے پسند آتے ہیں۔ لیکن اگر لوگوں کے دلوں میں اپنی محرومیوں کی وجہ سے نفرتوں کے طوفان ابل رہے ہوں تو پھر وہی مقرر زیادہ مقبول ہوتا ہے جس کا لہجہ تلخ اور زور بیان شعلے اگل رہا ہو۔ وہی تقریر اور شاعری عوامی پذیرائی حاصل کرتی ہے جو لوگوں کے جذبات کی عکاس ہو۔ صاحبانِ اقتدار ایسے شاعر اور ایسے مقرر سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور اسی کو اپنی بادشاہت کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں، جس کے لہجے کی گونج لوگوں کو اپنی آواز محسوس ہو اور جو ان کی نفرتوں کو اپنے شعروں اور تقریر کے لہجے میں سمو دے۔ میر تقی میر سے لے کر آج کے دور تک شاعری کے محاسن اور شعری تنوع کے لحاظ سے اگر اردو شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے تو نق آد اور شعری ذوق رکھنے والے حبیب جالب کا ذکر تک نہیں کرتے، لیکن جالب کی پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ وہ عام انسانوں کا مقبول ترین شاعر ہے۔ جب وہ اپنی خوبصورت آواز میں یہ اشعار پڑھتا تو لوگ جھوم اٹھتے۔

کھیت وڈیروں سے لے لو۔ ملیں لیٹروں سے لے لو

ملک اندھیروں سے لے لو۔ رہے نہ کوئی عالی جاہ

پاکستان کا مطلب کیا۔ لاالٰہ الااللہ

جالب تو خود ایک سیاسی جدوجہد کا نقیب بھی تھا۔ ایوب خان کے خلاف مادرِ ملت کا پرچم بردار "ایسے دستور کو، صبح بے نور کو، میں نہیں مانتا، میں نے جانتا" گاتا ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری آمریت کے تشدد کے خلاف "لاڑکانے چلو، ورنہ تھانے چلو" پڑھتا ہوا، اور ضیاء الحق کے مارشل لاء کے سامنے "ظلمت کو ضیاء کیا کہنا" لہک لہک کر گاتا ہوا۔ اس کے دور میں کئی شاعر ادیب زندہ تھے اور خوبصورت شاعری بھی کرتے تھے، لیکن جیل کی سلاخیں اور پولیس کی لاٹھیاں صرف اور صرف حبیب جالب کا مقدر بنیں۔ اس لیے کہ حکمران طبقوں کو خوب اندازہ ہوتا ہے کہ کون سی آواز ان کے لیے خطرہ ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی 1970ء کی کسان کانفرنس میں عبدالحمید بھاشانی کی صدارت میں جب فیض احمد فیض نے یہ اشعار پڑھے تو حکومت کے ایوانوں میں ہنگامہ صرف انہی اشعار پر برپا ہوا۔ حکمرانوں کا غصہ کسی دوسرے مقرر کی تقریر پر نہ نکلا بلکہ فیض احمد فیض مطعون ٹھہرے

ہر اک اولی الامر کو صدا دو۔ کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

اٹھے گا جب جامِ سرفروشاں۔ پڑیں گے دارو رسن کے لالے

کوئی نہیں ہوگا کہ جو بچالے، جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی

یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر، یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

اور پھر اس شعر نے تو وہاں آگ لگادی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ شعر ایسا سمایا کہ اس کے بعد آنے والے سالوں میں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔

اے خاکِ نشینوں اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

سارے حکمران ایک کمزور سے شاعر یا ایک عام سے مقرر سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والا، بے سروسامان شاعر لاکھوں لوگوں کو آگ لگانے، جلانے، گھیراؤ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ کیا ایک شعلہ بیان مقرر لوگوں کو کسی ہنگامہ آرائی پر اکسا سکتا ہے؟ یہ ہے وہ بنیادی سوال جو آج تک کسی صاحبِ اقتدار کی عقل میں نہیں آیا۔ لوگوں کو اگر کسی ہسپتال سے فائدہ پہنچتا ہو، بیماروں کو وہاں سے شفا میسر ہو تو وہ اسے آگ نہیں لگائیں گے، بلکہ آگ لگانے والوں کو بھی روکیں گے۔ جس تھانے، کچہری اور سرکاری دفتر سے لوگ روز دھتکارے جاتے ہوں، انہیں دھکے اور ٹھڈے پڑتے ہوں، جہاں ٹاؤٹ اور رشوت خور ان کی جیبوں سے جمع پونجی تک نکال لیتے ہوں۔ تو ایسے میں ان لوگوں کے دلوں میں ایک ہی خواہش آگ بن کر کھول رہی ہوتی ہے کہ کوئی اس دفتر کو آگ لگادے جہاں روز میرے جیسے عام آدمی کی تذلیل ہوتی ہے۔ اس کی نفرت جب کسی شاعر کی زبان میں ڈھلتی ہے یا کسی مقرر کے لہجے میں گونجتی ہے تو پھر اس جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں بھوکے، ننگے اور اس ظالمانہ نظام تلے کچلے ہوئے لوگ ایک ایسا ہجوم بن جاتے ہیں ایسا ہجوم جس نے تاریخ میں ایسے ایسے طوفان اٹھائے ہیں کہ لکھتے ہوئے قلم کانپ اٹھتا ہے۔ کیا صرف روسو اور والٹیئر کی تحریروں نے وہاں لاکھوں لوگوں کے گلے کٹوائے تھے؟ ہرگز نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غربت و افلاس اور بے روزگاری نے لوگوں کے ہاتھ میں وہ تیز دھار چھرے پکڑا دیئے تھے جن کو چلانے والے ہاتھ غصے اور نفرت سے ابل رہے تھے۔ شاعر اور ادیب لوگ تو بس ان جذبوں کی زبان بن جایا کرتے ہیں اور حکمرانوں کو صرف انہی کی زبانیں خاموش کرنے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ یہی تصور کر لیتے ہیں کہ اگر یہ زبان خاموش ہو گئی تو سب جگہ چین ہو جائے گا۔

گزشتہ دنوں فیروز پور روڈ لاہور کی ٹریڈ ایسوسی ایشن کے ایک اخباری اشتہار نے مجھے چونکا دیا۔ شیخ رشید کے "نکلو، مرو، مارو، جلاؤ گھیراؤ" کے الفاظ کے جواب میں چھپا تھا، پاکستان کے تاجر، صنعت کار، پاکستان کے دشمنوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں گے" کاش یہ سب عالی دماغ لوگ تاریخ پڑھ لیتے یا پھر وقت کی نبض ہی دیکھ لیتے۔ کیا کبھی تاریخ میں ستائے ہوئے عوام کے سامنے ستانے والوں کا اتحاد بھی کامیاب ہوا ہے۔ لوگوں کے ہجوم کے سامنے یہ سب خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں تاجر، صنعت کار یا سرمایہ دار طبقات ہمیشہ ریاست کی طاقت اور پالتو غنڈوں کے ذریعے اپنی لوٹ مار سے بنائی ہوئی دولت کا تحفظ کرتے رہے ہیں۔ لوگ اس ہسپتال، سکول، سرکاری دفتر، مل اور کارخانے کی حفاظت کرتے ہیں جو ان کے دکھوں کا مداوا ہو، جہاں ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور جو انہیں زندگی کی سہولیات مہیا کرتا ہو۔ ماہرین عمرانیات کہتے ہیں کہ ریاست سے محبت اس کے روّیے سے پیدا ہوتی ہے۔ تین اہم کام ہیں جو ریاست کرے تو اس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ بیروزگار ہوں تو روزگار فراہم کرے، ظلم ہو تو انصاف فراہم کرے اور بیمار ہوں تو علاج کروائے۔ لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ آپ بے روزگار ہوں اور اگر گھر والے مدد کو موجود نہ ہوں تو آپ خودکشی کر سکتے ہیں، آپ کا رشتے دار قتل ہو جائے تو تھانے میں الٹا آپ پر کیس بن جاتا ہے، چار بھائی ہوں تو بدلہ لے لیں گے، آپ بیمار ہوں تو گھر والوں کے پاس علاج کے پیسے ہیں تو ٹھیک ورنہ آپ اپنے پیاروں کی لاش ہسپتال سے لائیں گے۔ ایسے میں لوگوں کی محبتیں ریاست کی بجائے گھر کی جانب منتقل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مصیبت میں آپ کے کام گھر آتا ہے حکومت نہیں۔ ایسے میں لوگ مین ہول کا ڈھکن، سٹریٹ لائٹ کا لیمپ یا دفتر کی سٹیشنری چرا کر گھر لاتے ہیں کہ کل اس گھر نے ہی تو انکا ساتھ دینا ہے دوسری جانب حکومت و ریاست کا ہر ادارہ لوگوں کی نفرت، غصے اور ہیجان کا نشانہ بن جاتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

وہ میرا یار

عطاء الحق قاسمی صاحب سے میرا تعلق، دوستی اور محبت کا رشتہ چالیس سال سے بھی پرانا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ میں نے صاحب کا لفظ حفظ مراتب یا احترام کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی اور ان کی عمر میں پورے تیرہ سال کے فرق کی وجہ سے لگایا ہے۔ اس لئے کہ اس ساٹھ سالہ زندگی میں وقت نے تھپیڑے مار مار کے ایک حقیقت سے آشنا ضرور کیا ہے کہ "بزرگی بہ عقل" نہیں ہوتی بلکہ عقل مندی الٹا ذلت و رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ اب رہ گئی "بزرگی بہ سال"، تو کوشش کرتا ہوں کہ اپنے بڑوں کو عزت دوں کہ کل میں نے بھی بوڑھا ہونا ہے، ورنہ عطاء الحق قاسمی کے تعلق کے چالیس سال جس بے تکلفی، یارانہ پن اور پھکڑ گفتگو سے بھرپور ہیں اگر اس کا علم دنیا والوں کو ہو جائے تو عطاء الحق قاسمی تو شاید بچ نکلے، میں واجب القتل ہو جاؤں گا۔

عطاء الحق قاسمی سے میرے تین رشتے علاقائی نوعیت کے ہیں اور دنیا میں علاقے اور نسل کا تعصب سب سے گہرا ہوتا ہے۔ میرے دادا مولوی خدا بخش مرحوم 1908ء تک اسی مسجد خیر دین امرتسر کے خطیب رہے ہیں جس کی خطابت کی کرسی پر قاسمی صاحب کے والد مولانا بہاؤ الحق قاسمی متمکن رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ میرے دادا اور نہ ہی عطاء الحق قاسمی کے والد عالم بالا میں ہماری کرتوتوں سے خوش ہو رہے ہونگے۔ یہ تو وہ رپورٹس ہیں جو فرشتے ان تک روزانہ پہنچاتے ہیں ورنہ اگر ہم نے ایک دوسرے کی شکایتیں اپنے مرحوم بزرگوں تک پہنچانا شروع کر دیں تو بیشک ہم اپنی حرکتوں میں ایک لفظ بھی مبالغہ نہ کریں ہمیں ننگ اسلاف کا تمغۂ حسن کارکردگی ضرور مل سکتا ہے۔ دوسرا رشتہ یہ کہ عطاء کے آباؤ اجداد بھی کشمیر کی وادیوں سے اتر کر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے جبکہ میرے اجداد تو مسلسل اپنے مرشدوں کے حکم پر دعوتِ دین کی خاطر مختلف علاقوں کی خاک چھانتے کشمیر میں آکر آباد ہو گئے اور پھر ان کے روحانی پیشواؤں نے انہیں میدانوں کا رخ کرنے کو کہا اور وہ بھی کشمیر سے براستہ سیالکوٹ، مکیریاں، امرتسر میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ عطاء الحق قاسمی ابھی تک نون لیگ کے مقبوضہ کشمیر میں رہائش پذیر ہے اور مجھے وزیرستان کے قبائلیوں کی صحبت میں آزاد کر دیا ہے۔ تیسری نسبت امرتسر ہے جسے ہم دونوں کے گھر والے امبر سر کہتے تھے۔ امبر سر ایسا شہر تھا جس کا طلسم میں نے اپنے گھر میں مدتوں دیکھا ہے۔ ہر کوئی اس جادو میں گرفتار۔ طلسم ہوشربا کی طرح ہمارے گھر میں اس شہر کی داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ میرے والد تو گجرات سے لاہور آتے تو مجھے کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھلاتے جس پر امرتسری دال چاول یا امرتسری ہریسہ لکھا ہوتا۔

یوں تو یہ تین تعلق ہی کسی شخص سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لئے کافی ہیں بلکہ آج کے دور میں تو "کشمیر" کا تعلق ہی اتنا مضبوط ہے کہ باقی کسی بھی رشتے کا ذکر کرنا کفران نعمت بلکہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دنوں کشمیریوں کے چراغ رخ زیبا بھی گلی گلی عشاق کی تلاش میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ لیکن میرے ان رشتوں کا ذکر تک بھی کبھی میری اور عطاء الحق قاسمی کی دوستی کے چالیس سالوں میں نہیں آیا۔ مجھے تو اس دوستی کا وہ پہلا دن بھی یاد ہے جب 1972ء میں گجرات کے حلقۂ ارباب ذوق کے تحت عطاء الحق قاسمی کے ساتھ شام منانے کا اہتمام کیا گیا تو لاہور سے سواریوں والی بس میں ایک قافلہ گجرات آیا جس کی سرکردگی احمد ندیم قاسمی کر رہے تھے اور ان میں خالد احمد، گلزار وفا چوہدری اور دیگر کے ساتھ ساتھ امجد اسلام امجد بھی موجود تھے۔ میں نے امجد اسلام امجد کا نام اس لئے علیحدگی کے ساتھ لیا ہے کہ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کی دوستی ان دنوں اتنی گاڑھی تھی کہ اسے آسانی سے شک کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یونان کے فلسفوں کے دور میں ہوتے تو شہر والے ان کے مجسمے بنا کر چوراہوں میں نصب کرتے اور بعد میں آنے والے فرائیڈ جیسے نفسیات دان اور جنسی مریض اس پاکیزہ دوستی سے بھی بے ہودہ نفسیاتی تھیوریاں نکال لیتے۔ امجد اسلام امجد نے جو مضمون گجرات میں عطاء کی شان میں پڑھا اس سے میں اس کے جس پہلو سے متاثر ہوا وہ لطیفہ بازی تھی۔ یوں میرا عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد سے لطیفے بازی کا ایک ایسا رشتہ استوار ہوا جو شاعری سے زیادہ مستحکم اور دیرپا تھا۔

شاعری بھی اپنی بے نیازی میں خدائی صفت سے ہم آہنگ ہے۔ کتنے گمنام چلے جاتے ہیں اور کئی ہیں کہ مقبولیت ان کے دروازے سے ہٹتی ہی نہیں لیکن شاعری جس قدر عطاء الحق قاسمی کو راس آئی ہے ولی دکنی سے لے کر آئندہ آنے والی کئی صدیوں تک شاید کسی اور کو راس آئے۔ میر تقی میر تو "اپنا دیوان بغل میں داب کے میرؔ" کی دہائی دیتے رہے لیکن لکھنؤ سے دلی اور دلی سے لکھنؤ سے آگے کہیں اور نہ جا سکے لیکن عطاء الحق قاسمی نے جو دیوان بغل میں دابا تو پھر اس چھوٹی سی دنیا جسے کرۂ ارض کہتے ہیں اس کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اردو سمجھنے والے بستے ہوں اور عطاء الحق قاسمی نے وہاں شعر نہ سنائے ہوں بلکہ یہ کرۂ ارض چھوٹا پڑ گیا اور اسے ایک ہی شہر میں بار بار اور صد بار جانا پڑا۔ اس قدر مختصر دیوان کی یہ معجزاتی کرامت شاید ہی کسی اور شاعر کو میسر آئی ہو۔ یوں لگتا ہے یہ دیوان نہیں ایک طلسماتی قالین ہے جس پر بیٹھ کر عطاء دنیا جہان میں گھوم آیا ہے۔ میرا اس سے تعلق مشاعروں کے حوالے سے بھی رہا ہے۔ وہ زمانہ تھا جب شاعری ہی میرا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ہم نے ایک ساتھ کئی مشاعرے پڑھے اور پرانے ڈپٹی کمشنروں کی طرح میں نے کئی مشاعرے کروائے بھی لیکن اگر سچ بتاؤں تو اس سارے تعلق میں مشاعرے کے دوران پڑھی جانے والی شاعری کی حیثیت سٹیج کی چند منٹ کی زبردستی کے سوا کچھ نہ تھی جبکہ مشاعرے سے پہلے اور اس کے بعد کی طویل نشستیں اور مشاعرے کے دوران بزرگ ترین شعرائے کرام اور نو آموز شعراء کی سٹیج پر کارکردگیاں ایک تفنن طبع کا باعث بنتیں۔ ان حرکتوں سے عطاء الحق قاسمی کے فقرے پھوٹتے، لطیفے جنم لیتے اور ضبط کے عالم کی وہ ہنسی جو سٹیج پر بمشکل چھپائی جا سکتی، آج بھی یادوں کے دریچوں سے جھانکتی ہے تو بے اختیار مسکرا اٹھتا ہوں بلکہ ارد گرد دیکھے بغیر زوردار قہقہہ لگا دیتا ہوں۔ کیسا تعلق ہے کہ اگر محفل میں یاد آ جائے اور آدمی بے اختیار ہو جائے تو لوگ پکارنے لگیں "پاگل ای اوئے"۔

میں سوچ رہا ہوں کہ میں ایک سنجیدہ سی تحریر لکھنے والا ہوں۔ اس لہجے میں کیوں لکھے جا رہا ہوں کہ جس طرز تحریر میں عطاء الحق قاسمی نے اپنا سکہ کئی دہائیوں سے منوا رکھا ہے۔ میں کوشش بھی کروں تو ان کی مزاحیہ تحریر جیسی ایک تحریر بھی نہ لکھ سکوں، حالانکہ میں انہیں بار بار پڑھ چکا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ کسی کی تحریر پڑھنے سے اور بار بار پڑھنے سے آدمی ویسا ہی اسلوب اپنانے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن میں جب بھی ان کے مزاح، سفرنامے یا ڈرامے پڑھتا ہوں تو ہر دفعہ ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہوں کہ یہ لکھتے لکھتے آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن ایسی تحریر نہیں لکھ پاتا۔ ہر بار انہیں پڑھنے پر اپنی کمزوری اور کہتری کا احساس مزید شدید ہو جاتا ہے۔ میں عموماً تقریبات میں فی البدیہہ گفتگو کرتا ہوں لیکن عطاء الحق قاسمی کے معاملے میں یہ تحریر اس لئے لکھی کہ احتیاط بہت ضروری تھی، کہیں ایسا نہ ہو جاتا کہ جوشِ خطابت میں کوئی ایسی بات منہ سے نکل جاتی اور اگلے دن اخبارات میں ہم دونوں قابل گردن زدنی قرار پاتے۔ ایسا دور تو ہم نے سوچا تک نہ تھا۔ کیسے کیسے اختلافات ہوتے تھے، ایک دوسرے کے نظریات کی بیخ کنی کرنے کے لئے دنیا جہان کا علم اکٹھا کیا جاتا تھا۔ بحثوں کا وہ عالم کہ یوں لگتا تھا ابھی پستول نکل آئیں گے لیکن اچانک پاک ٹی ہاؤس کی میز پر بیٹھے ہوئے کسی ایک شدید بحث کرنے والے شخص کی آواز گونجتی "یار سنو! میں اس نکتے کا جواب تمہیں بعد میں دوں گا، پہلے یہ بتاؤ تمہارے کپ میں چینی کتنی ڈالوں۔"

(عطاء الحق قاسمی کی 72ویں سالگرہ کی تقریب منعقدہ الحمراء حال میں پڑھا گیا)

KitaabPoint.blogspot.com

یہی ایک راستہ ہے نجات کا

اس پورے خطے میں شاہ ایران امریکہ کا کانسٹیبل اور اس کے مفادات کا واحد پہریدار سمجھا جاتا تھا۔ایک ایسا مطلق العنان بادشاہ جس کی جمہوریت' آزادی اظہار یہاں تک کہ دین کی بھی اپنی تعبیرات تھیں۔جمہوریت تو بقول اس کے ایران میں قائم تھی' الیکشن ہوتے تھے' پارلیمنٹ وجود رکھتی تھی' منتخب وزیر اعظم تھا۔دین کے بارے میں بھی وہ ایک مرنجاں مرنج اور تہواروں والا تصور رکھتا تھا۔ محرم کے دنوں میں ذکر حسین' مجالس اور پورے ملک میں سوگ کی کیفیت کے ساتھ ساتھ جابجا "حسینیان" (امام بارگاہ کا ایرانی نام) کا سرکاری سرپرستی میں قیام' امام رضا کے روضے پر حاضری' وہاں شاندار قالین اور فانوس تحفے میں دینا' کسی بھی مرجع کو جھک کر آداب کرنا' یہ سب وہ بصد خلوص و احترام کرتا تھا۔ اس زمانے میں روس کا کیمونزم زندہ و بیدار تھا' اس لیے ایران میں "دہشت گرد" کا اس زمانے کا ایک مخصوص حلیہ تھا۔ وہ جینز اور جاگرز پہنتا ہو' اس نے لمبے لمبے بال بڑھائے ہوں' سگریٹ کے مرغولوں اور کافی کے تلخ گھونٹوں کے ساتھ انقلاب کی گفتگو کرتا ہو۔ان کیمونسٹوں کے خلاف ایک عمومی تاثر یہ بھی تھا کہ یہ لوگ اللہ کو نہیں مانتے' مذہب کا انکار کرتے ہیں' کبھی ان کو محرم کی مجلس یا خوشی کی شیرینی بانٹتے نہیں دیکھا گیا۔ مدتوں ان لوگوں کو پکڑ پکڑ کر نامعلوم مقام پر موجود قید خانوں میں رکھا جاتا جو امریکی سی آئی اے کی تربیت یافتہ خفیہ ایجنسی ساوک کے تحت قائم کیے گئے تھے۔ مجھے ایران کے دفتر خارجہ کے پہلو میں بنے ہوئے ایسے ہی ایک عقوبت خانے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جسے اب ایک عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔اسے "موزہ عبرت" کہتے ہیں۔ موزہ فارسی میں عجائب گھر کو کہتے ہیں۔ تشدد کے جو آلات میں نے وہاں دیکھے اور جو طریقے وہاں مستعمل تھے انہیں دیکھ کر بدن میں جھر جھری دوڑ جاتی ہے۔

یہی شاہ ایران جب اپنے اقتدار اور امریکی حمایت کی معراج پر تھا تو اس کے خلاف ایران کے مذہبی عناصر کی ایک واضح اکثریت بھی ہو گئی۔ڈاکٹر علی شریعتی کی تحریریں اور تقریریں ایران میں اس مروجہ مذہبی رجحان کو بدلنے کا راستہ دکھا رہی تھیں۔ شریعتی کا وہ مضمون "تشیع صفوی و تشیع علوی" عام ایرانی نوجوان کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے بتایا کہ حضرت علیؓ اور ان کے پیروکاروں کا اسلام، قیام' جدو جہد اور باطل سے ٹکرانے کا اسلام ہے اور اس تشیع کا رنگ سرخ ہے جبکہ اس وقت ایران کا تشیع صفوی ہے جو صفوی بادشاہوں کا مسلک ہے جس میں گریہ اور مفاہمت ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہے۔ کچھ عرصے بعد ایران میں شدت پسند اور دہشت گرد کی دو صورتیں ہو گئیں' ایک وہ جو پہلے بیان کی گئی اور دوسری وہ افراد جنہوں نے داڑھی رکھی ہو' بار بار مسجد یا حسینیان جاتے ہوں' گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر شریعتی کی تحریروں یا علامہ اقبال کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوں۔اب ان لوگوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔شاہ ایران نے اپریل 1978ء میں آرمی کی اکیڈمی کی سالانہ پاسنگ آوٹ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے عجیب رعونت سے کہا کہ میرے دور میں جمہوری اداروں کو استحکام آیا اور لوگ ووٹ کے ذریعے کتنے عرصے سے حکمران منتخب کر رہے ہیں' یہاں سفید انقلاب آچکا ہے جس کے ذریعے ایک ایسی مڈل کلاس وجود میں آچکی جو انقلاب کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ہمارے ساتھ ساڑھے سات لاکھ مستعد فوج ہے جو ہر قسم کی لوٹ مار' تشدد' غنڈہ گردی اور دہشت گردی سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شاہ ایران کے امریکی سرپرست بھی یہی سمجھ رہے تھے۔امریکہ کی اٹھارہ کے قریب مختلف سرکاری اور نجی تنظیموں نے یہ رپورٹ مرتب کی تھی ایران انقلاب کے راستے سے کوسوں دور ہے۔ایرانی قوم ایک جمہوری' سیکولر اور آزاد خیال مزاج رکھتی ہے اس لئے وہاں ایسا تصور بھی ممکن نہیں۔

اس کے بعد کی کہانی ہر کسی کو معلوم ہے لیکن اس زمانے میں شاہ ایران اس کی ساوک کے دستے اور پولیس اپنی جہالت اور حکم کی تعمیل اور بجا آوری میں ایسے اقدامات کرتے جا رہے تھے جس نے مختلف گروہوں اور نظریوں میں بٹی ہوئی ایرانی قوم کو صرف اور صرف شاہ ایران اور اس کے سرپرست اعلیٰ امریکہ کے خلاف متحد کر دیا۔ اقدامات پر غور کیجئے' جس کے گھر سے شریعتی کی کوئی کتاب' کارل مارکس کا کیمونسٹ مینی فیسٹو یا معاشیات کی کتاب داس کیپٹل برآمد ہو جاتی اس کتاب کے وزن کے مطابق سزا سنائی جاتی۔ایک چھوٹے سے علمی کتابچے پر پانچ سال سزا ملتی اور اگر کسی کے گھر سے زیادہ کتابیں برآمد ہو جاتیں تو اس کا تہ پتہ تک معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ نکاراگوا' چلی اور ہنڈراس میں بھی اسی طرح امریکیوں نے اپنی پٹھو حکومتوں کو سبق سکھایا تھا کہ اگر لٹریچر پر پابندی لگا دو تو پورے ملک میں امن ہو جائے گا۔ شاہ ایران نے بھی یہی کیا' کتب خانوں کے مالک اور پبلشرز ایسی کسی کتاب کو رکھنے سے بھی تھر تھر کانپنے لگے۔ لیکن جو لوگ ان کتابوں پر پابندی لگانے والے تھے اور جو اس حکم کو نافذ کرنے والے تھے ان کا علم اتنا تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک گھر میں چھاپہ مارا' وہ کسی کیمونزم سے عقیدت رکھنے والے نوجوان کا گھر تھا۔اس کے پاس تو بہت کتابیں تھیں' یوں بہت بڑا دہشت گرد اور انقلابی سمجھا گیا۔اس نے اپنے کمرے میں ویتنام کے رہنما ہوچی منہ کی تصویر لگا رکھی تھی۔ ساوک کے افسر نے اسے دو تین ٹھڈے مارے اور تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کم از کم اپنے اس بوڑھے باپ کا ہی کچھ خیال کر لیتے۔ ایران اور اس جیسے تمام ممالک' جہاں کسی بھی پر تشدد تحریک کا آغاز ہوا ہو وہاں سب سے پہلے لٹریچر پر حملہ کیا گیا اور وہ بھی انتہائی بھونڈے طریقے سے۔ زار روس کے زمانے میں کمیونسٹ لٹریچر ضبط ہونے لگا تو لوگوں کے ہاتھ سے لکھ کر اور کاربن کاپیاں کر کے لٹریچر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ حکومت مخالف تحریک، شدت پسندی یا دہشت گردی کتنی ہی کمزور ہو اس میں جان ہمیشہ ایسی کارروائیاں ڈالتی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کتابوں پر پابندی کی فہرستیں وہ مرتب کرتے ہیں جنہوں نے کتاب چھو کر بھی نہیں دیکھی ہوتی' بیورو کریٹ، پولیس والے، ایجنسیوں کے اہلکار۔ایک ہزار سالوں سے شیخ عبدالقادر جیلانی کی کتاب غنیۃ الطالبین چھپتی چلی آرہی ہے، کیا اس سے شیعہ سنی فسادات ہوئے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ دو سو سالوں سے چھپ رہی ہے، کیا وہ وجہ فساد ہے، اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی کے فتاویٰ نے دہشت گردی کی آگ کو بھڑکایا ہے۔ یہ ایجنڈا کس کا ہے کہ کتب فروش جن کتابوں میں لفظ توحید، جہاد، باطل سے جنگ اور طاغوت جیسے لفظ بھی شامل ہوں انہیں اپنی دکانوں سے اٹھا رہے ہیں۔ ایک جہالت ہے' مدت ہوئی لاہور کے ایک اخبار میں شبلی نعمانی کی سیرت النبی قسط وار چھپنا شروع ہوئی۔ایک تھانیدار نے قابل اعتراض مواد سمجھ کر مقدمہ درج کر لیا اور پھر علامہ شبلی نعمانی کی تلاش میں چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ حکام کے سامنے اپنے نمبر بنانے والے افسران کو علم تک نہیں کہ وہ جو کروڑوں موبائل لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن پر جی پی آر ایس اور وائی فائی میسر ہے، وہاں ہزاروں ایسی ویب سائٹس ہیں جہاں فرقہ وارانہ نفرت پر مبنی لٹریچر صرف چند سیکنڈ میں موبائل کی سکرین پر آجاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان تمام علماء کی شدت انگیز تقریریں بھی چند سیکنڈ میں ڈاؤن لوڈ ہو جاتی ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایران میں کتابوں پر پابندی لگی تو کیسٹوں نے طوفان برپا کر دیا' لیکن یہاں تو کیسٹ خریدنے کی بھی ضرورت نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی شدت پسندی، قتل و غارت یا دہشت گردی جسے علمی بنیادی میسر آ جائے اسے طاقت سے نہیں علم سے ہی ختم کیا جاتا ہے۔ موجودہ فرقہ واریت کی تعریف کون کرے گا۔بحرین اور یمن کے دہشت گرد ایران اور عراق کے لئے انقلابی ہیں اور عراق اور شام کے دہشت گرد دیگر کے لئے انقلابی۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے دین کی تعبیر کا کام علماء کے سپرد کر دیا ہے جو ہمیں زیادہ سے زیادہ سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی بنا سکتے ہیں۔ جس دن پہلا فرقہ واریت کا قتل ہوا تھا اگر اس دن اس ملک کے نصاب تعلیم میں قرآن عربی کے ساتھ پڑھایا جاتا تو کسی کو اس کی تعبیر ڈھونڈنے کیلئے مولوی کے پاس نہ جانا پڑتا۔وارث شاہ، غالب، رحمٰن بابا اور شاہ لطیف کی شاعری کے مطالب ڈھونڈنے کوئی کسی دوسرے کے پاس جاتا ہے۔ہم فزکس، کیمسٹری، بیالوجی کے لئے انگریزی زبان سیکھتے ہیں لیکن قرآن ترجمہ سے پڑھتے ہیں۔ہم پر قرآن کی ہیبت طاری ہوتی ہے اور نہ ہی ہم پر اس کے مطلب واضح۔ قرآن سے نصاب کی سطح پر رابطہ یہی ایک راستہ ہے نجات کا۔وہ سیکولر دانشور جو یہ تصور لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم اس تازہ جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ملک کے لوگوں کے آئیڈیلزم سے مذہب نکال دیں گے' انہیں اندازہ تک نہیں کہ ان کے یہ مشورے ہمیشہ تاریخ کا کوڑادان بنے ہیں۔ مذہبی آئیڈیلزم کا اس ملک میں یہ حال ہے کہ لوگ فرقہ واریت تک بھول جاتے ہیں۔کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہاں چی چل ،ڈیگال کیوں نہیں آتا۔ مسلک کوئی بھی ہو' سب یہی کہتے ہیں یہاں خمینی کیوں نہیں آتا۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہی اللہ کا دستور ہے

پاکستان کے نظامِ انصاف کا کمال یہ ہے کہ جس جرم کی نوعیت، اس کے مجرم اور اس سے متعلق ہر کردار کو شہر، گلی اور محلے کا بچہ بچہ بخوبی جانتا ہوگا اسے عدالت میں ثابت کرنا ب دنیا کا ناممکن ترین کام بن چکا ہے۔ اسی لئے کہ جس شخص کی جانب بھی انگلی اٹھتی ہے کہ اس نے قتل کیا ہے، چوری کی ہے، بھتہ لیا ہے، یا رشوت اور کمیشن حاصل کیا ہے، وہ سینہ تان کر کہتا ہے کہ ایسے الزامات تو لگتے رہتے ہیں، جاؤ جاکر عدالت میں ثابت کرو، یا پھر ایک دن فخر سے سینہ پھلا کر کہے گا کہ مجھے عدالت نے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔ یہ صورت حال بڑی بڑی سیاسی قیادت، یا انتظامی اشرافیہ تک محدود نہیں بلکہ آپ ایک پٹواری، تھانیدار، کسٹم انسپکٹر، انکم ٹیکس کے اہلکار، یہاں تک کہ دفتر کے کلرک تک کو اپنے ہاتھ سے رشوت دے کر بھی اسے اس ملک کے نظامِ انصاف میں رشوت خور ثابت نہیں کر سکتے، اگر آپ نے درخواست جمع کروا بھی دی، تو الٹا آپ یہ طعنہ لے کر واپس لوٹیں گے کہ یہ شخص جھوٹے الزامات لگاتا ہے، کارِ سرکار میں مداخلت کرتا ہے، بلکہ عدالت کا وقت ضائع کرتا ہے۔

کسی بھی سرکاری دفتر کے آس پاس سائلین کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ اگر کہیں آپ انہی سائلین میں سے ہیں تو آپ تک یہ بات بہ آسانی پہنچ جائے گی کہ کس میز پر بیٹھے ہوئے شخص کو کتنے روپے دیئے جائیں تو کام با آسانی اور جلدی ہو جائے گا۔ بہت سے ایسے دفاتر ہیں جہاں آپ کو سائل بن کر لائن میں کھڑے ہونے یا اس کلرک، اہلکار یا آفیسر سے ملنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرنا پڑتی، بلکہ اس کے کارندے آپ کا یہ کام بحسن وخوبی سرانجام دیں گے۔ اپنی مناسب سی اجرت حاصل کریں گے اور باقی پیسے سے کام کرنے والے افسران کی جیب گرم کریں گے۔ ایسے کارندے آپ کو ائیر پورٹ پر کسٹم حکام کی چیرہ دستیوں سے بچانے کا ذمہ لیتے ہوئے، پٹواری سے زمین کے کاغذات یا انتقال کروانے کے لیے مستعد، پاسپورٹ کے دفاتر کے آس پاس، انکم ٹیکس، اکاؤنٹ جنرل، کنٹونمنٹ آفس غرض ہر دفتر میں نظر آتے ہیں۔ سائل انہیں مطلوبہ رقم تھماتے ہیں اور اپنا کام نکلوا کر باہر آ جاتے ہیں۔ یہ سائل ان افسران کو بھی جانتے ہوتے ہیں اور ان کلرکوں سے بھی آشنا ہوتے ہیں جن کے کارندے نے ان کے جائز کام کے لیے بھی رشوت طلب کی تھی، لیکن اگر ان افسران یا کلرکوں میں سے کسی کے خلاف کرپشن کا کوئی مقدمہ درج ہو جائے، کوئی غصے میں بپھرا ہوا سائل درخواست جمع کروا دے تو ان تمام افراد میں سے کوئی وہ سچ بولنے بھی عدالت کے سامنے نہیں آئے گا جو وہ روزانہ اپنے گھر والوں، دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کے سامنے بولتا رہتا ہے۔ ہر کسی کے سامنے بیان کرتا ہے کہ میں نے اتنے پیسے دے کر یہ کام کروایا ہے، لیکن گواہی نہیں دے گا۔ کیا ہم ایک خوفزدہ معاشرے میں ڈھل چکے ہیں۔ ہم میں سے صاحب حیثیت شخص، جس کے پاس وسائل کی کمی نہیں، وہ بھی اگر اپنے مکان کی رجسٹری کرواتے وقت رشوت دیتا ہے تو اس اہلکار کے خلاف گواہی کے لیے عدالت نہیں جاتا۔ اس کے کسی عزیز کا نام اگر تھانیدار غلط طور پر ایف آئی آر میں داخل کر لے تو اسے نکلوانے کے لیے اسے جو رشوت دینا پڑتی ہے اس کی رپورٹ تک کہیں درج نہیں کرواتا۔ ہر کسی نے یہ تصور بنا لیا ہے کہ معاشرہ اب انتہائی بددیانت ہو چکا ہے، اس لیے اب ہمیں ایسے ہی گزارا کرنا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جن کے جائز کام سرکار کے دفاتر میں رکے ہوئے ہوں اور انہیں یہ کام نکلوانے کے لیے پیسے لگانے پڑتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا طبقہ بھی ہے جنہوں نے اپنے ناجائز کاموں کے لیے ایک نظام وضع کر رکھا ہے۔ اس نظامِ کے تحت نیچے سے لے کر اوپر تک ہر کسی کا حصہ مقرر ہے۔ ہر کسی کو اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق حصہ پہنچ جاتا ہے اور اس ناجائز کام کی فائل ایک میز سے دوسری میز تک پر لگا کر اڑتی پھرتی ہے، اگر ہم خوف زدہ معاشرہ میں نہیں ڈھل چکے تو کیا ہم اک بددیانت معاشرہ بن چکے ہیں۔

بددیانتی بھی ایک معاشرے کو خوفزدہ بناتی ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز بددیانتی پر مائل شخص کو ہمیشہ ایک خوف ضرور سوار رہتا ہے۔ پکڑے جانے کا خوف۔ لیکن بہترین معاشرہ وہ ہوتا ہے کہ جب کوئی پکڑا جائے تو پھر انصاف کا نظام اس قدر با مقصد اور بامعنی ہو کہ وہاں خوفزدہ وہی پکڑے جانے والا شخص نظر آئے گا اور لوگ اس کے خلاف گواہی دینے پر ایک دوسرے سے بازی لے جائیں گے۔ اس کا اپنا گروہ، قبیلہ، سیاسی پارٹی یہاں تک کہ خاندان تک اس کے خلاف کھڑا ہو جائے، اسے بددیانت، چور، قاتل، بھتہ خور کہے۔ کوئی اس کے دفاع کے لیے ٹیلی ویژن پر نہ آئے کوئی اس کی وکالت میں ریلیاں نہ نکالے، کوئی اس کے لیے پریس کانفرنس نہ کرے۔

ہم بددیانت بھی ہیں اور خوفزدہ بھی لیکن یہ دنوں مرض جو ہمیں لاحق ہو چکے ہیں کتنی آسانی سے دور ہو سکتے اگر ہم میں ایک صفت پیدا ہو جائے جو قرآن کے انسان مطلوب سے اللہ چاہتا ہے۔ قرآن کی آیات انصاف اور عدل کے جس اصول پر بنیاد رکھتی ہیں ان میں اہم ترین یہ ہے کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کر دے کہ تم عدل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو اور دوسرا یہ کہ حق کی گواہی دیتے رہو خواہ وہ تمہارے عزیز ذاقربا کے خلاف کیوں نہ ہو۔ ہماری خرابی کی بنیادی وجہ اور ہمیں خوفزدہ اور بددیانت بنانے میں اسی ایک کوتاہی، خرابی اور بیماری کا دخل ہے۔ ہم اس شخص کو چور، ڈاکو، قاتل، بھتہ خور اور بددیانت کہہ ہی نہیں سکتے جو ہمارے خاندان، قبیلے، برادری، پیشہ ورانہ گروہ یا سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ ڈاکٹروں، انجینئروں، کلرکوں غرض ہر قسم کی انجمنیں اپنے چوروں کا دفاع کرتی ہیں۔ بدقسمتی کا عالم یہ ہے کہ ہر مسلک کے ماننے والے بھی اپنے مسلک کے مجرموں کا دفاع کرتے ہیں۔ نسل، رنگ اور زبان سے تعلق رکھنے والے اپنے مجرموں کا دفاع کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ بیماری جس کی علامت یہ ہے کہ ہمارے دل پتھر کے ہو چکے ہیں۔ صرف دو سال قبل ہمیں ٹیلی ویژن چینلوں پر دکھائے گئے وہ منظر بھول چکے جب ایک فیکٹری سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور مائیں، بہنیں، باپ بھائی چیخیں مارتے، غش کھاتے پکار رہے تھے کہ کہ کوئی ہمارے بچے اور بچی کو اس آگ سے باہر نکالے۔ میڈیکل سائنس اس بات پر متفق ہے کہ سب سے تکلیف دہ موت جل کر مرنے کی موت ہوتی ہے کیونکہ درد بنیادی طور پر جلد میں ہوتا ہے۔ درد کے (aincenters) جلد میں ہیں اس لیے اس کا جلنا سب سے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ ڈھائی سو لوگ، بیس کروڑ لوگوں کے سامنے جل مرے۔ لیکن یہ بیس کروڑ اپنے اپنے گھروں میں ان مناظر کو ٹیلی ویژن پر چلنے والی ایک شاندار فلم کی طرح تماشہ کے طور پر دیکھتے رہے۔ لیکن پورے ملک میں کسی ایک کا بھی ضمیر نہ جاگا، کسی نے پکار کر یہ نہ کہا کہ پورے کراچی کو معلوم ہے، بچہ بچہ جانتا ہے کہ کون ظالم ہے، کون بھتہ خور ہے، کون قاتل ہے۔ آج اگر گھروں میں خفیہ کیمرے لگا کر دیکھیں، تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہر گھر اپنے لٹنے کے بعد آپس میں ایک دوسرے کو کہانی سنا رہا ہوتا ہے کہ اسے کس نے لوٹا، وہ مجبوراً کس کو بھتہ دیتا ہے۔ سب آنسو بہاتے ہیں اور پھر ایک دوسرے سے عہد لیتے ہیں کہ باہر مت بتانا وہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ ایسے معاشرے جہاں انسانوں پر اس قدر بھیانک ظلم پر بھی لوگوں کا ضمیر نہ جاگے، وہ حق کی گواہی دینے کے لیے کھڑے نہ ہوں، وہ اپنے خوف اور تعصب کے خول سے باہر نہ نکلیں تو پھر کیا ان معاشروں پر اللہ عادل حکمران بھیجتا ہے؟ نہیں وہ بدترین، اور ظالم حکمران مسلط کرتا ہے۔ یہی اس کا دستور ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ دنیا تو ایک محلّہ ہے

سیاسی تجزیہ نگاری کبھی تاریخ دانوں اور فلسفہ پر کتابیں لکھنے والوں کی جاگیر ہوا کرتی تھی۔ سیاست کے داؤ پیچ اور حکمرانوں کے طرز حکومت پر بلیغ تبصرے یہی لوگ کیا کرتے تھے۔ سقراط سے افلاطون، ارسطو سے ابن خلدون اور الکندی سے البیرونی تک؛ یہ سب کے سب جہاں تاریخ کے واقعات تحریر کرتے، وہاں اصول حکمرانی اور طرز جہانبانی بھی کھول کھول کر بیان کر دیتے۔ لیکن اب سیاسی تجزیہ نگاری میڈیا کا میدان ہے۔ مدتوں اخبارات و رسائل گزشتہ تاریخ کے اوراق بھی پلٹتے رہے، ان پر اپنے رنگین اور چسکے دار تبصرے بھی کرتے رہے اور اپنے وقت کے حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مستقبل کی پیشین گوئیاں بھی تحریر کرتے رہے؛ لیکن گزشتہ ایک سو سال میں اس ساری تجزیہ نگاری، تاریخ دانی اور تبصرہ گری میں ایک ایسا فرق آیا ہے، ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی ہے جس نے اس دنیا میں حق اور سچ کے تمام معیارات ہی بدل کر رکھ دیے ہیں۔ سقراط سے لے کر البیرونی تک سب کے سب تاریخ دان اگر کسی حکمران کے دورِ حکومت کو پرکھتے تو کسوٹی عدل، انصاف، سچائی، عوامی فلاح، خوشحالی اور انسانی جان کے احترام جیسے اصولوں کی ہوتی۔ یہ اصول اور الفاظ صدیوں سے انسانی تہذیب کا حصہ تھے اور لوگ ان کے معانی خوب جانتے تھے۔ انہیں عدل وانصاف، امن وخوشحالی اور فلاح و بہبود جیسے الفاظ کی تشریح اور تجزیے کے لئے کسی ماہر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

لیکن موجودہ دور کے میڈیا کی چھتری تلے پروان چڑھنے والی تجزیہ نگاری نے ایسی ایسی تراکیب ایجاد کی ہیں کہ آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگتی ہیں۔ ان تراکیب کو جس طرح کے معانی پہنائے جاتے ہیں اور جیسی گوہر افشانی کی جاتی ہے، ان تراکیب کے لبادے میں جس طرح ظلم و بربریت کو تقدس دیا جاتا ہے' وہ مزید حیرت کا باعث ہے۔ تراکیب کمال کی ہیں۔ عالمی ضمیر، انٹرنیشنل کمیونٹی، طرزِ زندگی یا لائف سٹائل کا تحفظ، دہشت گردی، جارحیت اور امن کی مشترکہ کوششیں۔ ان سب تراکیب کے پیچھے گذشتہ سو سال کی وہ خونریزی ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ قتل و غارت' جو جنگ عظیم اول میں شروع ہوئی، جنگ عظیم دوم کے بعد اپنی انتہا کو پہنچی اور ویت نام سے لے کر انگولا اور جنوبی امریکہ کے ملکوں سے ہوتی ہوئی عراق اور افغانستان کے میدانوں میں آج بھی خون بہا رہی ہے۔ اس ساری خونریزی اور قتل و غارت کے خوشنما مقاصد انہی تراکیب سے متعین کیے جاتے ہیں۔ مثلاً عالمی ضمیر اور انٹرنیشنل کمیونٹی' یہ دو ایسے لفظ ہیں جو حکومتوں پر براجمان سیاست دان اور تجزیہ نگار بہت استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا ایک محلے کی صورت میں ڈھل چکی ہے، اس لئے کوئی ملک تنہا زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے اصولوں کی پاسداری کر سکتا ہے۔ اس محلے میں دو سو گھرانے یا ملک آباد ہیں۔ اس عالمی ضمیر اور انٹرنیشنل کمیونٹی پر پچاس کے قریب سرمایہ دار غنڈوں کا قبضہ ہے۔ یہ پچاس غنڈے سارے محلے کے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرتے ہیں' ان کے سامنے ایک صورت حال پیش کرتے ہیں کہ اس محلے کا سب سے مفلوک الحال، غریب اور پسماندہ گھرانہ ہم سب کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ وہاں کے لوگ نہ ہم سے قرض لیتے ہیں کہ ہم ان پر اپنا رعب ڈال سکیں اور نہ ان کی روزمرہ زندگی ایسی ہے کہ وہ ہماری ایجادات کے محتاج ہوں۔ لیکن ان فاقہ کش لوگوں سے ہمیں بہت خطرہ ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہ چند لاکھ لوگ ایک دن ہماری عیش گاہوں، رقص کدوں اور طرب گاہوں پر قبضہ کر کے ملیامیٹ کر دیں گے اور جو طرزِ زندگی یا لائف سٹائل ہم نے اپنا رکھا ہے' وہ ختم ہو جائے گا۔ ہم سکھ کا سانس نہیں لے سکیں گے۔ ان پچاس سرمایہ دار غنڈوں کو پورے محلے کے دو سو کے قریب اہل خانہ یہ اختیار دیتے ہیں کہ تم فوراً اس مفلوک الحال گھر پر حملہ کر دو، اس کے مکینوں میں سے جو آواز بلند کرے' اسے قتل کر دو، ان میں تمہیں جو بھی ''عالمی امن'' کے لئے خطرہ نظر آتا ہے اُسے قید کرو، جلاوطن کرو، ہزاروں میل دور کسی جزیرے میں بنائے گئے عقوبت خانے میں رکھو، یہ سب تمہارے لئے جائز ہے۔ پھر اُس گھر میں اپنے وفادار ڈھونڈو، اس گھر میں بسنے والے لوگوں کے لئے اپنی مرضی کا ایک ضابطہ اخلاق اور ضابطہ طرز حکومت تحریر کرو جسے ''آئین'' کہتے ہیں۔ پھر اس ''آئین'' کو اپنے وفاداروں کے ہاتھ میں تھما دو، انہیں اس گھر کا مالک و مختار بناؤ اور اُس کو اس گھر پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اپنی افواج بھی دے دو۔ پھر اُس کے بعد محلے کے لوگوں کو اکٹھا کرو اور ان کے سامنے اپنی کارکردگی کی ایک رپورٹ پیش کرو کہ ہم نے ظالموں، جاہلوں، بدمعاشوں اور خونی درندوں سے اس گھر کا اقتدار چھین کر پُرامن لوگوں کو دے دیا ہے جو ہماری طرح طرز زندگی گزارنے کے عادی ہیں' جو ہماری اخلاقیات پر کاربند رہنا چاہتے ہیں، جیسا ہم سوچتے ہیں ویسا ہی وہ سوچتے ہیں۔ دیکھو ہم نے اس دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ ہم نے اپنی افواج کو اس خونی معرکے میں جھونکا ہے۔

اس عالمی ضمیر اور عالمی کمیونٹی کے پچاس سرمایہ دار غنڈوں کو' جو گھر والا اپنے پڑوسی پر حملہ کرنے، اُسے تہ تیغ کرنے، اس کی زمین پر لاکھوں بم برسانے کے لئے اپنے گھر کا صحن یا چھت استعمال کے لئے دیتا ہے اور پوری دنیا کے سامنے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ یہ ہے تو ہمارا غریب پڑوسی لیکن میں کیا کروں، دنیا تو ایک محلّہ بن چکی ہے، میں اس محلے کا حصہ ہوں، پورے محلے کے لوگوں نے مجھے اس غریب کے گھر پر یلغار کرنے میں مدد کرنے کی اجازت دی ہے، اب ہم پڑوس میں ہیں تو ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑ رہا ہے، ہمارے لئے کوئی اور راستہ نہیں۔ پھر اس دوران اگر ظلم سہنے والے گھر کے لوگ اس گھر کے مکینوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے۔ ہاں اب تو ہمارے لوگ بھی مارے گئے۔ پہلے یہ ہماری جنگ نہ تھی، اب تو یہ ہماری جنگ ہو گئی ہے۔ کیا شاندار منطق ہے اور کتنی خوبصورت تشریحات ہیں۔ ایسا صرف ایک گھر میں نہیں کیا گیا، کسی ایک مکین کو نہیں اجاڑا گیا۔ گذشتہ ساٹھ سال سے اس عالمی محلے کے غنڈے' جس گھر میں چاہیں' دندناتے ہوئے چڑھ دوڑتے ہیں اور ہر چیز کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک اس محلے میں غنڈوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ مزدوروں اور کسانوں کے نام پر کسی غریب ملک میں داخل ہوتا کہ ہم اس گھر کے سرمایہ داروں سے آپ کو نجات دلانے کے لئے آئے ہیں۔ دوسرا گروہ ان خیالات کے ماننے والوں کو عالمی امن، تہذیب، آزادی رائے اور انسانی حقوق کے لئے خطرہ قرار دیتا اور پھر ''ان گوریلوں'' سے دنیا کو نجات دلانے کے لئے جس ملک میں چاہے جا گھستا۔ چالیس سال جنوبی امریکہ اور مشرق بعید کے ممالک میں لاپتہ افراد، جیل میں مرنے والے، خاندانوں کی تباہی، عورتوں کی آبروریزی اور کروڑوں لوگوں کی ہجرت کے سال ہیں۔ اس محلے کا دوسرا غنڈہ گروہ تھک ہار کر شکست کھا گیا اور پھر آج تک وہ غنڈوں کے اس دوسرے عالمی گروہ کا حصہ بن چکا ہے۔

لیکن ان محلے کے غنڈوں کی قتل و غارت گری کو خوبصورت معانی پہنانے، انہیں عالمی ضمیر، عالمی امن، انٹرنیشنل کمیونٹی اور دہشت گردی سے آزادی جیسے الفاظ کا روپ دینے کا کام اس دنیا کے ہر ملک کے دانشوروں کے پاس ہے اور تجزیہ نگاروں کی جاگیر ہے۔ یہ پہلے دو گروہوں میں تقسیم تھے' ان کے دو دسترخوان تھے' اب یہ سب ایک ہی تھالی میں دانہ چگتے ہیں اور ایک ہی طاقت کے ظلم کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ لوگ جو پشاور، اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں بیٹھ کر تجزیہ نگاری کرتے ہیں' اگر ان کے محلے دار مل کر ایک ہال میں جمع ہوں، محلے کے پچاس غنڈوں کے حق میں ایک قرارداد پیش کریں کہ فلاں تجزیہ نگار کی لمبی زبان گدی سے کھینچ دینی چاہیے کہ یہ محلے کے امن کے لئے خطرہ ہے' پھر یہ محلے کے پچاس غنڈے اُس کے گھر میں داخل ہو جائیں اور ایسے میں ٹیلی ویژن کی لائیو کوریج کرتا ہوا کوئی اینکر پرسن ان سے فون پر اس واقعہ کا تجزیہ کرنے کو کہے تو وہ کیسی اور کس طرح کی گفتگو کریں گے؟ ان کی تو ہچکی بندھ جائے گی، ان کے منہ سے لفظ نہیں نکل سکیں گے۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ جنگ کون جیتے گا

یروشلم پر یہ قیامت خیز دن تھا۔ 28 اگست 70ء' جب یہودی آخری بار رومنوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے لڑے تھے۔ ان کی یہ لڑائی 62ء میں شروع ہوئی' جب شہنشاہ روم نے فلسطین کے علاقے میں نااہل اور رشوت خور گورنر لگانا شروع کیے۔ ایلی بی نس بحری قزاقوں سے بھتہ وصول کرتا۔ اس کے بعد آنے والا کیس ٹس فلورس بھی اسی روش پر قائم رہا۔ ان کی مال و دولت کی ہوس اسقدر بڑھی کہ انہوں نے یہودیوں کے ہیکل کے خزانے سے بھی رقم طلب کر لی۔ اگلے دن یہودی مسلح ہو کر شہر میں نکل آئے اور رومن سپاہیوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ یوں لگتا تھا یہودیوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب رومن اپنی عیاشی اور بدعنوانی کی وجہ سے کمزور ہو چکے ہیں اس لیے مقدس یروشلم پر آزاد حکومت کا خواب پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن 70ء کے آغاز میں جب ول لیپا سیئن شہنشاہ بنا تو اس نے بیٹے طیطس کو یہودیوں سے لڑائی کے لیے بھیجا' جس نے فروری میں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ وہ بڑی بڑی منجنیقوں سے ہیکل کے صحن میں پتھر پھینکتے۔ آخر کار 28 اگست کو وہ ہیکل کے صحن میں داخل ہو گئے۔ اس وقت وہاں چھ ہزار یہودی موجود تھے۔ ان میں سے ہر ایک بہادری سے جان دینے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ عام یہودی باہر' شرفا اندرونی صحن اور مذہبی رہنما "ربائی" مخصوص حصے میں لڑتے لڑتے جان دیتے رہے۔ رومن سپاہیوں نے ہیکل کو آگ لگا دی۔ بچے کھچے یہودی اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے یا رومن سپاہیوں کی تلواروں سے کٹ مرے۔ پھر شہر بھر کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد یہودی قوم پوری دنیا میں بکھر گئی۔ دنیا کا کوئی براعظم ایسا نہیں جہاں یہ لوگ جا کر آباد نہ ہوئے ہوں۔ لیکن یورپ میں مسیحی حکومتوں میں ان پر عرصۂ حیات جس طرح تنگ کیا گیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ دو ہزار سال پر محیط یہ دربدری' تشدد' قتل اور انسانیت سوز سلوک سے عبارت ہے۔ لیکن ان دو ہزار سالوں میں ہر یہودی کے دل میں اس آرزو کا چراغ جلتا رہا کہ ایک دن ہم نے اپنی ارض مقدس میں واپس جانا ہے اور قیامت کے آنے سے پہلے وہاں اپنے مسیحا کا انتظار کرنا ہے جو ہماری ویسی ہی حکومت دوبارہ قائم کریگا جیسی حضرت سلیمانؑ کے دور میں تھی۔ ہمیں دیگر تمام مذاہب کے افراد سے جنگ کرنا ہے اور اپنے دین کو غالب کر کے ایک عالمی ریاست قائم کرنا ہے۔

دنیا کے جس شہر میں بھی یہ یہودی قیام پذیر ہوئے' اپنی کاروباری فطرت اور محنت کی وجہ سے وہاں کے صاحب حیثیت لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ امریکہ تو ان کے لئے ایک نعمت کے طور پر ثابت ہوا۔ انہیں نہ کوئی وہاں یورپ کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور نہ ہی انہیں سیاست اور معیشت پر چھا جانے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ پوری دنیا میں جب رنگ نسل' زبان اور علاقے کی بنیاد پر قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں تو ہزاروں سال ساتھ رہنے کے باوجود' ویسا رنگ' ویسی زبان اور اسی علاقے میں نسل در نسل رہنے والے یہ یہودی وہاں کے لوگوں کے لئے اجنبی تھے۔ وہاں رہتے رہتے ان کی اکثریت سیکولر ہو گئی تھی۔ لیکن قومیت کے نعرے نے اسقدر زور پکڑا کہ 1882ء میں زار روس کے حکم پر ان کی پہلی نسل کشی ہوئی۔ اس دوران لیون پی نسکر نے اپنی مشہور کتاب autoemencipation لکھی۔ یہ خود بھی ایک سیکولر یہودی تھا لیکن نسل کشی کے بعد اس نے اس نظریے کو فروغ دیا کہ باوقار زندگی گزارنے کے لئے یہودی قومیت کی بنیاد پر وطن حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس نے کہا "زندہ لوگ ہمیں مردہ سمجھتے ہیں اور مقامی ہمیں پردیسی' امیر ہمیں بھکاری کہتے ہیں اور غریب ہمیں استحصال کرنے والے لکھ پتی سمجھتے ہیں جبکہ محب وطن ہمیں بے وطن کہتے ہیں"۔ یہی نظریات تھے جنہوں نے سیکولر اور آزاد خیال یہودیوں کو بھی ایک لڑی میں پرو دیا۔ ہر کوئی ان بشارتوں کے بارے میں سوچنے لگا کہ جب یروشلم میں ان کے مسیحا کی حکومت قائم ہو گی۔ اسی سال یعنی 1882ء میں یعنی ٹھیک ایک ہزار آٹھ سو بارہ سال بعد بہت سے یہودی اپنا کاروبار سمیٹ کر فلسطین میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ پہلے یہودی تھے جو وہاں اس تصور کے ساتھ گئے کہ ہم نے ایک وطن حاصل کرنا ہے اور وہی وطن جس سے ہم دو ہزار سال پہلے دربدر ہوئے تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک عقیدہ بھی لے کر گئے تھے کہ ہم نے اس یروشلم میں ایک بہت بڑی جنگ لڑنا ہے اور ایک ایسی ریاست قائم کرنا ہے جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جیسی عالمی حیثیت رکھتی ہو گی۔ جسے وہ "theWorld RulingStateof" دنیا پر حاکم ریاست کا نام دیتے ہیں۔ یہیں ان کا مسیحا آئے گا اور ان کی الہامی کتابوں کے مطابق ان سے کیا گیا وعدہ سچا ہو گا اور وہ دنیا کی ایک حاکم قوم بن جائیں گے۔

1882ء میں چند ہزار یہودیوں کی یروشلم اور ارض مقدسہ میں آبادکاری کے بعد کی تاریخ پوری دنیا میں آباد یہودیوں کو ایک منزل اور ایک سرزمین پر جمع کرنے کی تاریخ ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی کاروباری دنیا میں مگن تھا۔ انہوں نے وہاں اپنے گھر بسا لئے تھے۔ ان کی پندرہ بیس نسلیں ان ملکوں میں زندگی گزار چکی تھیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد تو وہ ان ملکوں میں بہت مستحکم ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہولوکوسٹ کی خوفناک کہانیاں سنا کر یورپ میں ایسے سخت قوانین تک بنوا لیے تھے کہ یہودیوں کے خلاف بات کرنا سنگین جرم ہو چکا تھا۔ وہ کاروبار اور میڈیا کے تو بلاشرکت غیرے مالک بن چکے تھے۔ حکومتیں اور سیاست ان کی انگلیوں پر ناچتی تھی اور آج بھی وہ اس کا رخ متعین کرتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود 1882ء کے بعد سے وہ فلسطین کی جانب چلتے رہے جسے وہ "ایلیاہ" کہتے ہیں' یعنی اللہ کے راستے کا سفر۔ یہ سب اپنی پرآسائش رہائش گاہیں اور شاندار کاروبار چھوڑ کر ایک ایسے خطے میں جا کر آباد ہونے لگے جو پسماندہ تھا' ریگستان تھا' ان کیلئے مکمل طور پر اجنبی ہو چکا تھا۔ جہاں ہر وقت موت کے سائے سروں پر منڈلاتے تھے۔ جس قوم پرست سیاست کا بیج بو کر انہوں نے امت مسلمہ کو تقسیم کیا تھا' وہی عرب نیشنلزم انہیں فلسطین کی سرزمین پر برداشت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ پیرس' لندن' نیویارک' واشنگٹن اور ایسے خوبصورت علاقوں سے اس بے آب و گیاہ سرزمین پر جا کر آباد ہونے لگے اور آج بھی ان کی اس مقدس سرزمین کی جانب ہجرت جاری ہے۔ 14 مئی 1948ء کو تل ابیب میوزیم میں جب ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیلی ریاست کا اعلان کیا اسے اس وقت ایک شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یورپ بھی ان کا کوئی خیرخواہ نہ تھا' بلکہ جنگ عظیم دوم کے بعد ایک بار پھر درپردہ یہودی دشمنی ابھر آئی تھی۔ 29 جون 1946ء کو برطانیہ نے یہودی ایجنسی پر چھاپہ مار کر 2718 صیہونیوں کو گرفتار کر لیا تھا تاکہ فلسطین میں یہودی زیادہ طاقتور نہ ہو جائیں۔ ایسے میں یہودیوں نے اپنا دوسرا چہرا' امریکہ استعمال کیا جس نے اسرائیل کی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی اور 1948ء کی جنگ میں مدد دی۔ عرب قوم پرستی کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور اسرائیل مستحکم ہو گیا۔

یہ ملک کیوں بنایا گیا۔ یہ لوگ وہاں کیوں اپنی شاندار رہائش گاہیں اور کاروبار چھوڑ کر آباد ہو رہے ہیں۔ کیا وہ وہاں ایک پکنک منانے آئے ہیں۔ کیا اسرائیل ایک صحت افزا مقام ہے۔ وہاں آنے والے بچے بچے کو اس کا علم ہے کہ وہ ایک عالمی صیہونی ریاست کے قیام کی جنگ لڑنے کے لئے یہاں آیا ہے۔ ان کے آباؤاجداد کو بھی اس کا علم تھا۔ لیکن کیا ہمیں اس بات کا تھوڑا سا بھی ادراک ہے۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ یہ جنگ مصر' ایران' عراق' سعودی عرب اور پاکستان سے نہیں مسلمانوں سے لڑی جائے گی۔ یہ کسی قوم ملک یا نسل کے ساتھ جنگ نہ ہو گی۔ پوری مسلم امہ کے ساتھ برپا ہونے والی جنگ ہو گی۔ اس کا ادراک اور تیاری دوسری جانب تو موجود ہے۔ باراک اوبامہ جو مصر کے جامعہ الازہر میں آیا تو اس نے کسی ایران' پاکستان یا مصر کا ذکر نہ کیا بلکہ مسلم امہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم اپنے اندر سے دہشت گردی کا خاتمہ کرو۔ ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ ہمیں ایک امت کی طرح اپنا ہدف جانتے ہیں۔ کیا ہمیں احساس ہے' ہمیں اس کا تھوڑا سا بھی ادراک ہے۔ ہم جن کو سید الانبیاءؐ فتح کی بشارت دے چکے "ایک زمانہ میں تم یہودیوں سے جنگ کرو گے اور تم یہودیوں پر غلبہ پاؤ گے۔ یہودی جس پتھر کے پیچھے چھپے گا وہ پکارے گا یہ دیکھو اے مسلم' یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہے دوڑو اور اسے قتل کر دو" (متفق علیہ) وہ پتھر مسلم کہہ کر پکارے گا عراقی' مصری' شامی' پاکستانی یا لبنانی نہیں۔ یہ جنگ ایک مسلم امہ جیتے گی رنگوں' نسلوں اور زبانوں میں بٹی ہوئی قوم نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ جنگ تو برپا ہونا تھی

کیا یہ سب خاندان جو جزیرہ نمائے عرب کے شمالی کونے میں واقع ایک بے آب و گیاہ علاقے میں آباد ہو گئے یا کر دیئے گئے، ان کے پاس دولت، جائیداد، کاروبار یا عیش و عشرت کی کمی تھی۔ کیا ان کا بچپن یا ان کے باپ دادا کا بچپن اس سرزمین پر گزرا تھا کہ انہیں پل پل اس کے گلی کوچوں کی یاد ستاتی تھی اور وہ اپنے آبائی گھروں میں جا کر آباد ہونا چاہتے تھے، اپنے قدیمی گلی محلوں میں کھیلنا کودنا چاہتے تھے۔ ایسا تو ہرگز نہ تھا۔ یہ سب لوگ جو انگلینڈ، یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ کی ترقی یافتہ آبادیاں چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے، اپنے اپنے علاقوں کے متمول ترین لوگ تھے، خوبصورت گھروں میں رہتے شاندار گاڑیوں میں سفر کرتے اور وسیع کاروبار کے مالک ہوتے تھے۔ ان ملکوں میں امن، خوشحالی اور سلامتی بھی تھی۔ قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کی پاسداری بھی لیکن جہاں وہ جا کر آباد ہو رہے تھے وہاں تو نہ پانی، نہ سبزہ، سڑکیں نہ عمارات، ایک بے آباد سرزمین اور وہاں پر آباد عرب ان کی جان کے دشمن۔ اس کے باوجود وہ اپنا سب کچھ بیچ کر فلسطین کے علاقے میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہ آباد نہیں ہوئے بلکہ انہیں جنگ عظیم اول کے بعد اتحادی افواج کے سرکردہ ملک برطانیہ نے آباد کیا۔ یہ وہ قصہ ہے جو آج بحرین، شام، ایران، یمن، لبنان اور دیگر عرب ممالک میں جنگ و جدل کی بنیاد ہے۔

ایک شخص تھا سر مارک سائیکس (SirMarkSykes) اس کا والد انگلینڈ کا ایک مالدار شخص تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ سردیوں میں خلافت عثمانیہ کے تحت مشرق وسطیٰ کے علاقوں میں نکل جاتا۔ اپنے اس سفر سے جو اس نے معلومات اکٹھا کیں ان سے اس نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں جو خلافت عثمانیہ، مشرق وسطیٰ اور اسلام کے متعلق تھیں جن میں Dar-ul-Islam اور The Caliph's Heritage بہت مشہور ہوئیں۔ 1897ء میں وہ فوج میں بھرتی ہو گیا، لیکن اپنے مزاج کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر نہ رک سکا۔ اسے آئرلینڈ کے چیف سیکرٹری کا پارلیمنٹری سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ یہاں اس نے ترکی، مشرق وسطیٰ اور دیگر اسلامی ممالک پر نظر رکھنے والوں کا ایک گروہ ترتیب دیا۔ جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا تو اسے لڑنے کے لیے محاذ پر نہیں بھیجا گیا، بلکہ اسے لارڈ کچنر (Kichner) کے دفتر میں خصوصی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ وہ جلد ہی مشرق وسطیٰ کے بارے میں اتھارٹی سمجھا جانے لگا۔ اس نے تاریخ میں پہلی دفعہ جنگ کے دوران قدیم یونانی نام، شام کے لیے Palutine,Syria Mesopomsa وغیرہ استعمال کرنا شروع کیے۔ اسی نے ترکوں کے خلاف حجاز میں شریف مکہ کی قیادت میں ابھرنے والی خانہ جنگی کے لیے چار رنگوں (سبز، سرخ، سیاہ اور سفید) پر مشتمل ایک جھنڈا بنا کر دیا۔ یہ چاروں رنگ آج بھی اردن، عراق، شام اور مصر کے جھنڈوں میں شامل ہیں۔ مارک سائیک کے جنگ کے نوٹس پڑھنے والے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہمیں سب سے زیادہ خطرہ پین اسلام ازم سے ہے۔ پین اسلام ازم کے کینسر کو ختم کرنے کے لیے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ خلافت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے یورپ میں موجود صیہونی یہودیوں سے ملاقاتیں شروع کیں اور انہیں تاج برطانیہ کی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ اسی دوران نومبر 1914ء کو برطانیہ نے خلافت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے چار دن بعد برطانوی کابینہ میں ڈیوڈ لائڈ جارج نے یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کے منصوبہ کا خاکہ پیش کیا۔ مارک نے فرانس کے سفارت کار فرانکوئس پی کوٹ (Picot Francois) کے ساتھ مل کر برطانیہ کا فرانس کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ کروایا جسے Agrement AsiaMinor کہتے ہیں۔ اس کے تحت خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے ہوں گے تو کون کونسا علاقہ کس ملک کے پاس جائے گا۔ برطانیہ کے پاس دریائے اردن اور سمندر کے درمیان کا علاقہ جس میں آج کل اسرائیل واقع ہے اور جنوبی عراق جبکہ فرانس کے پاس جنوب مشرقی ترکی، شمالی عراق، شام اور لبنان اور روس کے پاس استنبول وغیرہ آنے تھے۔ یوں حیفہ اور ہیبرون کا علاقہ برطانیہ کے ہاتھ آ گیا جہاں انہوں نے صیہونی یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے انہیں وہاں آباد کرنا تھا۔ سائیکس اور پائی کوٹ نے اپنی مرضی سے پورے مشرق وسطیٰ کے نقشے پر لکیریں کھینچی جنہیں آج اردن، لبنان، عراق، شام، یمن، سعودی عرب اور دیگر ریاستیں کہتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس کے ساتھ ہی صیہونی میمورنڈم جنوری 1915ء میں برطانوی کابینہ میں پیش کیا گیا۔ یورپ کے یہودی اس قدر بااثر تھے کہ کابینہ نے ان کے میمورنڈم پر غور کیا اور 1916ء میں بالفور ڈیکلریشن وجود میں آیا جس کے الفاظ تھے۔

"willusetheirbestendeavourstofacilitatetheachievemtoftheirobject withfavourtheestablihmentofanationalHomeforJewishpeople,and HisMajesty'sGovernmentView"

(تاج برطانیہ اور اس کی حکومت یہودیوں کے ایک قومی گھر کے قیام کو اچھی نظر سے دیکھتی ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لائے گی۔")

پھر اس کے بعد دنیا بھر سے یہودی اپنی جائیداد فروخت کر کے اس دشت میں جا کر آباد ہونے لگے جہاں انہیں کوئی پہچانتا تک نہ تھا۔ جہاں چاروں جانب ان کے دشمن تھے۔ کیا یہ سب کسی نسل، رنگ، زبان اور علاقے کے جذبات تھے جو انہیں وہاں لے کر آئے۔ ہرگز نہیں۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق انسانی تاریخ کی آخری اور سب سے بڑی جنگ لڑنے کے لیے وہاں جمع ہوئے ہیں جس کے بعد ان کا مسیحا آئے گا اور انہیں داؤد اور سلیمان جیسی عظیم عالمی حکومت قائم کر کے دے گا۔ یہ جنگ انہوں نے مسلمانوں سے لڑنا ہے۔ کیا ہم تیار ہیں۔ کیا ہم ویسے ہی گھربار چھوڑ کر ایک جگہ اکٹھا ہونے کے قابل ہیں۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی تو فرمایا تھا "ایک زمانہ میں تم یہودیوں سے جنگ کرو گے اور تم یہودیوں پر غلبہ پاؤ گے۔ (متفق علیہ)

لیکن اس وقت سے پہلے کتنا کچھ ہے جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اور وہ وقوع پذیر ہو چکا۔ آپؐ نے فرمایا "اسلام کی کڑیاں ضرور ایک ایک کر کے ٹوٹیں گی۔ جب ایک کڑی ٹوٹے گی تو لوگ اس کے بعد والی کڑی کو پکڑ لیں گے۔ اس میں سب سے پہلے جو کڑی ٹوٹے گی وہ اسلامی نظام عدالت (خلافت) کی کڑی ہو گی اور سب سے آخری کڑی نماز ہو گی (شعب الایمان)۔ خلافت ٹوٹ گئی، اب قومی ریاستیں ہیں، لیکن میرے آقاؐ نے خبر دے دی تھی "جزیرۃ العرب اس وقت تک خراب نہ ہو گا جب تک مصر خراب نہ ہو جائے" (الفتن) فرمایا۔ "عنقریب تم افواج کو پاؤ گے شام، عراق اور یمن میں" (البیہقی) پھر فرمایا "جب شام میں فساد ہو تو تمہاری خیر نہیں (مسند احمد بن حنبل) اس حدیث پر غور کریں "قیامت قائم نہ ہو گی جب تک کہ اہل عراق کے اچھے لوگ شام کی طرف منتقل نہ ہو جائیں اور اہل شام کے شریر لوگ عراق کی طرف منتقل نہ ہو جائیں، تم شام کو لازم پکڑے رہنا (مسند احمد بن حنبل)۔ احادیث کی ایک طویل فہرست ہے جس میں اس امت کو خبردار کیا گیا۔ اس دور فتن کے بارے میں کہ جب یہ امت ایسے عذابوں کا شکار ہو گی جیسے تسبیح کا دوڑا ٹوٹ جائے اور دانے اوپر نیچے گرنے لگتے ہیں۔ ہم حالت جنگ نہیں حالت عذاب میں ہیں۔ یہ حالت عذاب ہماری تطہیر کرے گی۔ اس لیے کہ آخری بڑی جنگ سے پہلے دنیا نے دو خیموں میں تقسیم ہونا ہے۔ ایک جانب مکمل ایمان اور دوسری جانب مکمل کفر۔ نفاق کا خاتمہ ہو گا۔ نفاق حکومتوں میں ہو یا افراد میں سب ختم ہو جائے گا۔ تقسیم واضح ہوتی جائے گی۔ اس لیے کہ حالت جنگ میں کسی ایک جانب ہونا پڑتا ہے۔ منافق دونوں اطراف کی تلواروں کی زد پر ہوتے ہیں۔

نوٹ: ایک جاننے والے کا شفا ہسپتال اسلام آباد میں 15 اپریل کو لیور ٹرانس پلانٹ ہے انہیں 8 بوتلیں A+ پازیٹو اور 22 کسی بھی گروپ کے خون کی ضرورت ہے۔ رابطہ محمد ماجد۔ 0301-8635003۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ مسالک کی جنگ نہیں ہے

بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمٰی کا دوسرا دور تھا۔ وزیراعظم سیکرٹریٹ میں وزارت خارجہ کی جانب سے ایک انتہائی سینئر آفیسر سپیشل سیکرٹری کی حیثیت سے تعینات ہوتا ہے۔ بے نظیر کے اس دور میں ظفر ہلالی سپیشل سیکرٹری تھے جو آجکل مشہور تجزیہ نگار بھی ہیں۔ ظفر ہلالی کا خاندان سفارت کاری کے حوالے سے مشہور ہے۔ ان کا خاندان ایران سے قاچار بادشاہت کے زمانے میں ہجرت کر کے ہندوستان آیا۔ ایران میں یہ خاندان دربار سے اعلیٰ سطح پر منسلک تھا۔ خود بے نظیر بھٹو کی والدہ نصرت اصفہانی کا تعلق بھی ایران سے تھا۔ ظفر ہلالی کے بقول 'ایک دن بے نظیر نے انہیں بلایا اور کہا کہ ایرانی سفیر کو بلاؤ اور اسے بتاؤ کہ ان کا سفارت خانہ جس قسم کا لٹریچر اور کیسٹ وغیرہ پاکستان میں تقسیم کر رہا ہے' اس سے ہمارے لئے بہت مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ ظفر ہلالی نے ایرانی سفیر محمد مہدی اخوندزادہ بستی کو بلایا۔ اخوندزادہ انقلاب ایران کے بعد 1981ء میں پہلی دفعہ بھارت میں ایرانی سفارت خانے میں متعین کیا گیا۔ بنیادی طور پر اس کی تعلیم سول انجینئرنگ ہے جو اس نے بنگلہ دیش سے حاصل کی۔ ایران میں سول سروس میں بھرتی کے لئے کسی قسم کی پبلک سروس کمیشن نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مقابلے کا امتحان ہوتا ہے۔ انتظامی عہدوں اور وزارت خارجہ میں بھرتی براہ راست ق'م میں موجود رہبری کونسل کرتی ہے۔ نوکری کے لئے انقلاب کے ساتھ وفاداری کو شرط اول کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اخوندزادہ اس شرط پر پورا اترتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجاہدین خلق کو غدار اور منافق قرار دے کران کے قتل کا فتویٰ دیا گیا تو بہت سے لوگ جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو گرفتار ہوئے انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ وہی مجاہدین خلق تھے جن کے ساتھ مل کر 1979ء میں انقلاب لایا گیا تھا۔ انقلاب کے فوراً مجاہدین خلق کے سربراہ مسعود رجاوی کے بھائی پروفیسر کاظم رجاوی کو جنیوا میں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں ایران کا سفیر مقرر کیا گیا۔ قتل کا حکم آیا تو پروفیسر کاظم رجاوی کو قتل کرنے کے لئے گروہ تیار کیا گیا۔ 24اپریل 1990ء کو دن دھاڑے پروفیسر کاظم رجاوی کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کی تمام تفصیلات سوئٹزرلینڈ کے تفتیشی مجسٹریٹ جیکوزانٹین JacquesAnteen کے فیصلے میں موجود ہیں۔ اس قتل میں تیرہ ایرانی لوگ ملوث تھے جن میں دو کے پاس سفارتی پاسپورٹ اور باقی افراد کے پاس سرکاری پاسپورٹ تھے۔ یوں وہ سفارتی استثناء کا سہارا لیتے ہوئے پروفیسر کاظم رجاوی کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہی پاسپورٹوں کی وجہ سے فرار بھی آسانی سے ہو گئے۔

محمد مہدی اخوندزادہ بستی 1993ء سے 1998ء تک پانچ سال پاکستان میں سفیر رہا۔ ظفر ہلالی نے جب اس کے سامنے ایرانی لٹریچر کی تقسیم پر پاکستانی حکومت کے تحفظات کا اظہار کیا تو انہوں نے الٹا سوال کر دیا کہ آپ کے اندازے کے مطابق پاکستان میں کتنے لوگ ہیں جو ایران کے کہنے پر ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ ظفر ہلالی نے کہا مجھے کیا معلوم۔ مہدی اخوندزادہ نے کہا کہ پچھتر ہزار افراد ہمارے کہنے پر ہتھیار اٹھا سکتے ہیں لیکن ہم آپ کو ایک برادر ملک سمجھتے ہیں اس لئے آپ کے لئے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ظفر ہلالی نے یہ قصہ میرے پروگرام سچویشن روم میں سنایا جسے چینل 24 کی ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلم امہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ علاقائی' نسلی اور تاریخی تعصبات کو ہم مسلک کا تڑکا لگا کر اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں صدیوں سے دو طاقتیں برسرپیکار رہی ہیں' ایک ایران یا فارس اور دوسرا روم۔ جزیرہ نما عرب کے ساحلی علاقے جو اب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہیں' وہاں فارس کے حکمرانوں کے زیر اثر قبائلی رہنما برسراقتدار تھے۔ یزدگرد کا وہ فقرہ تاریخ کا حصہ ہے جو اس نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں حملہ آور افواج کے وفد سے کہا تھا۔ ''اے گوہ کا گوشت کھانے اور اونٹنیوں کا دودھ پینے والے عربو! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا جو کیہان کے تخت کی آرزو کر رہے ہو۔ تمہارے قبائل میں سے اگر کوئی سرکشی کرتا تو ہم اپنے سرحدی حاکم سے کہتے اور وہ تمہارا دماغ سیدھا کر دیتا''۔ آج بھی جب ایک عام ایرانی عراق میں دجلہ و فرات' ازبکستان میں سمرقند و بخارا' افغانستان میں ہرات' تاجکستان میں دوشنبے اور قلاب اور آذربائیجان میں باکو جیسے شہروں کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی عظمت رفتہ یاد آ جاتی ہے۔ سائرس اعظم اور نوشیروان کے قصے اس کی روزمرہ گفتگو کا حصہ ہیں۔ فردوسی کا شاہنامہ اسی محبت کی داستان ہے اور اسی المیے کا نوحہ ہے کہ کیسے عرب کے ان خانہ بدوشوں نے ان کی عظیم سلطنت کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اسی لئے وہاں کا اجتماعی شعور اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا ہوتا ہے۔ ایرانی انقلاب کے بعد بھی ایرانی سفارت خانوں نے جس قدر توانائی فارسی شناسی اور فرہنگ یعنی اپنی ثقافت کی ترویج پر صرف کی اتنی کسی اور کام پر نہیں کی۔ دوسری جانب عربوں کی ایک ہزار سالہ حکمرانی نے قدیم ایران کے اہم ترین علاقوں کی زبان تک تبدیل کر دی۔ یزدگرد کا قادسیہ دریائے دجلہ کے کنارے تھا۔ اب وہاں لوگوں کی مادری زبان تک عربی ہو چکی ہے۔ ایران کی عظمت رفتہ کو زندہ کرنے کا اور کوئی راستہ باقی نہیں سوائے اس کے کہ اپنے حامی لوگوں کو ساتھ ملا کر عرب و عجم کی لڑائی کو ہوا دی جائے۔ بشارالاسد علوی ہے' جس کے عقائد کی بنیاد پر تمام اثنا عشریہ انہیں اپنے سے الگ تصور کرتے ہیں لیکن سیاسی اور علاقائی صورت حال میں اس کا ساتھ دینا عرب علاقوں میں اپنا اثر و نفوذ اور اختیار بڑھانے کیلئے ہے۔ اسی طرح زیدیہ فرقے کے حوثی حضرت زید بن علی کے ماننے والے ہیں جن کے عقائد وہاں کے سنی عوام سے بہت ملتے ہیں۔ بلکہ زید بن علی نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں اپنی یہ رائے دی تھی کہ میں نے اپنے گھرانے میں ان کے بارے میں ہمیشہ اچھی بات ہی سنی۔ لیکن یمن کے حوثیوں کا ساتھ مسلک کی وجہ سے نہیں بلکہ عرب و عجم کی کشمکش میں دیا جا رہا ہے۔

دوسری جانب سعودی عرب اپنے اردگرد کے تمام علاقوں' بحرین' کویت' یمن اور خصوصاً اپنے مشرقی علاقوں وغیرہ پر اپنا مکمل کنٹرول چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہاں کی شیعہ اکثریت اس کے اقتدار کے لئے خطرہ ہے کیف۔ اس کا اقتدار جو امریکی اشیرباد کا مرہون منت ہے' اسے صرف شیعہ آبادی سے ہی نہیں بلکہ ہر اس سنی آبادی کی تحریک سے بھی خطرہ ہے جو بادشاہت کے خلاف ہو۔ اسی لئے جب مصر میں اخوان المسلمون کی حکومت آئی تو سعودی عرب نے وہاں کی فوج کو اکسایا' اس نے اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر فوج کو دس ارب ڈالر تحفے میں دیئے تاکہ ان لوگوں کا قتل عام کرے جن کے نظریات بادشاہت کے خلاف ہیں۔ اپنے اقتدار کو خطرہ ہو تو ایران اور سعودی عرب کو نہ مسلک یاد آتے ہیں اور نہ ہی عرب و عجم۔ شام اور عراق میں بننے والی اسلامی ریاست کے خلاف دونوں متحد ہیں۔ ایران کے رضاکار وہاں جا کر لڑ رہے ہیں اور سعودی عرب شام کی آزاد فوج کو سرمایہ فراہم کر رہا ہے تاکہ وہ داعش اور بشارالاسد دونوں سے لڑے۔ یہ نسل' رنگ' علاقے اور اقتدار کی لڑائی ہے جسے مسلک کا تڑکا لگا کر لڑا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے حیرانی ان علمائے کرام پر ہوتی ہے جو اپنے تعصب میں اس لڑائی کو ہوا دینا چاہتے ہیں۔ جن کا رزق مسلکوں میں لڑائی سے وابستہ ہے۔ مسلک کو اس لڑائی سے علیحدہ کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمام شیعہ علماء حوثی قبائل کے خلاف ویسے ہی فتویٰ دیں جیسے انہوں نے داعش کے خلاف دیا کہ یہ باغی ہیں اور ریاست ان سے جنگ کرے اور سنی علماء اسی طرح سعودی عرب کے خلاف فتویٰ دیں جیسے وہ امریکہ کے خلاف دیتے ہیں کہ کسی دوسرے کے علاقے پر بمباری کر کے انسانی جانوں کو ہلاک کرنا قتل کے مترادف ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر نسل' زبان اور علاقے کی یہ جنگ جسے مسلک کا تڑکہ لگ چکا ہے پوری امت کو ایسا اپنی لپیٹ میں لے گی کہ کوئی شہر بھی اس سے محفوظ نہ ہوگا۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہ تو نسلی انتقام ہے

بدترین نسلی‘ قبائلی اور علاقائی تعصب وہ ہوتا ہے جس کا جواز لوگ مذہب میں تلاش کریں اور اپنے انتقام کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد تصور کریں۔ افغانستان میں مقیم ”ہزارہ“ قبائل کی جب وہاں کی پشتون برسراقتدار اشرافیہ سے نسلی اور قبائلی جنگ شروع ہوئی تو ایک دوسرے نے قتل و غارت گری کا جواز مسلک میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ ہزارے چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ کچھ بھاگ کر کوئٹہ آ گئے اور کچھ ایران چلے گئے۔ لیکن اس نسلی اور قبائلی تعصب کی آگ کئی دہائیوں کی پرامن خاموشی میں بھی اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ جیسے ہی اس مسلکی اختلاف نے دوبارہ سر اٹھایا تو لوگوں کو اپنے باپ دادا سے سنی ہوئی کہانیاں یاد آ گئیں اور وہ پھر اس تعصب کے انتقام میں دیوانے ہو گئے‘ آرمینیاء کے عیسائی اور آذربائیجان کے مسلمانوں کی بھی یہی کہانی ہے‘ نسلاً ایک دوسرے سے مختلف تھے‘ ایک دوسرے کی جان کے پیاسے تھے‘ جب دونوں کے مذہب بھی جدا ہو گئے تو اندر چھپے انتقام کو ایک ارفع مقصد میسر آ گیا۔ بوسنیا کے سرب اور مسلمان دونوں نسلی اور قبائلی اعتبار سے علیحدہ تھے۔ صدیوں ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف رہے۔ خلافت عثمانیہ اور سوویت روس کی طاقت کی وجہ سے امن قائم رہا‘ لیکن جیسے ہی طاقت کا یہ شکنجہ ڈھیلا ہوا‘ تاریخ کا بدترین قتل عام ہوا۔ نسلاً سرب وزیراعظم‘ میلا سووچ‘ جو عیسائی تھا‘ اس نے یورپی یونین کے سربراہوں کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ یورپ کے عین بیچوں بیچ بوسنیا کی ایک مسلمان ریاست قائم ہو جائے۔ وجہ صرف بوسنیا سے نسلی اختلاف تھی جسے مذہب کا سہارا لے کر لوگوں کو ساتھ ملایا جا رہا تھا۔ تازہ ترین نسل کشی روہنگیا نسل کے مسلمانوں کی برما میں کی گئی‘ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ روہنگیا مسلمان انگریز کے زمانے سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے تھے‘ اور کچھ چین میں بدترین غربت کی وجہ سے وہاں آ گئے تھے۔ یہ برما میں آباد لوگوں سے زبان اور نسل کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ان کی نسل کشی کی داستانیں تو انتہائی لرزہ خیز ہیں۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا اور نوجوانوں لڑکوں اور بچوں کو قتل کیا جاتا‘ یا پھر زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ یہ سب اس لئے کیا جاتا کہ ان کی نسل اور زبان اور تھی لیکن ان کے مسلمان ہونے نے مٹی پر تیل کا کام کیا۔ وہ بدھ بھکشو جو سر منڈا کر گیروے کپڑے پہنے امن کے پجاری بنے بیٹھے تھے‘ سفاک قاتل بن گئے۔ دنیا کے کسی بھی خطے کی تاریخ اٹھا لیں آپ کو نسل‘ رنگ‘ زبان اور علاقے کے تعصبات سے پیدا شدہ نفرتوں اور قتل و غارت میں اس وقت شدید اضافہ نظر آئے گا جب دونوں جانب کے لوگ مذہب یا مسلک کی آڑ لے لیں۔ سانحہ پشاور پر طالبان کے نمائندے محمد خراسانی کی رسول اکرم ﷺ کے دور کے بنو قریظہ کے واقعہ سے اپنے انتقام کو جواز دینے کی کوشش بھی اسی نسلی انتقام کو مذہبی جواز دینا ہے۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جسے کم سے کم توہین رسالت کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سال تاریخ میں کسی گروہ‘ فرقے‘ مسلک یا فقہ نے اس واقعہ کو جواز بنا کر قتل و غارت کو جائز قرار نہیں دیا۔ بنو قریظہ کے جس واقعہ کے بارے میں آج دلیل دی جا رہی ہے وہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا واقعہ ہے۔ آپؐ جب مدینہ تشریف لائے تو میثاق مدینہ کے تحت یہودی قبائل کے ساتھ معاہدے کئے جس میں یہ تحریر تھا کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ کارروائی نہیں کریں گے اور ایک دوسرے کے خلاف دشمنوں کی امداد نہیں کریں گے۔ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والا پہلا قبیلہ بنو نضیر تھا جس نے آپ ﷺ کے قتل کی سازشیں کیں‘ قریش مکہ کو مسلمانوں کے بارے میں خفیہ اطلاعات پہنچائیں اور جنگ پر اکسایا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا کہ اب آپ لوگ ریاست مدینہ کے اندر نہیں رہ سکتے‘ اس لئے شہر چھوڑ دو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ‘ وہ لوگ اپنا سب سامان اٹھا کر شام کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ یہودی قبائل کو معاہدے کی دعوت دی اور انہوں نے معاہدے کی تجدید کی۔ اس میں یہ قبیلہ بنو قریظہ بھی شامل تھا۔ جس نے دوبارہ یہ معاہدہ کیا۔ اس کے بعد جنگ احزاب ہوئی تو بنو نضیر جو شام کی جانب چلا گیا تھا اس نے عرب کے تمام قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اکٹھا کر لیا اور وہ مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔ اس دوران حی کی بن اخطب جو بنو نضیر قبیلے کا تھا اس نے بنو قریظہ کو قائل کر لیا کہ وہ بھی مسلمانوں سے معاہدہ توڑ لیں‘ یوں انہوں نے معاہدہ توڑا اور جنگ میں شامل ہو گئے۔ ان عہد توڑنے کے بارے میں اللہ نے قرآن میں یوں فرمایا ہے ”جب کہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائین شہر کی جانب سے چڑھ آئے اور جب تمہاری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور جب کہ دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے“ (احزاب:10)۔ یہ وہ رات تھی جب ایک طرف سے قریش مکہ اور ان کے ساتھی اور دوسری جانب سے مدینے کے اندر سے بنو قریظہ مسلمانوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی جنگ احزاب ختم ہوئی‘ مسلمانوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا اور 25 دن تک یہ محاصرہ رہا۔ جس پر انہوں نے اپنے حلف کے شریک سعد بن معاذ کے بارے میں کہلا بھیجا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے‘ ہمیں منظور ہے۔ عرب میں حلف کے تعلق کو خونی رشتوں کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں جنگ کے دوران بدعہدی کی صرف ایک سزا رائج تھی اور وہ یہ کہ تمام جنگ کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ سعد بن معاذ نے وہی سزا تجویز کی۔ یہ سزا ایک ثالث نے تجویز کی تھی اور عرب کی روایات کے مطابق تھی۔ اسے چودہ سو سال سے آج تک کسی نے رسول اکرم ﷺ کی طرف سے دی جانے والی سزا قرار نہیں دیا۔ دوسری بات یہ کہ یہ جنگ میں بدعہدی کی بنیاد پر دی جانے والی سزا تھی۔ اگر یہ جنگ کی بالعموم سزا ہوتی تو بدر کے قیدیوں سے لے کر فتح مکہ کے بعد بھی نافذ ہوتی۔ انتقام کی آگ انسان کو کس قدر دیوانہ بنا دیتی ہے۔ کیا آرمی پبلک سکول کے طلبہ یا ان کے والدین نے محمد خراسانی کے طالبان کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا جسے توڑا تھا۔ کیا ان بچوں نے یا ان کے والدین نے طالبان کو ثالث مقرر کیا تھا۔ یہ خالصتاً قتل ہے اور سفاکانہ قتل اور اس قتل کو مذہبی جواز نہیں مل سکتا۔ ہاں قبائل‘ نسلی اور علاقائی تعصب میں انتقام کی آگ نے آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں سفاکی یہ ہے کہ اس میں چن چن کر بچوں کو منتخب کیا گیا۔ اس کا جواز میرے آقا سید الانبیاء کی سنت میں تلاش کرنا ایک ایسا فعل ہے جو کم سے کم توہین رسالتؐ ہے۔ جس امت نے گیارھویں صدی عیسوی میں صلاح الدین ایوبی جیسا شخص پیدا کیا ہو جس کو پورا مغرب یہ کہہ کر سلام پیش کرے کہ اس نے دنیا کو جنگ کی اخلاقیات سکھائیں تھیں۔ جو عورتوں‘ بچوں‘ بوڑھوں اور گھر میں بیٹھے پرامن شہریوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ اس نے یہ تمام اخلاقیات کہاں سے سیکھیں۔ یقیناً میرے آقا سید الانبیاء ﷺ سے۔ صدیوں سے مسلمانوں نے جنگ کی یہ اخلاقیات قائم رکھیں۔ یہ اخلاقیات نہیں تو پھر یہ سب عصبیت ہے‘ انتقام ہے ویسی ہی عصبیت‘ ویسا ہی انتقام جیسا بلوچستان میں بی ایل اے یا دیگر علیحدگی پسند لے رہے ہیں‘ ویسا ہی انتقام جو بنگالیوں نے بہاریوں کو قتل کر کے ملکی یا ہنی بنا کر لیا۔ نسلی‘ قبائلی‘ علاقائی تعصب بدترین ہو جاتا ہے جب اس کا جواز مذہب میں ڈھونڈا جانے لگے۔